سبز رُتوں کی جھلمل میں

عِفت سحر طاہر

سبزرُتوں کی جھلمل میں.........عفت سحر طاہر

''اگر مجھے زندگی میں ایک قتل کرنے کا اختیار ہوتا تو میں ایڈی کو قتل کرتی۔'' وہ مٹھیاں بھینچے بے حد جذباتی لہجے میں اپنے غصے کا اظہار کررہی تھی۔ زارا نے دہل کر اسے دیکھا اور سرزنش کرنے والے انداز میں بولی۔

''کس قدر شدت پسند ہو تم صبیرہ!''

''واٹ...... میں؟ یعنی کہ تمہاری نظر میں، میں شدت پسند ہوں؟'' وہ غصیلے لہجے میں بولی۔ ''اور وہ...... وہ جو کچھ کہتا پھر رہا ہے تم لوگوں کو سنائی نہیں دے رہا۔ اوہ گاڈ، اکیسویں صدی میں داخل ہو جانے کے باوجود وہ لسوڑے کی طرح ساٹھ کی دہائی سے چمٹا ہوا ہے۔''

''کول ڈاؤن صبیرہ! دیکھو ہر انسان کا اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے اور ضروری نہیں ہے کہ ہم سب سے متفق ہوں۔ مگر سب لوگ ہماری خاطر اپنے نقطۂ نظر سے ہٹ تو نہیں سکتے نا۔'' شفق کا سمجھانے کا اپنا ہی دھیما سا انداز تھا مگر اس کے اندر جلتی آگ ان طفل تسلیوں کی پھوار سے بجھنے والی نہیں تھی۔

''تو یہ بات وہ خود کیوں نہیں سمجھتا؟ یونیورسٹی کو اپنی جاگیر سمجھ کر اصول وضوابط نافذ کرتا پھر رہا ہے۔ کس تبلیغی جماعت کا لیڈر ہے کہ ہر وقت نصیحتیں، نصیحتیں، ہنہ۔''

زارا نے اس کا ہاتھ تھام کر کھینچتے ہوئے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور مصالحانہ انداز میں بولی۔

''بہر حال اس میں کچھ غلط بھی نہیں ہے۔ اور کل وہ جو لڑکیوں کے پردے اور بے جا آزادی کی بات کر رہا تھا وہ بھی کافی حد تک درست تھی۔ پھر وہ تمہیں تھوڑی کہہ رہا تھا۔ ان کے گروپ میں دوستانہ مباحثہ ہو رہا تھا۔ اب پاس ہی ہم بھی بیٹھی تھیں تو اس میں اس کا تو کوئی قصور نہیں۔''

''ہنہ، پردہ اور لڑکیوں کی بے جا آزادی۔ مائی فٹ۔''

اس نے تنفر سے اپنے سرخ ہونٹوں کو سکوڑا تھا۔ پھر تلخی بھرے لہجے میں بولی۔ ''جس وقت وہ اپنے فیورٹ ٹاپک کے حق میں بھاری بھرکم دلائل دے رہا تھا اس وقت اس کے گروپ میں کم وبیش تین لڑکیاں موجود تھیں۔ لڑکیوں کو پردے کی نصیحت کرنے والا خود ان میں راجہ اندر بن کے بیٹھا ہوا تھا۔ اتنی ہی شرم آتی ہے لڑکیوں کی بے پردگی سے تو یہاں یونیورسٹی میں کیا کر رہا ہے؟''

''تم جو بھی کہو صبیرہ! مگر ایک بات تو ماننی پڑے گی کہ اس کے دلائل کمال کے ہوتے ہیں۔ میں تو کالم سے لے کر اب تک اس کے ساتھ ہوں۔ آج تک کوئی مباحثہ یا کوئی تقریری مقابلہ ایڈی کے ہاتھ سے نہیں گیا۔ اسے مقابل کو قائل کرنا آتا ہے اور قائل کرنے کی خصوصیت اسی میں ہوتی ہے جس کے پاس وافر ذخیرہ الفاظ ہوتا ہے اور یہ خوبی ایڈی میں بدرجہ اتم موجود ہے۔''

ثمین نے ہمیشہ کی طرح بہت صاف گوئی سے ایڈی کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا تھا جس پر وہ دانتوں پر دانت جما کر رہ گئی۔ شفق نے اپنی صلح پسند طبیعت سے مجبور ہو کر ثمین کو آنکھ کے اشارے سے منع کیا تو وہ منہ بنا کر اپنی فائل پر جھک گئی۔

''ہیلو گرلز!'' ثوبان حسب عادت چہکتا ہوا آیا تھا۔ وہ جواب موضوع ٹھنڈا پڑ جانے پر خاموشی سے شفق کی بنائی اسائنمنٹ دیکھ رہی تھی، الرٹ ہو گئی۔

''مل گئی فرصت جناب کو؟'' زارا نے تیکھی نظروں سے ثوبان کو دیکھا تو وہ گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتا ہوا اطمینان سے بولا۔

''اندر کی بات کرو۔ ٹائم ضائع مت کرو۔''

''سائیکالوجی کی صباحت کے ساتھ تمہاری کیا میٹنگ چل رہی تھی صبح؟'' زارا کے لب ولہجے سے منگیتروں والا فطری رعب اور جلن جھلک رہی تھی۔ جواباً ثوبان کی آنکھوں سے جھانکتی شرارت ان تینوں سے مخفی نہیں رہی تھی۔

''وہ......'' وہ خاصا کھینچ کر بولا تھا۔ پھر مسکراہٹ دبا کر پوچھنے لگا۔ ''جیلس ہو رہی ہو؟''

''ہاں ہو رہی ہوں جیلس۔ منگیتر ہو تم میرے اور میں تمہیں اِدھر اُدھر تانکا جھانکی کی اجازت نہیں دے سکتی۔'' زارا نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

''اب کلاس فیلو ہونے کے ناتے......'' وہ لاپروائی سے کہنے لگا تھا کہ زارا چلا اٹھی۔

''کلاس فیلو؟ سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ کا انگلش لٹریچر والوں سے کیا تعلق؟''

''تو بننے میں کیا دیر لگتی ہے؟'' وہ سادگی سے بولا تو زارا نے غصے میں آکر بھاری کتاب اٹھا کے اسے دے ماری تھی۔ جسے وہ ہڑبڑا کر بدقت کیچ کر پایا تھا۔

''تم دیکھنا ذرا اس دفعہ جا کر آغا جان کو تمہاری ایک ایک حرکت کی رپورٹ دوں گی۔ ان کی چھڑی کی تواضع ہی سے تم درست ہو گے۔''

زارا کو صبح سویرے لابی میں ثوبان اور صباحت علوی کی مسکراہٹ کا انداز ہی نہیں بھول رہا تھا۔ تین بار وہ ان کے پاس سے گزری تھی مگر مجال تھی جو ثوبان نے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو اور اس کے سامنے کتنے جذباتی انداز میں کہا تھا۔

''تم میرے آس پاس ہو اور میں تمہیں نہ بھی دیکھ پاؤں مگر تمہاری خوشبو سے پہچان لیتا ہوں۔''

''ہنہ جھوٹا۔'' وہ تلملا رہی تھی۔

''اب بس بھی کرو زارا! صباحت علوی ہماری کلاس فیلو نہ سہی یونیورسٹی فیلو تو ہے نا۔'' شفق نے ثوبان کی جان بخشی کرانا چاہی تھی۔ زارا نے کھا جانے والی نظروں سے ثوبان کو دیکھتے ہوئے اسے مطلع کیا۔

''جب اس نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا تب آغا جان کے سامنے حلفیہ کہا تھا کہ یونیورسٹی کی لڑکیوں کو بہن کی نظروں سے دیکھے گا۔''

اس کی بات پر سب نے بمشکل اپنی ہنسی روکی تھی جب کہ ثوبان نے معصومیت سے کہا۔

''میں تو اپنے حلف پر قائم ہوں۔ اب لڑکیاں مجھے بھائی کی نظروں سے نہیں دیکھیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''تم چاہتے ہی یہی ہو۔'' زارا جل کر بولی تھی۔

''رہنے دو زارا! خوامخواہ اپنی انرجی ویسٹ کرتی رہتی ہو۔ پتہ تو ہے تمہیں ان مردوں کی سائیکی کا۔''

صبیرہ تو یوں بھی جلی بھنی بیٹھی تھی، اب جب کہ سامنے بندہ بھی مخالف کیمپ کا تھا اور موضوع بھی اس کی موجودہ ذہنی کیفیت کے مطابق تھا تو اسے بولنے سے کون روک سکتا تھا؟

''اوہو...... صبیرہ جی بھی یہیں تشریف رکھتی ہیں۔'' ثوبان یوں چونکا جیسے اس سے پہلے وہ صبیرہ کی موجودگی سے قطعی ناواقف رہا ہو۔

''بھئی ان کے ساتھ ایک پرابلم ہے کہ جب تک یہ بولتی نہیں ان کی موجودگی کا پتہ ہی نہیں چلتا۔'' وہ پتہ نہیں طنز کر رہا تھا یا تعریف۔

''مجھے فضول بول کر بڑائی اور میڈلز اکٹھے کرنے کا شوق نہیں ہے۔'' وہ تنک کر بولی تو ثوبان نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا تھا۔

''تم ایک اچھی ڈیبیٹر ہو اور تم سے زیادہ بہتر اور کوئی نہیں جان سکتا کہ ٹرافیاں اور میڈلز فضول نہیں بلکہ مضبوط دلائل کے ساتھ بہترین بولنے پر ملتے ہیں۔''

وہ ناصحانہ انداز میں بولا مگر جتنی ٹھنڈک اس کے لہجے میں تھی اتنی ہی تپش صبیرہ کے طنز وتلخی سے بھرپور لہجے میں در آئی تھی۔

''ایک ایسا معاشرہ جس پر مرد کا تسلط قائم ہے، وہاں کسی لڑکی کے الفاظ کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ اینڈ مائنڈ یو مسٹر ثوبان احمد! تمہارے دوست کو بہترین دلائل اور الفاظ پر نہیں بلکہ مرد ہونے پر ٹرافی ملی ہے۔ کیونکہ ججز کا پینل بھی مردوں پر مشتمل تھا۔ وہی مرد جن کے ذہنوں پر تسلط پسندی کی گرد جمی ہوتی ہے۔ وہ کیوں نہ اس کے خیالات کی داد دیتے۔ انہیں تو اس کے دلائل کی صورت اپنی عورتوں پر مزید دفعات لاگو کرنے کی نت نئی ترکیبیں مل گئی ہوں گی۔''

''مائنڈ یو صبیرہ بی بی! ایڈی نے اپنی تقریر میں عورتوں کے خلاف ایک بھی لفظ نہیں کہا۔ اس نے صرف عورتوں کی بے جا آزادی کو پوائنٹ آؤٹ کرتے ہوئے اسے غلط قدم قرار دیا ہے۔ تم نے بھی تو اکیسویں صدی میں پاکستانی عورت کا مقام کے موضوع پر دھواں دھار تقریر کی تھی۔ عورت کی آزادی کے حق میں ایک سے ایک بڑھ کر دلیل دی تھی۔ لیکن ہوا کیا؟''

وہ اب تمسخر پر اتر آیا تھا۔ صبیرہ کے چہرے کے ساتھ کانوں کی لویں بھی سرخ ہو گئیں۔ باقی تینوں نے اس بحث کو ختم کرنے کی کوشش کی مگر وہ دونوں تو باقاعدہ کھاتے کھول کر بیٹھ گئے تھے۔

''تو وہاں کون چاہ رہا تھا کہ عورت کو شخصی آزادی دی جائے۔ کسی کے خیالات کو سراہنے کے لئے انسان کے اپنے خیالات کا وسیع اور صاف ستھرا ہونا سب سے بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ میں لاکھ وہاں کہتی کہ عورت کو مرد کے شانہ بشانہ کام کرنے اور ملکی ترقی میں ہاتھ بٹانے کی آزادی ہونی چاہئے مگر جب دوسرا شخص اس کے خلاف دلائل دے اور ججز کے ذہنوں میں بھی عورت کو اس معاشرے میں کوئی مقام دینے کا ارادہ تک نہ ہو تو ایسی صورت میں میری دلیلوں سے کون قائل ہوگا؟''

''ہنہ دلیلیں۔ صبیرہ بی بی! ڈیبیٹر کہتے ہیں اسے جو نہ ماننے والی بات کے حق میں بھی ایسے دلائل دے کہ سب اس بات کو ماننے پر راضی ہو جائیں۔''

وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔ صبیرہ کو شدید اہانت کا احساس ہوا تھا۔ تو گویا وہ اسے ڈیبیٹر ماننے سے ہی انکاری تھا۔

''تم بھی انہی مردوں میں سے ہو جو عورتوں کو ریت میں دبا دینے پر یقین رکھتے ہیں۔ مگر اس سے گھٹیا اور ذلیل ترین سوچ اور کوئی نہیں ہے ثوبان احمد! یہ تم بھی جان لو اور اپنے بیسٹ فرینڈ کو بھی بتا دینا۔'' وہ سلگتے لہجے میں کہتی اپنا بیگ اور فائل اٹھا کر تیزی سے چلی گئی تھی۔ شفق اور زارا اسے آوازیں ہی دیتی رہ گئیں۔

''خس کم جہاں پاک۔'' ثوبان نے سکون کی سانس لی تھی۔

''شٹ اپ ثوبان!'' زارا تلملا کر اس کی طرف پلٹی تھی۔

''اس قدر بدتمیز ہو تم کہ حد نہیں۔ اتنی مشکلوں سے تو ہم لوگوں نے اسے ٹھنڈا کیا تھا اور تم نے پھر سے آکر راکھ کرید ڈالی۔''

''اس میں میری نہیں، تمہاری فرینڈ کی غلطی ہے۔ کسی بھی بحث میں حصہ لینے کا پہلا اصول یہ ہے کہ خود کو قائل ہونے یا دوسرے کو قائل کر لینے کا سبق پڑھا لیا جائے۔ اس سے ہوتا یہ ہے کہ شکست پر بھی صبر آ جاتا ہے۔ جس کا تمہاری فرینڈ میں فقدان ہے۔ وہ دنیا کو اپنے قدموں میں دیکھنا چاہتی ہے۔ جس کی کوئی بھی اسے اجازت نہیں

دے سکتا۔''

''وہ ایسی نہیں ہے ثوبان!'' شفق نے فوراً اپنے دھیمے لہجے میں اسے ٹوک دیا تھا۔ ''اسے صرف عورت کے حقوق غصب کرنے والوں سے نفرت ہے۔ عورت کے حقوق کی خاطر اٹھنے والی آواز کو دبانے پر وہ مشتعل ہوتی ہے۔ یہ بات ہم سب کو بھی پسند نہیں ہے۔ مگر صبیرہ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ آواز بلند کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ جبکہ ہم لوگ تنقید اور مخالفت سے خوفزدہ ایسا کچھ کرنے کا سرے سے سوچتی ہی نہیں ہیں اور جب سو میں سے ایک لڑکی باقی ننانوے کے حقوق کی بات کرے گی تو تم لوگوں کو تو محسوس ہونا ہی ہے۔''

''بہر حال میں تو صرف اتنی سی بات جانتا ہوں کہ جو بات جائز ہو اور معاشرتی حالات کے مطابق صحیح ہو اسی کے حق میں اٹھنا چاہئے نہ کہ جدھر منہ اٹھایا ادھر چل پڑے کی تفسیر بنے رہو۔''

''تمہارا خیال ہے کہ صبیرہ نے غلط دلائل دیئے تھے؟ یعنی عورت کی آزادی تمہارے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی؟''

زارا نے کھا جانے والے انداز میں پوچھا تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

''آزادی کی بھی کچھ قسمیں ہوتی ہیں زارا! جب تک عورت کی آزادی جیسے موضوع کی وضاحت نہ ہو جائے تب تک تو اس موضوع پر صرف تقریریں ہی کی جا سکتی ہیں۔''

''اوہو، ایڈی کی رفاقت میں رہ کر تم بھی دلائل کی چھڑی تھام کر چلنے لگے ہو۔ مگر مجھ پر حکومت کا خیال بھی اپنے پاس پھٹکنے مت دینا۔''

زارا نے چمک کر کہا تو وہ گہری سانس بھرتا حسرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میری ایسی قسمت کہاں۔ مجھے تو اب خود اپنے حقوق کے لئے آواز اٹھانے کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔''

اس کے انداز پر وہ تینوں بے اختیار ہنس دی تھیں۔

⁂……⁂

اپنی طرف سے اس نے بہت ہوشیاری اور ذہانت کے ساتھ اس تنگ جگہ پر گاڑی پارک کی تھی مگر اس کوشش میں وہ سائیڈ پر کھڑی ون ٹو فائیو کو بھول گئی تھی جو گاڑی سے رگڑ کھا کر زمین پر گری اپنی بے قدری پر نوحہ کناں تھی۔

''اوہ مائی گاڈ!''

اس نے بے اختیار اپنے اطراف میں نظر دوڑائی تھی اور پھر کسی کے بھی متوجہ نہ ہونے پر جلدی سے اپنا بیگ اور سن گلاسز سنبھالتی گاڑی سے اترنے کی تیاری کرنے لگی تاکہ وقوعہ سے اس کی غیر موجودگی ثابت ہو سکے۔ اسی وقت کسی نے کھڑکی کا شیشہ بجا کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ تابندہ نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔ باہر کھڑا شخص شاید اسی سے مخاطب تھا۔

''آ گئی مصیبت۔''

اس کا دل بے ترتیبی سے دھڑک اٹھا۔ بٹن پش کر کے اس نے تھوڑا سا شیشہ نیچے کیا تھا۔

''محترمہ! ذرا نیچے اتریں گی آپ؟''

''کیوں، کیا پرابلم ہے؟'' اس نے اپنے ڈر کو ناگواری آمیز رعب تلے دباتے ہوئے پوچھا تو وہ بھی جواباً رعب سے بولا۔

''میں آپ کو دکھانا چاہتا ہوں کہ آپ نے کیا نقصان کیا ہے۔ جس کا آپ کو ہرجانہ بھی ادا کرنا پڑے گا۔''

''اوہ......'' اُسے تسلی ہوئی تھی۔ تو گویا دے دلا کر یہ مسئلہ حل ہو جانے والا تھا۔ وہ بیگ سنبھالتی نیچے اتر آئی۔ کچھ سامنے موجود لائبریری اور آس پاس موجود لوگوں کا احساس بھی خوف کو دور کر رہا تھا۔

''آپ کے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہے؟''

وہ جو اپنا بیگ کھنگالنے کی تیاری میں تھی غیر متوقع سوال پر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ بلیک جینز اور اسکائی بلیو شرٹ میں ملبوس وہ اچھا خاصا ہینڈسم بندہ تھا۔ دیکھنے میں بھی ٹریفک کانسٹیبل نہیں لگتا تھا۔ پھر یہ کیسا سوال تھا؟''

''آپ سے مطلب؟'' اسے غصہ آیا تھا۔

''دیکھیں، میں اس معاشرے کا ذمہ دار شہری ہوں اور اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا ہوں۔ یوں تو آپ جانے کتنوں کا نقصان کر دیں گی۔'' وہ اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

''دیکھیں آپ کا جو نقصان ہوا ہے وہ میں پورا کر دوں گی۔ آپ معاشرے کی فکر میں دُبلے مت ہوں۔'' تابندہ چڑ گئی۔

''یہ جو نقصان آپ نے کیا ہے اگر اس کی خبر میں پولیس کو کر دوں تو آپ کا چالان ہو جائے گا محترمہ! یہ تو میری شرافت ہے کہ میں خود ہی اس معاملے کی چھان بین کر رہا ہوں۔''

''پولیس......'' اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ''دیکھیں یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں ہے۔ خوامخواہ پولیس کو ملوث کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی موجود ہے اور گاڑی کے پیپرز بھی۔ آپ بے فکر رہیں اور آپ کی بائیک کا جو نقصان ہوا ہے وہ میں ادا کرنے کو تیار ہوں۔'' اس نے جلدی سے کہا تو مقابل نے گہری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

سرخ و سیاہ جارجٹ کے نفیس سے کپڑوں میں ملبوس دھوپ سے سرخ پڑتی رنگت لئے بیگ کی زپ کو مضطربانہ انداز میں کھولتی بند کرتی وہ پریشان سی تھی۔

''میری بائیک کون سی؟'' وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''یہ دیکھیں، جتنا بھی اس کا نقصان ہوا ہے اس کا ہرجانہ میں بھر دوں گی۔''

تابندہ نے پاس ہی گری بائیک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جلدی سے کہا تو وہ سادگی سے بولا۔

''مگر یہ میری بائیک تو نہیں ہے۔''

''ہیں......'' تابندہ کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ بے یقینی سے پہلے بائیک کو اور پھر سامنے کھڑے شخص کو دیکھا جو اپنی چمکتی آنکھوں میں مسکراہٹ بھرے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

''یہ آپ کی بائیک نہیں ہے؟'' اس نے شبہ دور کرنا چاہا۔ جواباً اس نے نفی میں سر ہلا دیا تو اس کے جیسے تلووں لگی سر پر جا بجھی۔

''دماغ تو خراب نہیں ہو گیا آپ کا؟ اگر یہ آپ کی بائیک نہیں ہے تو پھر خوامخواہ خدائی فوجدار کیوں بن رہے ہیں آپ؟''

''دیکھیں اگر یہ میری بائیک نہیں ہے تو کیا ہوا۔ اس کی جگہ میری بائیک ہو تو سکتی تھی نا۔ آپ تو اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتیں۔ اور میں معاشرے کا درد رکھنے والا ذمے دار شہری ہوں۔ کسی کے ساتھ بھی ناانصافی ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔''

اس کی شرارتی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک اب تابندہ سے مخفی نہیں رہی تھی۔

''بہت ہی فضول شخص ہیں آپ۔'' وہ چڑ کر کہتی پلٹ کر گاڑی لاک کرنے لگی۔

''مگر آپ بہت اچھی ہیں۔''

اس کے جملے نے تابندہ کو دم سادھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آہستگی سے وہ اس کی طرف مڑی تھی۔ وہ اب ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لئے سامنے کھڑی بلیک شیراڈ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

''دیکھیں مسٹر!'' اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہی انداز میں کہنا چاہا تو وہ جلدی سے اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''وقار علی......''

اس کے انداز پر وہ لحظہ بھر کو لب بھینچ گئی پھر ترش روئی سے بولی۔ ''آپ جو کوئی بھی ہیں مجھے اس سے کچھ غرض نہیں۔ مگر مجھے آپ کی یہ فضول حرکت بالکل بھی اچھی نہیں لگی۔ کسی لڑکی سے بات کرنے کا یہ بہت گھٹیا طریقہ ہے۔''

''ایکسکیوزمی محترمہ!'' وہ کچھ سنبھل کر گویا ہوا تھا۔ ''میں کوئی سڑک چھاپ لوفر نہیں ہوں جسے لڑکیوں سے تعارف حاصل کرنے کے لئے اس طرح کے ہتھکنڈوں کی ضرورت پڑتی ہے۔''

تابندہ نے اس کی بات کاٹ کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

''جی ہاں۔ آپ تو اس معاشرے کے ایک ذمے دار شہری ہیں جن پر لڑکیوں سے تعارف حاصل کرنے کی بھاری ذمے داری بھی ہے۔''

''آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔''

اس نے کہنا چاہا مگر تابندہ سرد مہری سے اس کی بات کاٹ گئی۔

''مائنڈ یو مسٹر! میں آپ کو سمجھنا ہی نہیں چاہتی۔ عقلمند ہوئے تو آئندہ ایسی حرکت کبھی نہیں کریں گے۔'' وہ ترش لہجے میں کہتی اس کے پاس سے بادِ صبا کے جھونکے کی مانند گزر گئی تھی۔ وہ چہرہ موڑے اسے سیڑھیاں طے کرتے اور پھر لائبریری میں داخل ہوتے دیکھتا رہا۔

''واقعی، اب تو کوئی نئی حرکت سوچنی پڑے گی۔'' گہری سانس لے کر بڑبڑاتے ہوئے وہ اپنی بلیک شیراڈ کا دروازہ کھولنے لگا۔

یونہی وہ گندم کی سنہری بالیوں جیسی رنگت اور گھور سیاہ آنکھوں والی اس لڑکی کی راہ میں نہیں چلا آیا تھا۔

عشق و عاشقی کو فضول سمجھنے والا وقار علی اسی لائبریری میں ایک ماہ پہلے لائبریری کے منتظم سے ملنے آیا تھا جو کہ اس کا دوست تھا۔ اور تب، ہاں تبھی پہلی بار اس نے تابندہ کو وہاں دیکھا تھا۔ رخسار کو چومتی بالوں کی سیاہ لٹ کو بے خیالی میں کان کے پیچھے اڑستی وہ سامنے رکھی کتاب میں کھوئی ہوئی تھی اور جانے کیا بات تھی کہ غیر معمولی نہ ہوتے

ہوئے بھی گندمی رنگت اور سیاہ آنکھوں والی لڑکی لائبریری جیسے ان رومینٹک ماحول میں وقار علی جیسے خود میں مست بندے کی تمام تر توجہ سمیٹ لے گئی تھی۔ خود کو ناقابل تسخیر سمجھنے والا لمحوں کا قیدی بننے لگا۔

اور جب وہ کتابیں ایشو کروا رہی تھی تب وقار علی نے اس کے کارڈ پر نظر دوڑائی تھی۔ ’’تابندہ ضیاء۔‘‘

’’اس سے زیادہ تابندہ اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟‘‘

اس کی شفاف اور سیدھی مانگ پر نگاہ ڈال کر اس نے بے اختیار سوچا تھا۔

اور تب سے اب تک وہ اسی لائبریری میں اسے دیکھتا رہا تھا اور آج دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر مخاطب کرنے کی خطا بھی کر بیٹھا تھا تو دل کو چین آنے کی بجائے مزید مضطربانہ کیفیت نے گھیر لیا تھا۔

٭……٭

’’کس قدر سست لڑکی ہو تم۔ زارا کا تیسری مرتبہ فون آیا ہے۔ اس نے ہم لوگوں کو پانچ بجے تک وہاں پہنچ جانے کو کہا تھا اور تم یہاں اوندھی سیدھی پڑی ہو۔‘‘ ثمین اپنی کسی دوست کا فون نمٹا کر آئی تو صبیرہ کو یونہی بے زاری کیفیت میں بستر پر پڑے دیکھ کر جھلا گئی۔

’’میرا کہیں بھی جانے کا موڈ نہیں ہو رہا۔‘‘ وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولی تو ثمین نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

’’دماغ تو ٹھیک ہے نا تمہارا؟ آج زارا کا برتھ ڈے ہے اور غیر حاضری کی پاداش میں وہ تمہیں قتل بھی کر سکتی ہے۔‘‘

’’مگر میرا اس کمرے سے نکلنے کو جی نہیں چاہ رہا۔‘‘

’’کوئی پاگل ہی ہوگا جو اس سڑے بُسے ہوسٹل سے تمہاری طرح چمٹا رہے گا۔‘‘ ثمین چڑ کر کہتی الماری کھول کر اپنے اور پھر صبیرہ کی پارٹی میں پہننے والے کپڑے نکالنے لگی۔

’’میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہارے اس طرح ساری دنیا سے بے زار کمرے میں گھس کر بیٹھنے کا مطلب کیا ہے۔ ہار جیت تو مقابلے میں ہوتی ہی رہتی ہے اس کو دل پر کیا لینا۔‘‘

’’میں اپنی ہار پر نہیں، سسٹم کی خرابی پر خفا ہوں۔‘‘ حسبِ توقع وہ تنک کر بولی تو ثمین کو اپنے خیال کی درستی کا یقین ہو گیا۔

’’اس میں سسٹم کی خرابی کہاں سے آ گئی؟‘‘ ثمین نے ربڑ بینڈ اتار کر بالوں میں انگلیاں چلا کر پنکھے کی ہوا لیتے ہوئے پوچھا تھا۔

’’سسٹم کی خرابی نہ ہوتی تو سب سے زیادہ تالیاں میرے لئے بجتیں اور عورت کی آزادی کے حق میں نعرے لگتے۔ مگر وہاں تو سارے اس ایڈی جیسے تھے۔ عورت کو دبا کر رکھنے والے۔ اس سے جانوروں کی طرح مشقت لینے والے۔‘‘ وہ تلخی سے کہہ رہی تھی۔

’’کم آن صبی! اب بھول بھی جاؤ۔ ایک ذرا سی شکست کو تم دل پر لے کر بیٹھ گئی ہو۔ پتہ ہے وہ ایڈی کا بچہ کتنا خوش ہوگا کہ صبیرہ علی اس کے دلائل سے متاثر ہو کر پردہ پوش ہو بیٹھی ہے۔‘‘

ثمین نے لاپرواہی سے کہتے ہوئے آخر میں اسے ڈرایا تو وہ اس خیال ہی سے تلملا اٹھی اور پھر ثمین کے دوبارہ ٹوکنے سے پہلے ہی وہ تیار ہو گئی۔ شیفون کا سیاہ لباس ملٹی شیڈ ڈکڑھائی سے مزین تھا۔ لمبے سیاہ بالوں کی سیدھی چٹیا بنائے وہ سادگی میں بھی پُربہار لگ رہی تھی۔

’’خدا تمہیں ہدایت دے اور تم خود پر ذرا سی توجہ دو تو اچھی خاصی خوب صورت لگ سکتی ہو۔‘‘ ثمین نے اندر ہی اندر اس کی سادگی بھری خوب صورتی کو سراہتے ہوئے لقمہ دیا تو وہ آنکھوں میں کاجل کی لکیر کھینچتے ہوئے آرام سے بولی۔

’’مجھے اس فضول سی سوچ میں نہ ہی ڈالو تو بہتر ہے۔ میں جیسی بھی ہوں اچھی ہوں۔‘‘

’’ہاں بھئی، یہ سب چونچلے تو ہم لوگوں کو کرنے پڑتے ہیں۔‘‘

شیگی کٹ بالوں کو برش کرتے ہوئے ثمین نے مصنوعی حسرت سے آہ بھری تھی۔

’’بہت ناشکری ہو تم۔ اتنی پیاری تو ہو۔ اور کیا چاہئے تمہیں، سرپرو وسینگ؟‘‘ صبیرہ نے سینڈلز پہنتے ہوئے اسے گھورا تو وہ نازسے اس کے سامنے جھکی۔

’’تعریف کے لئے شکریہ، جو تم ویسے تو کبھی بھی نہ کرتیں۔‘‘ صبیرہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

ان دونوں کو پک کرنے کی ذمے داری شفق کی تھی جو پورے ساڑھے چار بجے گاڑی اور ڈرائیور سمیت ہوسٹل کے باہر موجود تھی۔ وہ دونوں گفٹس سنبھالتی گاڑی میں آ بیٹھیں۔

’’راستے میں یاد سے ریڈ روزز کے بوکے لے لینا۔ ورنہ تو شاید زارا ہمیں گیٹ سے بھی اندر نہیں جانے دے گی۔‘‘ ثمین نے باتوں کے دوران یاد دہانی کرائی تو شفق نے فوراً ڈرائیور کو فلاور شاپ کا رخ کرنے کو کہہ دیا۔

زارا کے خوب صورت اور وسیع و عریض گھر میں پہنچ کر صبیرہ کی سب سے پہلی نظر پورچ میں کھڑی سیاہ اسپورٹس بائیک پر پڑی تو وہ ٹھٹھک سی گئی۔ ایسی ہی بائیک ایڈی کی بھی تھی۔

’’کس قدر کمینی ہو تم زارا! خود تو نوکرانی بنی پھر رہی ہو اور ہمیں اتنی جلدی بلوا لیا۔‘‘ ثمین نے گھریلو حلیے میں پھرتی زارا کے لتے لئے تھے۔

وہ ہنستے ہوئے ان سے مل رہی تھی۔

’’ہاؤ سویٹ ریڈ روزز۔‘‘ سرخ گلابوں کے بوکے دیکھ کر وہ خود بھی پھول کی طرح کھل گئی تھی۔ مگر ثمین نے فوراً ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

’’نہ پھول، نہ گفٹ، جب تک کسی اچھی سی پارٹی سے نہیں نوازو گی۔‘‘

’’ہاں بھئی کیوں نہیں۔ چلو نا، چل کے پارٹی کی تیاری کریں۔‘‘ وہ کھلے دل سے بولی تو وہ تینوں اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورنے لگیں۔

’’اسی لئے تو تم لوگوں کو جلدی بلایا تھا۔ کس نے کہا تھا یوں لش پش کے ساتھ چل پڑو۔ یہاں آ کے تیار ہو جاتیں۔‘‘ زارا مزے سے کہہ رہی تھی۔

’’میں تو کچھ نہیں کر سکتی بھئی۔ یہ گھر داری میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ ہاں چکھ کے بتا دوں گی کہ ڈشز کیسی بنی ہیں۔‘‘ ثمین اترا کر کہتی زارا کو تو زہر ہی لگی تھی۔ وہ بھی اس صورت میں کہ آج ملازمہ بھی چھٹی پر تھی۔

’’نو پرابلم۔ میں ہوں نا۔ اور یہ صبیرہ بھی تو ہے۔ ہم مل کے کچھ نہ کچھ تو کر ہی لیں گے۔‘‘ شفق نے اسے تسلی دی تھی۔ صبیرہ گھبرا گئی۔

’’میں……؟‘‘

’’چلو پھر دیر مت کرو۔ باقی سب اندر لاؤنج میں جمع ہیں۔‘‘ زارا نے کہا تو وہ دونوں اس کے ساتھ کچن کی طرف آ گئیں جب کہ ثمین لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔

’’کیا بہت سے مہمان ہیں پارٹی میں؟‘‘ صبیرہ نے محتاط لفظوں میں اپنے شک کا اندازہ کرنا چاہا تھا۔

’’ارے نہیں، بس ہم لوگ ہیں اور ثوبان کا گروپ ہے۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ ممی بھی گھر پر نہیں ہیں۔‘‘ زارا کے جوش سے کہنے پر اس کے اعصاب پر برف سی گر گئی۔ تو وہ فضول کو شخص بھی یہاں موجود تھا۔

’’شفق! تم تو مستند کک ہو یار۔ ریفریجریٹر کھول کے دیکھو۔ ممی نے بہت کچھ فریز کر رکھا ہے۔ جو آسان لگے وہ بنا لو۔‘‘

زارا کی ہدایت پر شفق ریفریجریٹر کھول کر غور و خوض کرنے لگی۔

’’اور صبی! تم کیا کرو گی؟‘‘

وہ ہچکی تھی۔ صبیرہ نے اطمینان سے کہا۔

’’میں زیادہ سے زیادہ سلاد بنا لوں گی۔ یا پھر شفقت کی کوکنگ کا مظاہرہ دیکھوں گی۔‘‘

’’میری ہی کیٹگری کی ہو تم بھی۔‘‘ زارا نے آہ بھری تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد کچن میں زور و شور سے اپنی صلاحیتیں آزمائی جا رہی تھیں۔

ثوبان ہینڈی کیم لئے اندر داخل ہوا تو صبیرہ سلاد کے ساتھ نبرد آزما تھی جب کہ زارا اپنی یادداشت اور شفق کی معلومات کے سہارے فروٹ ٹرائفل کے لئے کسٹرڈ تیار کر رہی تھی۔

’’زبردست بھئی۔ یہ تو تھری ان ون ہو گیا۔ واہ۔‘‘ وہ ان تینوں پر فوکس کئے ہوئے تھا۔

’’دیکھ لو۔ آج تو تمہیں پروف بھی مل گیا۔ میں کچن کا کام بھی کر سکتی ہوں۔‘‘ زارا نے تفاخر سے کہا تو وہ متاثر ہونے والے انداز میں سر ہلانے لگا۔

’’یہ کیا بھئی۔ مہمان موجود میزبان غائب۔ اٹس ناٹ فیئر زارا۔‘‘

سیاہ جینز اور آدھی آستین کی براؤن ٹی شرٹ میں اس کا ورزشی سراپا نمایاں تھا۔ بولتا ہوا وہ کچن میں داخل ہوا تو وہاں کا ماحول دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ صبیرہ کے دل میں ناگوار سا احساس کروٹیں لینے لگا۔

’’ملازمہ چھٹی پر ہے یا تم لوگوں نے یہ جاب کر لی ہے؟‘‘ وہ شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

’’اپنے گھر کے کام فرض ہوتے ہیں ملازمت نہیں۔‘‘ زارا نے فلسفہ جھاڑا تھا۔

’’مگر یار عورتوں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ اس سے یوں کچن کے کام لینا اس کی شخصی آزادی کے خلاف نہیں ہے کیا؟‘‘ وہ بہت دوستانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ زارا اور شفق نے بے اختیار سر جھکائے ان کی جانب پشت کئے سلاد بناتی صبیرہ کو دیکھا تھا۔

’’ایڈی! میرے خیال میں تم باہر ہی بیٹھے رہو تو تمہارے لئے بہتر ہوگا۔‘‘ زارا نے اسے گھورتے ہوئے کہا تو وہ شانے اچکاتا وہیں کیبنٹ کی اسکائی بلیو ماربل ٹاپ پر بیٹھ گیا۔

’’ارے زارا کی بچی! اس کسٹرڈ کو بھی تو دیکھو، جل کے خاک ہو جائے گا۔‘‘ شفق چیخی تو زارا گڑبڑا کر چولہے کی طرف پلٹی تھی۔

”ویسے یار! یہ لوگ کچن کے کام کرتی زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ میں تو زارا کو اپنے گھر کے کچن کی جاب کا پروپوزل ضرور پیش کروں گا۔“ ثوبان مووی بناتے ہوئے اپنی پلاننگ بتا رہا تھا۔

”یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کچن کا کک کون ہوگا؟“ زارا نے بھی سکون سے جتایا تھا۔

”ان کو کس نے اس مشقت پر لگا دیا؟ یہ تو مرد کے شانہ بشانہ چلنے کی سوچ رکھتی ہیں۔ کن زنانہ کاموں میں پھنسا رکھا ہے ان کو؟“ اب کی بار اس کا نشانہ صبیرہ تھی اور وہ اس کا طنز سمجھ بھی گئی تھی۔ اس کی سائیڈ پر ہی تو بیٹھا تھا۔ یوں کہ اس کا سائیڈ پوز نظروں کی گرفت میں لئے ہوئے تھا۔

”ایڈی......“ زارا نے دانت کچکچائے تھے۔ مگر وہ کوئی اثر لئے بغیر آرام سے بولا۔

”ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔ ان کے لئے تو ان کی ملک ازمی میں کوئی جاب ہونی چاہئے۔ یا پھر انہیں آرمی کے ساتھ بارڈر پر بھیجنا چاہئے۔ دشمن کے میزائل کو مات کرے گی ان کی زبان۔“

”شٹ اپ۔“ وہ مشتعل ہو کر اس کی طرف جھٹکے سے پلٹی تھی۔ اس کا سرخ پڑتا چہرہ اس کی برداشت کا گواہ تھا۔ ”اگر میں خاموشی سے سن رہی ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم بہت خوبصورت گفتگو کر رہے ہو۔ بلکہ یہ سب صریحاً بکواس کے زمرے میں آتا ہے جو تم بہت بہترین طریقے سے کرتے ہو۔“

”ایڈی، صبی! پلیز۔“ زارا جو اس کے پھٹ پڑنے پر گنگ سی کھڑی تھی فی الفور ان کا بیچ بچاؤ کرانے لگی۔

”رہنے دو زارا! میں نے سنا ہے کہ انسان کے باطن کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ غصے کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ ذرا دیکھنے تو دو کہ بظاہر اس قدر پالشڈ نظر آنے والی صبیرہ علی اصل میں کیا ہے۔“

وہ صبیرہ کو دیکھتا بظاہر بہت سکون سے کہہ رہا تھا مگر اس کی نگاہوں کا تمسخر صبیرہ کا حوصلہ آزما گیا۔

”میں تمہاری طرح دوغلی شخصیت کی مالک نہیں ہوں۔ میرا ظاہر و باطن بالکل ایک سا ہے۔ تمہاری طرح میں گھٹیا سوچ پر خوبصورت لب و لہجے کے پردے نہیں ڈالے رکھتی۔“ اس کی سرمئی آنکھیں شعلے اگلنے لگی تھیں۔

”تھینکس فار دی کمپلیمنٹ۔ تمہیں مجھ میں کچھ تو خوبصورت دکھائی دیا۔“ اس کے بنائے ہوئے سلاد میں سے کھیرے کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھتا وہ سادگی سے بولا تو مووی بناتے ثوبان کو ہنسی آ گئی جب کہ گنگ کھڑی زارا اور شفق دفعتہً ہوش میں آئی تھیں۔

”ایڈی! دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ زارا نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا تو وہ ہنستا ہوا کیبنٹ سے اتر گیا۔

”بس اتنی سی تو برداشت ہے تم لوگوں میں۔ اسی لئے تو گولڈ میڈل نہیں ملتا۔“

ثوبان کے ساتھ کچن سے نکلتا وہ پھر استہزائیہ جملہ پھینکنے سے باز نہیں آیا تھا۔ شفق نے خاموش کھڑی صبیرہ کی طرف دیکھا۔ سرخ چہرہ لئے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے وہ اپنا غصہ کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اس ایڈی کے بچے کو تو میں بعد میں پوچھوں گی۔“ زارا بڑبڑائی تھی۔

”اگر اسے انوائٹ کرنا تھا تو مجھے پہلے سے بتا دیتیں۔ میں کبھی بھی یہاں نہ آتی۔“ وہ پھٹ پڑی تھی۔

”چھوڑو بھی صبی! دوستوں کی گیدرنگ ہے۔“ شفق نے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا مگر وہ اس کی بات کاٹ کر تختی سے بولی۔

”وہ میرا دوست نہیں ہے۔“

”اوکے، نہ سہی وہ تمہارا دوست۔ مگر یار اس سے زیادہ سخت الفاظ تو تم نے استعمال کئے ہیں۔ وہ تو ہنستا ہوا گیا ہے اور تم یہاں ابھی تک تپ رہی ہو۔“ زارا نے مصالحت آمیز انداز میں کہا تو وہ چڑ گئی۔

”کیونکہ وہ ایک ازلی ڈھیٹ شخص ہے۔“

بریانی کو دم پر رکھتے ہوئے شفق ان کی طرف پلٹی۔ صبیرہ کے چہرے پر ناراضگی اور غصے کی تحریر واضح تھی۔

”میں نے نوٹ کیا ہے صبی! کہ تم ایڈی کے نظریات سے اتنا نہیں چڑتیں جتنا کہ خود ایڈی کی شخصیت سے خار کھاتی ہو۔“

”کسی بھی انسان کی شخصیت اس کے خیالات و نظریات کا آئینہ ہوتی ہے شفق صاحب! اور وہ ایک غاصب شخص ہے۔ عورتوں کے حقوق غصب کرنے والا۔ ان کی آزادی سلب کرنے والا۔“ وہ شفق کے تجزیے پر چیخ اٹھی تھی۔

”مجھے تو ایسا کبھی نہیں لگا۔ وہ اسکول کے زمانے سے ثوبان کا بہترین دوست ہے۔ ہمارے گھر بھی اس کا آنا جانا ہے۔ مگر اس کی ایسی کوئی خامی مجھے دکھائی نہیں دی۔“ زارا نے صاف گوئی سے کہا تو وہ تلخی سے بولی۔

”کبھی اس کے گھر کی عورتوں کو دیکھنا۔ ان جیسی سوچ رکھنے والوں کو خود تو باہر انجوائے کرنا، لڑکیوں سے دوستی کرنا بہت اچھا لگتا ہے مگر گھروں میں کوئی نہ کوئی عورت ریت میں دبا کر ضرور رکھی ہوتی ہے۔“

”مائی گاڈ!“ شفق اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”اچھا چلو اب بس کرو۔ میری پارٹی خراب کرو گی کیا؟ اور ایڈی تو خوش ہوگا کہ ایک اور میدان میں صبیرہ علی کو مات دے دی۔ اس کا موڈ خراب کر دیا۔“

زارا کو اسے بلیک میل کرنے کا گر بہت اچھی طرح آتا تھا۔ سو صبیرہ علی کو اپنا موڈ ٹھیک کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

✿......✿

سرمئی لینڈ کروزر اور تانگے کے مابین ہونے والا ہلکا سا تصادم سراسر کروزر والے کی غلطی کی وجہ سے ہوا تھا۔ مگر کروزر کا مالک یوں دندناتا ہوا نیچے اترا جیسے اس غلطی کی پاداش میں وہ تانگے والے کو مار ہی ڈالے گا۔ پہلے اس نے کروزر کے فرنٹ ڈور پر پڑنے والی خراش کا معائنہ کیا جو کہ تانگے کے بانس کی رگڑ سے پڑی تھی پھر وہ بوڑھے تانگے والے کی طرف بڑھا جو اس غیر متوقع صورت حال پر ہق دق کھڑا تھا۔

”تم......تمیز نہیں ہے سڑکوں پر آنے کی تم لوگوں کو؟“

وہ بلادریغ گالیاں بک رہا تھا۔ ایک جھٹکے سے اس نے تانگے والے کے سینے پر ہاتھ مار کر پیچھے دھکیلا تو وہ جو لائبریری کی طرف بڑھتے ہوئے رک گئی تھی، تیزی سے اس طرف آئی تھی۔

”باؤ جی! میری غلطی نہیں تھی۔“ تانگے والا بوڑھا شخص کپکپاتی آواز میں بولا۔ مگر مقابل سوٹڈ بوٹڈ شخص کوئی تاویل سننے کو تیار ہی نہیں تھا۔

”تو کیا تمہارے باپ کی غلطی ہے؟“ کف اڑاتے ہوئے اس شخص نے پھر سے گالیاں دی تھیں۔ تانگے والے کی گدلائی آنکھوں میں چمکتی نمی نے تابندہ کے اندر جیسے طوفان مچا دیا تھا۔ جانے اس شخص کی اپنے گھر میں کتنی عزت تھی، اس کی کتنی تکریم کی جاتی تھی اور یہاں ایک سوٹ میں ملبوس بظاہر بہت نفیس دکھائی دینے والا شخص اس کی عزت کی دھجیاں اڑا رہا تھا۔

”غلطی سراسر آپ کی ہے مسٹر!“

تابندہ نے تلملا کر سامنے آتے ہوئے کہا تو وہ شخص ایک دم گڑبڑا گیا۔ گرمی کی شدت سے سرخ چہرہ لئے وہ جاذب نظر سی لڑکی اچانک ہی اس سین میں کود دی تھی۔ اردگرد کھڑے تماشائیوں میں مزید اضافہ ہونے لگا۔

”دو تین سو سے زیادہ کا نقصان نہیں ہوا ہے آپ کا۔ اور آپ کی گاڑی اور آپ کے حلیے سے لگ رہا ہے کہ اتنے کا راشن تو آپ اپنے کتے کو ایک روز میں کھلا دیتے ہوں گے۔ مگر کسی انسان کی عزتِ نفس کی کیا قیمت ہوتی ہے، وہ شاید آپ کو معلوم نہیں ورنہ کسی بزرگ کی بیچ سڑک میں گالیوں سے تواضع کرنے کی کوشش نہ کرتے۔“

اس کے کاٹ کھانے والے انداز نے اس شخص کو پریشان کر دیا تھا۔

”دیکھیں محترمہ! یہ آپ کا معاملہ نہیں ہے۔ اس شخص نے میری گاڑی برباد کر کے رکھ دی ہے۔ حساب چکانا میرا حق بنتا ہے۔“

”بہت خوب۔“ وہ تمسخر سے بولی۔ پھر اپنا بیگ کھول کر پانچ سو کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور اونچی آواز میں بولی۔ ”یہ اس آدمی کی طرف سے آپ کے نقصان کا ہرجانہ ہے۔ مگر آپ کو بھی ہرجانہ ادا کرنا پڑے گا۔“

”مجھے کس لئے؟“ وہ شیر ہوا تھا۔

”ان گالیوں کا جو آپ نے بیچ سڑک میں اس شخص کو دی ہیں۔ نقصان کے بدلے روپے اور گالیوں کے بدلے میں گالیاں۔“ وہ اطمینان سے بولی تو وہ بدک گیا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ یہ پانچ سو آپ رکھیں اور ذرا یہیں کھڑے ہوں۔ آپ کا نقصان تو پورا ہو گیا۔ اس کے بعد یہ تانگے والا آپ کو بیچ سڑک میں سب کے سامنے وہی کہے گا جو آپ نے اس سے کہا ہے۔ تب اس کی عزتِ نفس کا نقصان بھی پورا ہو سکے گا۔“ وہ بہت اطمینان سے کہہ رہی تھی۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟“ وہ شخص گڑبڑا کر اپنی گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اندر بیٹھ گیا اور لمحوں میں وہاں سے رفوچکر ہوا تھا۔

گہری سانس لے کر ادھر ادھر دیکھے بغیر وہ روپے اپنے بیگ میں ڈالتی تیز قدموں سے لائبریری کی طرف بڑھ گئی۔

”پتہ نہیں آج کل کے لوگوں کا ضمیر کہاں جا سویا ہے۔ کسی بے گناہ کی حمایت میں ایک لفظ بولنے کے لئے تو ان کے پاس وقت نہیں ہے اور تماشہ دیکھنے کی خاطر یوں جمع ہو جاتے ہیں جیسے ان سے فارغ اور کوئی نہ ہو۔ حد ہوتی ہے بے حسی کی بھی۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ ویسے ہوا کیا تھا؟“

وہ سیڑھیوں پر اس کا منتظر ہوا تھا۔

''ہونا کیا ہے۔ وہی امیر اور غریب کی ازلی لڑائی جس میں ہمیشہ امیر ہی اپنا پلڑا بھاری رکھتا ہے۔ لے کے اس بے چارے تانگے والے کو بے عزت کر دیا۔ اتنی گالیاں دیں اسے۔ حالانکہ غلطی بھی اس گاڑی والے کی تھی۔ بھئی اتنی ہی عزیز ہے گاڑی تو پورچ میں کھڑی رکھیں اور دن میں چار مرتبہ اس کی آرتی اتارا کریں۔ یوں سڑک پر لا کر غریبوں کو امتحان میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور یہ بے حس لوگ۔ ہر کسی نے دیکھا ہے کہ تانگے والا بے قصور تھا مگر مجال ہے کہ کوئی اس کی حمایت میں بولا ہو۔ ان سب کی تو انجوائے منٹ ہو گئی۔ مفت میں تماشہ دیکھنے کو مل گیا۔ حد ہوتی ہے بے حسی کی بھی۔''

وہ سخت تپے ہوئے انداز میں نان اسٹاپ بول رہی تھی۔

''بس جی، کیا کریں۔ زمانہ ہی خراب ہے۔'' ٹھنڈی سانس بھر کر کہا گیا تو فریش سا انداز تابندہ کو گڑبڑا کر ساتھ موجود بندے کی طرف متوجہ کر گیا۔ کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے وہ ٹھٹک گئی۔ یکلخت اس نے اس شخص کو گھورا تھا۔

''آپ کون؟''

مقابل کی آنکھوں میں حیرت سی اتر آئی تھی اور پھر ہونٹوں پر محظوظ کن مسکراہٹ۔

ان کو تو بھول کر بھی نہ آئی ہماری یاد
ہم انتظارِ شوق میں جاں سے گزر گئے

یہ مسکراہٹ، یہ اندازِ گفتگو۔

تابندہ کے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔ ہفتہ بھر پہلے لائبریری کے باہر، پارکنگ لاٹ میں اس شخص سے ہونے والی ناخوشگوار ملاقات اس کو تمام تر سیاق و سباق کے ساتھ یاد آ گئی۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھے گئی۔

''آپ ...... آپ وہی ہیں ناں جن کی وہ بائیک نہیں تھی؟''

اس کے انداز پر وقار علی نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے ہاتھ میں تھامی کتابیں میز پر رکھتے ہوئے ماتھے پر تیوری ڈالی تو وہ بھنویں اچکا کر یوں سر ہلانے لگا جیسے اس کے پُر ذہانت سوال سے بہت متاثر ہوا ہو۔ پھر سادگی سے بولا۔

''لائبریری میں کوئی کیا کر سکتا ہے؟''

چند ثانیے اسے گھورنے کے بعد وہ ڈھیلی سی ہو کر کرسی میں دھنس گئی۔

''ویسے جواب نہیں آپ کا بھی تابندہ ضیاء صاحبہ! پورے پانچ منٹ آپ مجھ سے یوں بات کرتی رہیں جیسے میری بیسٹ فرینڈ ہوں۔ اور اب یوں لاتعلقی برت رہی ہیں، یہ درست نہیں۔'' اس کے مقابل کرسی گھسیٹ کر بیٹھتا وہ بہت بے تکلفی سے کہہ رہا تھا۔ وہ کرنٹ کھا کر سیدھی ہو بیٹھی۔

''میرا نام آپ کو کس نے بتایا؟''

''طوطے نے۔''

''کیا؟'' وہ متحیر تھی۔

''آج صبح ہی فال نکلوائی تھی ایک طوطے سے اور کارڈ پر آپ ہی کا نام لکھا تھا، میرے آج کے ملاقاتیوں میں۔''

وہ معصومیت سے انکشاف کر رہا تھا جو تابندہ کو سراسر جھوٹ لگ رہا تھا۔

''دیکھیے مسٹر!'' اس نے تنبیہی انداز میں انگشت شہادت اٹھائی تھی کہ وہ اس کی بات قطع کر گیا۔

''وقار علی۔''

''آپ چاہے ایکس وائی زیڈ ہوں، مجھے اس سے کیا؟'' وہ تپ اٹھی۔

''ایکس وائی زیڈ نہیں، ڈبلیو۔ ڈبلیو سے وقار۔'' اس نے تصحیح کی۔ تابندہ نے دانت پیسے تھے۔

''دیکھیے اگر آپ اپنے اس ڈبلیو سے وقار کو سلامت چاہتے ہیں تو عزت و وقار کے ساتھ یہاں سے اٹھ جائیں۔ ورنہ شاید آپ مجھے جانتے نہیں۔''

''جانتا ہوں۔ تبھی تو یہاں موجود ہوں۔''

اس کے رسان سے کہنے پر تابندہ بغور اسے دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اچھی خاصی شکل و صورت کا اسمارٹ سا شخص تھا۔ کہیں سے بھی لفنگا نہیں لگ رہا تھا۔ مگر اس قدر معصوم بننے کا مطلب؟

وہ بے خیالی میں اسے دیکھے گئی مگر مقابل کی پُر شوق نگاہوں نے لحظہ بھر ہی میں اسے گڑبڑا کر نگاہ پھیرنے پر مجبور کر دیا۔

''ایکسکیوزمی۔'' وہ اپنی کتابیں اٹھاتی کرسی چھوڑ کر اٹھ گئی تھی۔ پرانی کتابیں واپس کر کے نئی کتابیں ایشو کروا کر وہ بہت مگن سی پلٹی تھی۔

''اس شان سے، اس ناز سے، اس تیز روی سے
گزرو گے تو دنیا ہی سے جائیں گے گزر ہم''

اس کے پیروں کو یکلخت بریک لگی تھی۔

وہ کتاب سامنے رکھے سر دھن رہا تھا۔ پٹخنے کے سے انداز میں کتابیں میز کی سطح پر رکھ کر وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ کنکھیوں سے اس کی تیوریاں اور دانت پیسنے کا نظارہ دیکھ رہا تھا۔

''کیا جانے ساتھ چھوڑ دے یہ زندگی کہاں
ہنستے ہوئے زمانے میں سب سے ملا کرو''

اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

''دیکھیں مسٹر ڈبلیو سے وقار! آپ شاید غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔'' وہ بمشکل آواز دھیمی رکھ پائی تھی۔

''اُف تو کیا میں آپ کو ایسا ویسا لڑکا دکھائی دیتا ہوں؟''

وہ جیسے بہت بڑے صدمے کی گرفت میں آ گیا تھا۔ مگر تابندہ اس کی ایکٹنگ سے ذرہ بھر بھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ چڑ کر بولی۔

''غلط فہمی ہے آپ کی۔ آپ ایک نہایت فضول شخص ہیں جو نہ صرف اپنا بلکہ میرا بھی ٹائم ضائع کر رہے ہیں۔''

''ویری گڈ۔ یعنی آپ نے میرے متعلق سوچنا شروع کر دیا ہے۔'' وہ خوش ہوا تھا۔ تابندہ کا دل چاہا کوئی وزنی سی کتاب اٹھا کر اس سر پھرے کے سر پر دے مارے جو پتہ نہیں کون سی خوش گمانیوں میں گھرا ہوا تھا۔

''جی بالکل! فتنوں کا شروع ہی میں خاتمہ نہ کیا جائے تو وہ فساد کا باعث بن جاتے ہیں۔'' وہ برداشت کی آخری حدوں پر تھی۔ بظاہر بہت رسانیت سے کہا تو وہ آنکھوں میں شرارت بھرتے ہوئے بولا۔

''چلیے گڈ بک میں نہ سہی، بیڈ بک میں ہی سہی، مگر آپ کی بک میں تو شامل ہو گیا ہوں نا۔''

''آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟'' وہ زچ ہو گئی تھی۔

''آپ سے دوستی۔'' وہ ایک دم سے بولا تو جواباً تابندہ کے چہرے پر پھیلتی ناگواری نے مقابل کو سنبھل کر اپنے الفاظ پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔

''آئی ایم سوری۔ میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے میرے الفاظ کو مائنڈ کیا ہے۔ دراصل میں آپ سے کچھ سنجیدہ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

''لیکن مجھے ایسی کوئی خواہش نہیں۔'' سرد مہری سے کہتے ہوئے تابندہ نے کتابیں سمیٹتے ہوئے اٹھنے کا قصد کیا تھا مگر اس کا مضبوط اور ٹھہرا ٹھہرا سا اٹل انداز اسے ساکت کر گیا۔

''مگر آپ میری خواہش بھی ہیں، چاہت بھی اور میری منزل کا راستہ بھی۔''

* * *

ثمین ویک اینڈ سے ایک روز پہلے ہی گھر چلی گئی تھی۔ سو واپسی پر اسے اکیلے ہوسٹل آنا پڑا تھا۔ پھر راستے میں تھوڑی سی شاپنگ کرنے کا خیال آیا تو وہ دو اسٹاپ پہلے ہی مارکیٹ میں اتر گئی۔ حالانکہ امی اس کے لئے صرف جیب خرچ ہی بھیجتی تھیں باقی ضرورت کی تمام اشیاء کا وہ خود ہی دھیان رکھتی تھیں۔ مگر صبیرہ کو یہ جیب خرچ اڑانے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ سو مہینے کے آخر میں اس کے پاس کافی رقم ہو جاتی تھی۔ جس میں سے امی کے لئے کچھ خریدتے ہوئے اسے ایک سنسنی آمیز خوشی محسوس ہوتی تھی۔ اب بھی اس نے امی کے لئے کاٹن چکن کا ایک خوبصورت سا سوٹ پیس اور پھر حسان کے لئے بیٹری سے چلنے والا سفید ٹیڈی بیئر خریدا جو نہ صرف گانا بھی گاتا تھا بلکہ اس کی آنکھوں میں لائٹس بھی جلتی تھیں۔

بہت جلدی کرتے ہوئے بھی پانچ بج گئے۔ ایک تو شاید گرمی اوپر سے پوائنٹ کا انتظار۔ وہ چوٹی سے ایڑی تک پسینے میں شرابور ہو گئی۔

''صحیح کہتی تھی ثمین۔ اس جگہ سے تو کنوینس ملنا سخت مشکل ہے۔''

اس نے کوفت سے دھول اُڑاتی سڑکوں کو دیکھا تھا جہاں اکا دکا گاڑیوں کے علاوہ کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا اور وہ خود حالانکہ درخت کی چھاؤں تلے کھڑی تھی مگر وقتاً فوقتاً چلنے والی گرم ہوا تو جیسے جہنم کے راستے سے گزر کر آ رہی تھی۔

دوبار اس کے روٹ کی وین آئی مگر اس قدر بھری ہوئی کہ مسافر پائیدان تک لدے ہوئے تھے۔ اتنی شدید گرمی میں اس ہجومِ بلاخیز میں گھسنے کا سوچ کر ہی اس کا دم گھٹنے لگا اور اوپر سے اتنے سارے مردوں کے بیچ کھڑے ہو کر سفر کرنے کا خیال ہی اسے نفرت انگیز لگتا تھا۔

وہ بے چینی سے گھڑی پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ تبھی اسے احساس ہوا کہ چند لمحے پہلے سڑک پر سے گزرنے والی موٹر سائیکل دوبارہ وہاں سے گزری تھی اور اس کے بعد اپنی راہ پر جانے کی بجائے پلٹی اور پھر اس تک آئی تھی۔ اس کی جھنجلائی ہوئی کوفت زدہ سی نظر سوار پر ٹھٹک سی گئی۔

''یہاں کیوں کھڑی ہو؟'' وہ سن گلاسز بالوں پر اٹکاتے ہوئے رعب سے استفسار کر رہا تھا۔

''تم سے مطلب؟'' اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔

''اتنی گرمی میں سنسان راستے پر کھڑے ہونے کا مطلب سمجھتی ہو کیا؟ اور وہ ثمین اور زارا کہاں ہیں؟''

اس کی بات نظر انداز کیے وہ اب بھی سختی سے پوچھ رہا تھا۔ صبیرہ کو غصہ آنے لگا۔

''میری مرضی۔ میں جہاں جی چاہے کھڑی ہوں۔ تمہیں میرے معاملے میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''دیکھو، یہاں سے کنوینس ملنا بہت مشکل ہے۔ تمام پوائنٹس بھرے ہوئے آتے ہیں۔ آؤ میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' وہ تحمل سے بولا تو اس کی آفر اور جرأت پر پہلے وہ حیران ہوئی پھر جیسے شعلوں میں گھر گئی۔

''شٹ اپ۔ تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں تمہاری آفر قبول کر لوں گی؟ مائنڈ یو مسٹر لیڈی! میں تم جیسوں کو منہ بھی لگانا پسند نہیں کرتی اور نہ ہی اتنی کمزور ہوں کہ مجھے تم جیسے مرد کے سہارے کی ضرورت محسوس ہونے لگے۔ بہتر یہی ہو گا کہ تم اپنے راستے پر جاؤ۔''

اس کے اس قدر سخت الفاظ پر بھی وہ یوں ٹھنڈا کھڑا تھا جیسے وہ کسی اور سے مخاطب ہو اور سچی بات تو یہ تھی کہ اس کا یہی انداز صبیرہ کو اپنی تضحیک کرتا محسوس ہوتا تھا۔

''میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کتنی بہادر ہو۔ مگر یہاں سے گزرنے والے فضول لوگ نہیں جانتے ہوں گے۔ دل تو میرا ابھی یہی چاہ رہا تھا کہ تمہیں یہیں کھڑا چھوڑ جاؤں مگر کیا کروں، اخلاقیات میں بھی تم سے بڑھ کر ہی ہوں، سو واپس پلٹ آیا۔ کیونکہ میرا دماغ بہت عقلمندانہ فیصلے کرتا ہے۔ اس لئے دل کے بیوقوفانہ فیصلے پر میں توجہ نہیں دیتا۔'' وہ اطمینان سے گویا تھا۔

ایک تو غضب کی گرمی اوپر سے وہ جان جلانے کو آموجود ہوا تھا۔ اس کی سرخ رنگت مزید تمتما اٹھی تھی۔ پسینہ پونچھ پونچھ کر دوپٹہ بھی گیلا ہو رہا تھا۔ پسیجتی ہتھیلیوں میں سے شاپنگ بیگ پھسلا جا رہا تھا۔

''تم یہاں سے جاؤ گے کہ میں چلی جاؤں؟'' صبیرہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سختی سے کہا تو لحظہ بھر اس کی سرمئی آنکھوں میں اترتی ناگواری کو دیکھنے کے بعد وہ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے سن گلاسز آنکھوں پر لگا کر بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔

''تم جیسے لوگ اپنی مرضی سے نقصان خریدتے ہیں صبیرہ علی! مگر انجام پچھتاوے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔'' اپنے مخصوص پُرسکون سے انداز میں کہتا وہ یہ جا وہ جا۔

''ہنہ، خدائی فوجدار۔'' وہ نئے سرے سے سلگ اٹھی تھی۔ اس قدر غصہ آ رہا تھا کہ حد نہیں۔

وہ جلتی سلگتی اسی کے خلاف سوچ رہی تھی کہ جب سڑک پر جاتی ایک موٹر سائیکل کچے راستے پر اتر کر عین اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ چونک کر متوجہ ہوئی تو دو لفنگے ٹائپ کے لڑکوں کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ پا کر اس کا دم حلق میں اٹک گیا تھا۔

⁂

وہ بے یقینی کے عالم میں سامنے بیٹھے شخص کو دیکھ رہی تھی۔ کتنے آرام اور سکون سے اس نے وہ چند الفاظ کہہ دیئے تھے مگر اس کے ان چند لفظوں نے تابندہ کی پوری ہستی ہی کو ہلا ڈالا تھا۔

ہر چند کہ وہ بہت پُراعتماد اور بولڈ لڑکی تھی مگر وقار علی نام کے اس شخص نے تو اسے گڑبڑا کر رکھ دیا تھا۔

اسے سنبھلنے میں بہت ٹائم لگا تھا۔

''دیکھیں وقار صاحب! آپ میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ میں کوئی ایسی گری پڑی لڑکی نہیں ہوں کہ جس کا جی چاہے اپنی فضول گفتگو سنانا شروع کر دے۔ حد ہو گئی۔ آپ تو پبلک پلیس کا بھی دھیان نہیں کر رہے۔'' اس نے اپنے دھیمے لہجے میں مقدور بھر سختی سموئی تھی مگر مقابل یونہی بہت اعتماد سے بیٹھا تھا۔

''میں آپ سے بہت لمبا چوڑا ریلیشن شپ نہیں چاہتا۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ یوں شرم، جھجک میں پڑ کر آپ کو گنوانے کی ہمت بھی نہیں رکھتا۔ اسی لئے اس طرح کے معاملات کو ناپسند کرنے کے باوجود آپ کو مخاطب کر بیٹھا۔ میں چند لمحوں کے لئے نہیں، پوری زندگی کے لئے آپ کا ساتھ چاہتا ہوں تابندہ! محض ٹائم پاسنگ نہیں۔''

'یا خدا! کیسا بے باک بندہ ہے۔' وہ اپنی نشست پر پہلو بدل کر رہ گئی تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ کو میری جسارت بہت ناگوار گزری ہے۔ لیکن میرے لئے تو زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ میں آپ کو کھونا نہیں چاہتا۔'' وہ بہت جذب بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں پیروں میں سنسناہٹ سی دوڑ رہی تھی۔ اس سے زیادہ سننا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ سو اپنی کتابیں اٹھا کر بیگ شانے پر ڈالتی وہ تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وقار علی وہیں بیٹھا بے بسی سے اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔

⁂

''حسینہ بہت گرمی میں کھڑی ہے یار! کیا خیال ہے، لفٹ نہ دے دی جائے؟''

وہ دونوں آپس میں مشورہ کر رہے تھے۔ صبیرہ کو اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔

دوپٹے کو مضبوطی سے مٹھی میں دبوچے وہ خود کو بظاہر ان کی گفتگو سے لاپرواہ ظاہر کر رہی تھی مگر دل کی دھڑکنیں اس قدر بے ترتیب ہو رہی تھیں کہ حد نہیں۔

''تمہارا کیا خیال ہے پھر۔ اتنی گرمی میں کہاں سڑ رہی ہو؟ آؤ کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔ آئس کریم کھاتے ہیں۔''

''سوہنیو! ہمیں بھی تو میزبانی کا موقع دو۔''

وہ خبیث سی مسکراہٹ لئے بدگوئی پر اتر آئے تھے۔

''کیا بکواس کر رہے ہو تم لوگ؟'' اس کا ازلی غصہ عود کر آیا تھا۔ سوکھتے ہوئے حلق کی پرواہ کیے بغیر وہ تنک کر بولی تو وہ دونوں ڈھٹائی سے ہنسنے لگے۔

''اوہو، یہ تو برا مان گئی۔ چلو اب آرام سے موٹر سائیکل پر بیٹھ جاؤ۔ ابھی ہم واپس چھوڑ دیں گے تمہیں۔''

وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی تھی۔ حلیے سے وہ اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانوں کے لڑکے لگ رہے تھے مگر چہرے سے ٹپکتی خباثت اور گھٹیا انداز گفتگو ان کے کردار کا آئینہ دار تھا۔

''سنا نہیں تم نے؟'' اب کی بار وہ غصیلے انداز میں کہتا ہوا اس کی طرف بڑھا تو وہ خوف و سراسیمگی کے عالم میں پیچھے ہٹی تھی۔ تبھی کسی پتھر پر سے پاؤں رپٹ گیا تو وہ زمین پر گر گئی۔ اس کا بیگ، فائل اور شاپنگ بیگ بکھر گئے تھے۔ اپنی بے بسی پر اسے رونا آنے لگا تو وہ چیخ اٹھی تھی۔

''چہ...... چہ...... بے چاری گرمی سے گھبرائی ہوئی ہے۔ آؤ ابھی تمہاری خاطر شاطر کرتے ہیں۔''

وہ دونوں اس کی خوفزدہ کیفیت کا مزہ لے رہے تھے۔ ایک نے جھک کر اس کا بازو مضبوطی سے تھام کر اسے اٹھانے کی کوشش کی تو وہ بے اختیار چلانے لگی۔ تب دوسرے لڑکے نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی تھی۔

وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ اٹھی۔

''اچھا تھا نا اگر گاڑی لے کر آتے۔ یہ بائیک پہ کہاں بیٹھنے والی ہے۔ میں جاؤں پھر۔ دو منٹ لگیں گے۔ یہاں کون سا کوئی آ رہا ہے۔''

وہ دونوں بڑے اطمینان سے پروگرام بنا رہے تھے۔ صبیرہ کو لگا جیسے اس کی جان نکل جانے والی ہو۔

اسی وقت ایک اور موٹر بائیک عین ان کے سر پر آ کر رکی تھی۔ وہ لوگ اپنی بحث میں کسی اور طرف کا دھیان ہی نہیں رکھ پائے تھے۔

بائیک کو اسٹینڈ پر کھڑا کرنے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے آنے والے نے زمین پر لٹایا اور آتے ہی ان دونوں لڑکوں پر پل پڑا۔ وہ دونوں اس اچانک افتاد پر بوکھلا کر دفاعی انداز میں پیچھے ہٹتے چلے گئے تھے۔

وہ یونہی مٹی پر گھٹنوں میں سر دیئے بے حواس سی بیٹھی تھی۔ ان دونوں لفنگوں کی تسلی بخش دھلائی کرنے کے بعد انہیں رخصت کر کے وہ گہری سانسیں لیتا تنفس کو اعتدال پر لاتے ہوئے اس کی طرف پلٹا تو چہرے پر غصے کی سرخی تھی۔

''یہ ہوتا ہے تم جیسی لڑکیوں کی بے جا اکڑ اور انا پسندی کا انجام۔ مجبوری میں تو حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔ اگر اس وقت میری بات مان لی ہوتی تو......''

وہ کہتے کہتے لب بھینچ گیا تھا۔ اس کے ہلتے ہوئے وجود نے اسے احساس دلایا کہ وہ رو رہی ہے۔

''کم آن صبیرہ! اٹس اوکے۔ اب کوئی پرابلم نہیں ہے۔ اٹھو شاباش۔'' بہت مشکل سے وہ اپنے انداز میں نرمی سمو پایا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ایک آدھ تھپڑ صبیرہ علی کو بھی لگانے سے نہ چوکتا۔

کس کام کی وہ انا اور اکڑ جو آپ کو زندگی بھر کا نقصان تحفے میں دے جائے۔

''صبیرہ......''

اُسے یونہی گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے دیکھ کر وہ تپ اٹھا تھا۔ ایک تو غلطی بھی اس کی اپنی تھی اوپر سے وہ مزید بے وقوفی دکھا رہی تھی۔

''کیا تم چاہتی ہو کہ وہ دونوں واپس آ کر مزید تمہیں تنگ کریں۔ تو مجھے بتا دو۔ میں خوامخواہ اتنی گرمی میں خوار ہو رہا ہوں۔''

اس نے آہستگی سے چہرہ اٹھایا تھا۔

گرمی کی شدت سے سرخ پڑتا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ اوپر سے شرمندگی و ندامت اس کے سامنے مزید اہانت کا شکار کر رہی تھی۔ ایک نظر اسے دیکھنے کے بعد وہ لب بھینچے اس کی چیزیں اکٹھی کرنے لگا۔ اس نے کھڑی ہونے کی کوشش کی تب پاؤں سے اٹھتی درد کی شدید لہر نے واضح کیا کہ پتھر سے پاؤں رپٹنے کی وجہ سے شاید موچ آ گئی تھی۔ وہ بے ساختہ سسکی بھر کے رہ گئی۔

اس کی چیزیں اس کی طرف بڑھائے وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ مٹی سے اٹا لباس۔ خوف سے اُڑی رنگت۔

پہلے والا اکھڑ اور غصیلا انداز یکسر بدل چکا تھا۔

کانپتے ہاتھوں سے وہ کپڑوں کی گرد جھاڑ رہی تھی۔

بیگ شانے پر ڈال کر اس کے ہاتھ سے فائل اور شاپنگ بیگ تھام لیا۔

ایڈی اپنی بائیک سیدھی کر رہا تھا۔

صبیرہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

اس شخص سے کسی بھی قسم کی مدد لینا اس کے لئے باعث توہین تھا۔ مگر قسمت اسے صبیرہ کے لئے نیکی کا فرشتہ بنانے پر تلی ہوئی تھی۔

''محترمہ! آپ یہ کام ہوسٹل جا کے بھی کر سکتی ہیں۔ فی الوقت مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' اسے اپنی جگہ جما کھڑا دیکھ کر وہ کوفت سے بولا تو وہ اس سے نظر ملائے بغیر شرمندگی کے حصار میں گھری بائیک کی طرف بڑھی تھی۔

پاؤں سے اٹھتی درد کی لہروں نے اسے دانتوں پر دانت جمانے پر مجبور کر دیا۔ فل اسپیڈ پر اسپورٹس بائیک دوڑاتا وہ اسے ہوسٹل تک لایا تھا۔ صبیرہ کو لگا جیسے اس کی جان کسی شکنجے سے آزاد ہو گئی ہو۔

''ہر کوئی تمہاری طرح عورتوں کی آزادی کا حمایتی نہیں ہے صبیرہ علی! اس معاشرے میں ایک آزاد اور تنہا عورت کی یہی وقعت ہے مردوں کی نگاہ میں۔ کوئی بھی گراوٹ کا مظاہرہ کرنے سے باز نہیں رہتا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ ہر چیز اپنے مقام پر عزت سے رہنے دی جائے تو اپنی عزت بھی قائم رہتی ہے۔ یوں سر راہ خود کو اور دوسروں کو امتحان میں ڈالنے سے کیا حاصل؟'' وہ اپنے مخصوص استہزائیہ انداز میں کہتا چلا گیا تھا۔

اور تب پہلی بار صبیرہ ضبط کے دہانے پر کھڑی پیچھے اُڑتی دھول دیکھتی رہ گئی۔

✡……✡

''کس قدر بے وقوف ہو تم تابی! اتنے آرام سے اس لفنگے کی عشقیہ گفتگو سن کے آ گئیں۔'' اس کے منہ سے تمام کہانی سننے کے بعد سمیرا اپنے ایک سالہ بیٹے کو تھپکنا بھول گئی تھی۔ تحیر سے بولی تو وہ ہنسنے لگی۔ پھر اس کا مذاق اڑانے والے انداز میں پوچھنے لگی۔

''تو تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہئے تھا؟''

''تمہیں چاہئے تھا کہ اسی وقت اپنی سینڈل اتار کر اس کی وہ تواضع کرتیں کہ اس کے سر سے عشق و عاشقی کا بھوت اتر جاتا۔''

''تم کہہ سکتی ہو۔ کیونکہ تم نے ابھی اسے دیکھا نہیں ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی تو سمیرا اسے بغور دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ ہونٹوں پر نہ سمجھ میں آنے والی دھیمی سی مسکراہٹ اور چہرے پر پُرسکون سی جاذبیت۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس نے اپنے شک کو دور کرنا چاہا تھا۔

''وہ نہ تو لوفر ہے اور نہ ہی لفنگا۔ بلکہ ایک خاصا مہذب اور پڑھا لکھا شخص لگتا ہے۔''

تابندہ نے اطمینان سے کہا تو وہ اس کے انداز پر جل کر بولی۔ ''اب لگنے کو تو میری شکل بھی جاوید کو مارلن منرو جیسی لگتی ہے پر میں وہ تو نہیں بن سکتی نا۔ لگنے اور ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے تابندہ ضیاء صاحب!''

اس کے جلے کٹے انداز پر وہ بے اختیار ہنستی چلی گئی تھی۔ اس کے شفق رنگ رخساروں اور آنکھوں کی چمک نے سمیرا کو خدشات میں مبتلا کر دیا۔

ان دونوں کی چند دنوں کی نہیں بلکہ سالوں پرانی دوستی تھی۔ پہلی جماعت سے لے کر بی اے تک وہ اکٹھی پڑھی تھیں۔ اس کے بعد سمیرا کی شادی ہو گئی جبکہ تابندہ ابھی ایم اے انگلش کے ایگزامز سے فارغ ہوئی تھی۔

اس کے بدلتے انداز وہ کیوں نہ پہچانتی۔ وہ تو اس کی ہر ادا سے واقف تھی۔

''چاہے وہ فارن کوالیفائیڈ ہی کیوں نہ ہو اس سے تمہیں کیا مطلب؟ اور پھر اس فضول شخص کی لچر گفتگو سننے کا مطلب ہی کیا تھا تمہارا؟'' اس نے سختی سے کہا تو وہ شرارت سے بولی۔

''لچر یا رومینٹک؟''

''بکواس مت کرو۔'' وہ چڑتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں بولی۔

''تم کچھ بھی کہو سمیرا، وہ شخص مجھے فراڈ نہیں لگتا۔ اس کے لفظوں سے اپنائیت کی خوشبو آتی ہے سچائی جھلکتی ہے۔''

''تو……؟''

''تو یہ کہ وقار علی کی میرے آئیڈیل کے عین مطابق ہے۔'' وہ بے حد اطمینان سے بولی تو سمیرا چند لمحوں تک خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔

''اور احسن۔ اس کا کیا؟'' اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں پوچھا تھا۔

تابندہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سکڑ گئی۔ آنکھوں کی چمک پر بیزاری کی لہر حاوی ہونے لگی۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ وہ میرے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ ہماری زیرو فیصد بھی آپسی ذہنی مطابقت نہیں ہے۔ مجھے زندگی میں تھرل پسند ہے، بولڈنیس اچھی لگتی ہے۔ شور ہنگامہ پسند ہے۔ اور احسن۔'' اس نے رک کر گہری سانس اندر کھینچی تھی۔ پھر مذاق اُڑانے والے انداز میں بولی۔ ''اس کا انداز میرے لئے ہمیشہ بھائی جان جیسا ہوتا ہے۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ مجھے کسی بھی رخ سے منگیتر نہیں لگا تو میں کیا کر سکتی ہوں؟ ویسے بھی اس قدر سوبر اور چپ چاپ شخص میرا آئیڈیل نہیں ہے۔ مرد کو اس قدر کونفیڈنٹ اور بولڈ ہونا چاہئے کہ اس کے سامنے عورت کی بولتی بند ہو جائے۔''

''اور یقیناً وقار علی نے تمہاری بولتی بند کر دی ہوگی۔'' سمیرا نے استہزائیہ انداز میں کہا تو اس کے ذکر پر وہ پھر سے کھل گئی۔

''اُف سمیرا! تم سوچ نہیں سکتی کہ اس وقت میری کیفیت کیا تھی۔ یہی لگ رہا تھا کہ میں ابھی بے ہوش ہو جاؤں گی۔'' اس نے جوش سے مٹھیاں بھینچی تھیں۔

''تو یہ بھی کر دیکھتیں۔ موصوف کونفیڈنٹ اور بولڈ تو ہیں ہی۔ یقیناً تمہیں اچھی طرح سے سنبھال بھی لیتے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

''اسٹوپڈ۔'' وہ جھینپ گئی تھی۔

سمیرا نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''تابی! زندگی میں ہر چیز انسان کو من مرضی سے نہیں ملتی۔ بہت سے ایسے معاملاتِ زندگی ہوتے ہیں جن میں حالات اور وقت کی نزاکت دیکھ کر وہ فیصلہ کیا جاتا ہے جس میں صرف اپنی نہیں بلکہ سبھی کی خوشی اور بہتری ہو۔ روشنی کی حقیقت صرف یہی نہیں کہ مٹھی میں بھرنے پر صرف جگنو ہی حاصل ہوں، جلتے کوئلے بھی ہاتھ جلا سکتے ہیں۔ میں تمہاری اس تمام گفتگو کو احمقانہ قرار دوں گی۔ تمہارے لئے اس اجنبی شخص سے احسن بھائی ہزار درجہ بہترین ہیں۔ نہ صرف ان سے بلکہ ان کی پوری فیملی سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ وہ لوگ بھی تمہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ سگی خالہ کے گھر بیاہ کے جاؤ گی تو ایڈجسٹمنٹ میں کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔ اس طرح کے چکروں میں صرف وقت ہی نہیں کبھی کبھار پوری زندگی ضائع ہو جاتی ہے۔ اور میں تمہیں ایسا کوئی فضول قدم اٹھانے کا مشورہ نہیں دوں گی جس سے دو گھرانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے رنجش پیدا ہو جائے۔''

تابندہ نے اس کے تمام لیکچر کو تحمل سے سنا تھا۔ اس کے چہرے سے اب بھی سکون ہویدا تھا۔

''مائی ڈیئر! ایسا ویسا کچھ بھی نہیں ہونے والا ہے۔ جو کچھ تھا وہ میں نے تمہیں صاف صاف بتا دیا اور بس۔''

سمیرا شکی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

بظاہر تو تابندہ نے ہنس کر بات ختم کر دی مگر حقیقت تو یہ تھی کہ وقار علی شخصیت نے اسے بری طرح ڈسٹرب کر دیا تھا۔

جذبوں کی لو دیتی وہ پُرشوق سی آنکھیں اسے بے خواب رکھنے لگیں۔ وہ خود کو سمجھانے کی کوشش میں نڈھال ہونے لگی تھی۔

احسن اس کا سگا خالہ زاد تھا اور اسی ناتے امی کو عزیز بھی بہت تھا۔ ماں باپ کے بعد دونوں بہنوں کو ایک دوسرے ہی کا سہارا تھا سو وہ ایک دوسرے کو بہت چاہتی تھیں۔ اسی چاہت کو مضبوط کرنے کے لئے انہوں نے اپنے بچوں کے رشتے آپس میں طے کر دیئے تھے۔

مگر احسن اپنے مزاج کی نرمی اور دھیمے پن کی وجہ سے تابندہ کے ایک شوہر کی حیثیت سے طے کردہ ذہنی سانچے میں فٹ نہیں آتا تھا۔ سو اس نے کبھی بھی احسن کے متعلق ایک منگیتر کی حیثیت سے نہیں سوچا تھا مگر وقار علی کے یوں اچانک زندگی میں ہلچل مچا دینے کے بعد تو وہ عجیب مشکل میں پڑ گئی تھی۔

اسے اچھی طرح علم تھا کہ سمیرا کی باتیں سو فیصد درست ہیں اگر وہ وقار علی کے حق میں فیصلہ کر بھی لیتی تو گھر میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا اور جس گھر اور گھر کے مکینوں سے وہ شدید محبت کرتی تھی وہاں سے دربدری اسے منظور نہیں تھی۔

سو دل پر پتھر رکھ کر سمیرا کے مشوروں کی روشنی میں وہ پورا ایک ہفتہ لائبریری نہیں گئی تھی۔ مقصد نہ صرف وقار علی بلکہ خود کو بھی یہی باور کرانا تھا کہ اس کی زندگی میں وقار علی نامی شخص کی کوئی جگہ نہیں ہے اور ایک ہفتے کے بعد سمیرا نے فون پر مزاح کے رنگ میں کہا تھا۔

''تم دیکھنا اس سڑک چھاپ عاشق کی دھول بھی نہیں ملنے والی۔''

وہ ہنس کر چپ ہو رہی۔

آسمان پر چھائی بدلیوں نے موسم گرما کی شدت کو کم کر کے ماحول میں دلفریب سا رنگ بھر دیا تھا۔

اس نے ریموٹ کا بٹن دبا کر خود کار شیشہ نیچے کیا تو کھڑکی کے راستے ٹھنڈی نرم ہوا کے جھونکے اس کے بالوں کی شرارتی لٹوں سے اٹکھیلیاں کرنے لگے۔

اس کا دل چین اور بے چینی کے سنگم پر دھڑک رہا تھا۔

اس نے کئی بار دعا مانگی کہ آج وقار علی وہاں موجود نہ ہو۔ مگر پتہ نہیں کیوں ہر بار اس کے وجدان نے پلٹ کر یہی کہا کہ وہ ضرور موجود ہوگا۔

''خیر وہ موجود بھی ہوا تو آج میں اچھی طرح اس کی طبیعت صاف کر دوں گی۔ آئندہ کبھی مجھ سے بات کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔''

بہت سے ارادے باندھتی توڑتی وہ گاڑی پارک کر کے نیچے اتری تو نہ جانے کہاں سے وہ ایک دم سامنے آ گیا۔ وہ گاڑی کا ریموٹ بیگ میں رکھتی ساکت کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ تھکا تھکا اور مضمحل تھا۔ مگر تابندہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں اور چہرے پر جو بشاشت بھری چمک اتری تھی وہ تابندہ کو بری طرح محسوس ہوئی تھی اور اوپر سے اس کا مخصوص بولڈ انداز۔

''بہت ظالم ہیں آپ تابندہ ضیاء! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے اتنے واضح اعتراف کے بعد آپ یوں راہ فرار تلاش کر کے سنگدلی برتیں گی۔''

اس قدر اچانک حملے پر وہ ہق دق رہ گئی۔

وہ تو اس موضوع کے بند ہو جانے کے یقین کے بعد اس طرف آئی تھی مگر فریق ثانی اسی شدومد سے اپنے مقدمے میں جتا ہوا تھا۔

''آپ نہیں جانتیں گزرے سات دن میں نے کس تکلیف اور اذیت میں گزارے ہیں۔ روزانہ چار بجے سے لے کر سات بجے تک میں نے یہاں کھڑے ہو کر انتظار کیا ہے۔ انجانے چہروں میں آپ کو تلاشا ہے۔ میں نے آپ سے کہا بھی تھا تابندہ! کہ مجھ میں آپ کو کھونے کا حوصلہ نہیں ہے۔ پھر بھی آپ نے اتنی سنگدلی سے مجھے آزما ڈالا۔''

وہ مدھم مگر جذبات سے بھرپور لہجے میں اپنی بے قراریوں کی داستان سنا رہا تھا۔ تابندہ کو لگا اس کے چہرے سے آگ کی لپٹیں نکلنے لگی ہوں۔ دل یوں مچلا جیسے ابھی سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

''میں آپ سے کچھ دیر بات کرنا چاہتا ہوں تابندہ! پلیز انکار مت کیجئے گا۔'' وہ ملتجیانہ لہجے میں کہہ رہا تھا اور وہ تو اس سے آنکھ ملانے کی جرأت بھی نہیں کر پائی تھی۔

''کک ...... کیا ...... بات؟'' اس نے تھوک نگل کر خشک حلق کو تر کیا تھا۔

''مجھ پر اعتماد کرو تابندہ! مجھے صرف چند لمحے درکار ہیں۔ آپ نہیں جانتیں کہ آپ میری کتنی بڑی مشکل حل کر دیں گی۔ صرف چند منٹ۔'' اس کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ جانے وہ خوش گمانیوں کی کن زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا کہ اس کے اجتناب و گریز کی ہر دیوار کو اپنی دیوانگی کے تیشے سے چکنا چور کرتا اس کے مقابل آن کھڑا ہوا تھا۔

خود وقار علی کے لئے بھی اپنی یہ بے اختیاری بہت متحیر کر دینے والی تھی۔ مگر اپنی بے حد جذباتی اور فیصلہ کن طبیعت کی وجہ سے اس کے دل کو سمجھانے اور بہلانے کی بجائے اس کی من مرضی پر چھوڑ دیا تھا اور جب وہ ہر بار ہمک ہمک کر تابندہ ضیاء ہی کی طرف مچلا تو اسے لگا جیسے دل کے ساکت دریا میں باڑ آ گئی ہو۔ جذبات کی سرکش لہریں طوفانوں کا روپ دھار کر کسی ساحل کی طرف لپکنے کو بے تاب ہو گئیں۔

تب اس نے خود کو حد درجہ بے بس اور تابندہ ضیاء کے رحم و کرم پر پایا تھا۔

مگر وہ گندمی رنگت والی پُرکشش حسینہ کس قدر ظالم نکلی تھی۔

چند لمحے بھیک میں دان کرنے کے بعد یوں غائب ہوئی کہ وہ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہونے لگا۔

اور اب پورے سات دنوں کے بعد وہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھی تو دل میں پُرسکون سا احساس جاگزیں ہو گیا تھا۔

کاٹن کا اولیو گرین ہم رنگ کڑھائی سے مزین لباس پہنے ہمیشہ کی طرح سیدھی شفاف مانگ کے ساتھ لمبی سی چٹیا بنائے وہ مزید کسی بھی قسم کی آرائش سے پاک تھی۔ زیور کے نام پر کانوں میں سفید نگوں والے گولڈ کے ٹاپس اور بائیں کلائی میں ویسا ہی بریسلٹ پہنے وہ دلکشی کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ وقار علی کی بے تابی نے اس کے چہرے پر خون چھلکا دیا تھا۔ پلکوں کی سیاہ جھالر جیسے اب کبھی نہ اٹھنے کے لئے رخساروں پر سایہ فگن ہو گئی تھی۔

''کیا آپ میری درخواست قبول کریں گی؟'' وہ آس و نراس کی کیفیت میں گھرا تھا۔ تابندہ بمشکل اثبات میں سر ہلا پائی۔

خود سے کئے تمام وعدے اور ارادے وقار علی کی جذباتیت بھری گفتگو اور اس کے لب و لہجے کی بے اختیاری بہا لے گئی تھی۔

اس کا اقرار جیسے وقار علی کی زندگی میں بہار لے آیا۔ اس کے لبوں کی تراش میں مسکراہٹ ابھری تو سیاہ آنکھوں کی چمک کئی گنا بڑھ گئی۔

''اتنا خوبصورت موسم ہے۔ وہاں سامنے پارک میں چلتے ہیں۔''

اس نے مشورہ نہیں مانگا تھا بلکہ فیصلہ دیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل دی۔

پانچ منٹ کی واک کے بعد وہ دونوں پارک میں موجود تھے۔ چونکہ یہ کالونی کا پارک تھا اس لئے بہت بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ ایک طرف چند بچے کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے اور چند مرد و خواتین اچھے موسم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے واکنگ ٹریک پر چل رہے تھے۔

وہ تابندہ کو ساتھ لئے قدرے سائیڈ پر سنگ مرمر کی بینچ پر آ گیا۔

وہ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا جانے کچھ سوچ رہا تھا یا لفظوں کے جوڑ توڑ میں مصروف تھا مگر اتنی دیر میں وہ کم از کم خود کو سنبھال گئی تھی اور کسی حد تک خود کو اس کے جواب دینے کے قابل بھی بنا لیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پلٹا اور اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

''مجھے نہیں پتہ کہ مجھے یہ سب کس طرح کہنا چاہئے یا یوں سمجھ لو کہ مجھے ان سب باتوں کا سلیقہ ہی نہیں ہے۔ مگر میرا وجدان کہتا ہے کہ تم مجھے ناپسند نہیں کرتیں۔'' وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے گھوما تو اس کی آواز کے ساتھ تابندہ کو اپنی دھڑکنیں بھی رکتی محسوس ہوئی تھیں۔

''میں تمہارا چند لمحوں کا نہیں، زندگی بھر کا ساتھ چاہتا ہوں تابندہ! اور اس کے لئے میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔'' اس نے بڑے جذب کی سی کیفیت میں کہہ دیا تھا۔

اسے خود کو سمیٹنے اور پھر مناسب الفاظ کا ذخیرہ اکٹھا کرنے میں ایک بہت بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

''دیکھیں یہ عمر بھر کے فیصلے ہیں۔ یوں راستوں میں طے نہیں کئے جاتے۔'' اس نے خود کو وقار علی کی جذباتیت کے حصار سے نکالنے کے لئے ایک کمزور سی کوشش کی تھی۔

''میں بھی راستوں میں یہ رشتہ طے نہیں کرنا چاہتا اسی لئے تو تم سے تم کو مانگ رہا ہوں۔ تم اقرار کرو گی تو تم کو پانے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھوں گا۔'' وہ اپنی بے اختیاری میں یکلخت ہی تخاطب کے فاصلے سمیٹ گیا تھا۔

''پلیز تابندہ! مجھے ایک بار اپنی قسمت آزمانے کا موقع دو، میں کسی قیمت پر تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔''

آندھیوں کا شور پل بھر میں اس کی ہستی کو زیر و زبر کر گیا تھا۔

جب دو دل ایک ہی تان پر دھڑکنے لگیں تو پیروں میں چھنکتی مجبوریوں کی زنجیروں کی کھنک سنائی نہیں دیتی۔ تابندہ ضیاء بھی ان لمحوں میں اس ساحر سے تسخیر ہو گئی تھی۔

٭......٭

''اگر میں نے میڈیکل پڑھی ہوتی تو میں ڈاکٹر ہوتی۔ یہ میری تشخیص ہے کہ مجھے اب بخار نہیں ہے۔'' امی کو ہاتھوں میں پھر سے دلیے کا پیالہ دیکھ کر وہ احتجاج کرنے لگی تھی۔

''مگر بیٹا! آپ نے میڈیکل نہیں پڑھی۔ اس لئے آپ کی تشخیص بالکل غلط ہے۔'' انہوں نے آرام سے کہتے ہوئے پیالہ اس کے ہاتھوں میں تھمایا اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کر کھڑکی کے دونوں پٹ وا کر دیئے۔

''باہر موسم اتنا اچھا ہو رہا ہے اور تم اتنی حبس کئے بیٹھی ہو کمرے میں۔''

''تو آپ نے کون سا اچھے موسم کے لحاظ میں دلیے سے ہٹ کر کچھ سوچا ہے۔'' وہ منہ بناتی دلیے کا چمچہ بھرنے لگی۔ اسے علم تھا کہ جب تک وہ دلیہ ختم نہیں کرے گی امی یونہی کمرے میں منڈلاتی رہیں گی۔

''ابھی کچھ دیر پہلے زارا اور شفق کا فون آیا تھا تمہارے لئے۔'' انہوں نے بتایا تو صبیرہ کا ہاتھ وہیں تھم گیا۔

اس ایڈی کے بچے نے تو اب تک اپنی بہادری کے قصے عام کر دیئے ہوں گے۔

''مجھے کیوں نہیں بتایا؟''

''تم سو رہی تھیں۔ اس نے کہا کہ تمہیں ڈسٹرب نہ کروں۔ بس تمہاری خیریت معلوم کر رہی تھیں۔'' انہوں نے عام سے لہجے میں کہا اور کرسی پر بیٹھ گئیں۔

''امی! آپ بھی نا بس کمال ہی کرتی ہیں۔ اس پورے ہفتے میں پتہ ہے میرے کتنے امپورٹنٹ لیکچرز مس ہو جائیں گے۔ کیسے کور کروں گی میں؟'' وہ اب بھی اس عجیب سی اضطرابی کیفیت میں مبتلا تھی۔

یوں اس کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پتہ نہیں ایڈی نے یونیورسٹی میں اس کے خلاف کیا مہم چلا رکھی ہو۔ اس کی تو یوں بھی صبیرہ سے نہیں بنتی تھی۔ اب تو اس کے

ہاتھ خوب موقع لگا ہوگا اس کی شخصی آزادی کی درگت بنانے کا۔

''کچھ نہیں ہوگا۔ میں نے شفق سے کہہ دیا ہے۔ وہ سب دیکھ لے گی۔ اور ذرا اپنی حالت بھی دیکھو۔ تین دن کی بیماری میں بالکل مرجھا کر رہ گئی ہو۔ اب بھلا اتنی شدید گرمی میں بازاروں کی خاک چھاننے کی کیا ضرورت تھی؟ کتنی مرتبہ کہا ہے کہ اکیلی کہیں مت جایا کرو۔ کہیں کچھ ہو جاتا تو پھر؟''

بھری دنیا میں ایک دوسرے کے لئے صرف وہی تو تھیں۔ پیالہ سائیڈ میں رکھتے ہوئے آگے کھسک کر وہ ان کے گلے میں بازو حمائل کر کے لپٹ گئی تو انہوں نے اسے بانہوں میں بھینچ لیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔

ہمیشہ کی طرح اس نے اپنا پسندیدہ جملہ نہیں بولا تھا جو وہ زچ آکر بولا کرتی تھی۔

''کچھ بھی نہیں ہوتا امی جی! مرد اگر ہر جگہ اکیلے جا سکتا ہے تو عورت پر پابندی کیوں؟''

اس کا ذہن اب تک اس ناقابلِ یقین واقعے میں اٹکا ہوا تھا۔

وہ اب بھی سوچتی تو اس کے پورے وجود میں خوفزدہ سی سنسناہٹ دوڑ اٹھتی تھی۔

'اگر اس وقت ایڈی وہاں نہیں آتا تو؟'

اسی خوف اور دہشت اور کچھ پاؤں میں آئی موچ نے اسے شدید بخار کی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔

وہ اس واقعے کو جتنا بھولنے کی کوشش کرتی اتنی ہی آب و تاب سے وہ تمام سین پردہ ذہن پر جگمگانے لگتے تھے۔ تمام تر مخالفت اور ناپسندیدگی اپنی جگہ مگر وہ ایڈی کی مشکور تھی جو اس نازک موقع پر اپنی نام نہاد انا کو لے کر نہیں بیٹھ گیا تھا۔ ایڈی کے طرزِ عمل نے صبیرہ کے ذہن میں کم از کم انسانیت کے شعبے میں ضرور تھوڑی جگہ پا لی تھی مگر ساتھ ہی ساتھ پرانی دشمنی کا خیال آتا تو وہ یہ سوچ کر پریشان ہونے لگتی کہ کہیں ایڈی نے وہ تمام قصہ نمک مرچ لگا کر سبھی میں نہ پھیلا دیا ہو۔

'یہ تو اب واپس جا کر ہی پتہ چلے گا کہ کیا صورت حال ہے۔'

وہ خود کو حوصلہ دے کر رہ جاتی تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے صبی؟'' ثانیہ بھابھی اپنے ڈیڑھ سالہ منیب کو اٹھائے چلی آئی تھیں جو صبیرہ کو دیکھتے ہی اس کی طرف ہمکنے لگا تھا۔

''ایک دم فٹ ہوں۔'' اس نے منیب کو لیتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ سب واپسی کے بہانے ہیں۔ اور کچھ نہیں۔'' امی نے اصل صورت حال واضح کی تھی۔

''چہ..... لگتا ہی نہیں کہ آپ ایک ہائی اسٹینڈرڈ کی اسکول کی پرنسپل ہیں۔ اپنے اسٹوڈنٹس کو تو دو سے تین دن غیر حاضر نہیں ہونے دیتیں اور مجھے جیسے چلے کاٹنے کے لئے بٹھا رکھا ہے۔'' وہ خفا ہوئی تھی۔ ثانیہ بھابی کو اس کے انداز پر ہنسی آگئی۔

''یہ اچھی رہی۔ لوگ تو ترستے ہیں چھٹیاں کرنے کو۔''

''وہ نالائق لوگ ہوتے ہوں گے۔ مابدولت جیسے ذہین و فطین نہیں۔'' منیب کو ہوا میں اچھالتے ہوئے وہ شرارت سے کہہ رہی تھی۔

''اُف یہ غلط فہمیاں.....'' انہوں نے گہری سانس بھری تھی۔

''میں تو کہہ رہی ہوں کہ دو دن مزید صبر کر لو۔ بخار کی کمزوری تو اچھی طرح سے دور ہو لینے دو۔ زندگی چاہئے۔ انسان کام تو ساری عمر ہی کرتا رہتا ہے۔'' اس کا بیگ تیار کرتے ہوئے امی کہہ رہی تھیں۔

''اب اس کو بڑا ہو جانے دیں آنٹی جی! اتنی فکر نہ کیا کریں اس کی۔ ہماری صبی بہت بہادر ہے۔ اتنا سا بخار بھلا اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟'' ثانیہ بھابی انہیں بہلا رہی تھیں۔

''کچھ بھی کہو ثانیہ! میرے دل کو قرار نہیں آتا۔ ہر وقت بس اسی دھیان میں اٹکا رہتا ہے۔'' وہ بے بسی سے کہہ رہی تھیں۔ صبیرہ کو رونا آنے لگا۔

''اسی لئے تو ہر وقت آپ کا بی پی گڑبڑ رہتا ہے۔ اس طرح کریں گی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر بیٹھ جاؤں گی۔ ایک تو اتنی دور ہوسٹل میں بھیج دیا اوپر سے یہ جذباتی رکاوٹ۔''

''یا خدا! اب بندہ یہاں کس کو سمجھائے؟'' ثانیہ بھابی ماتھے پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔

اس کی اگلے دن واپسی کی تیاری پکی تھی۔ رات وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی جب ثمین کا فون آگیا۔

''اس قدر گھنی ہو نا تم صبی! مجال ہے جو اصل صورت حال کی خبر ہمیں دی ہو۔'' اس کا حال احوال پوچھنے کے بعد ثمین اپنے مخصوص منہ پھٹ انداز میں شکوہ کرنے لگی تو وہ استعجابیہ انداز میں پوچھنے لگی۔

''کیا مطلب..... کیسی صورت حال؟''

''یہی کہ اس روز ایڈی نے تمہیں غنڈوں سے بچایا تھا۔''

صبیرہ کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔

''ویسے کمال ہو گیا نا صبی! ولن ایک دم سے ہیرو بن گیا۔ کیا اسٹریٹ فائٹنگ کی ہوگی اس نے۔ ویسے بھی بلیک بیلٹ ہولڈر ہے۔''

''تمہیں یہ سب کس نے بتایا ہے؟'' اس نے مدھم سے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے ہی کیا ساری یونیورسٹی کو ایڈی ہی نے بتایا ہے۔ اس کے کارنامے کی دھوم مچی ہوئی ہے ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں۔''

''وہ اس قدر گھٹیا شخص ہو سکتا ہے، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ایک لڑکی کی مشکل وقت میں مدد کر دینا تو انسانیت کہلاتا ہے مگر اسے یوں پوسٹر بنا کر شو آف کرنا تو ذلالت ہے۔'' وہ پھٹ پڑی تھی۔ دوسری جانب غالباً ثمین بھی گڑبڑا گئی تھی۔

''آئی ایم سوری صبی! مجھے تو صرف وہی کچھ معلوم ہے جو ایڈی نے سب کو بتایا ہے۔ میں نے تو یونہی تم سے ذکر کر دیا۔''

''اِٹس او کے۔'' وہ خود کو بمشکل نارمل رکھ پائی تھی۔ ''اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔ لیکن ایڈی کی اس حرکت کو میں کبھی معاف نہیں کروں گی۔''

''اچھا تو پھر کل آ رہی ہو نا؟'' ثمین نے پوچھا تو وہ بددلی سے اثبات میں جواب دے کر چند ایک باتوں کے بعد ریسیور رکھ کر وہیں صوفے میں دھنس گئی۔

''کس قدر گھٹیا حرکت کی ہے ایڈی نے۔ اور میں..... میں اس کا شکریہ ادا کرنے کا سوچ رہی تھی۔'' وہ جتنا ایڈی کی اس حرکت کے متعلق سوچ رہی تھی اتنی ہی اس کے اندر کی تپش بڑھتی جا رہی تھی۔

امی نے اسے سینکڑوں نصیحتوں کے ہمراہ واپس بھیجا تھا۔

ہوسٹل میں ثمین سے ملاقات ہوئی مگر اس نے دوبارہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی لیکن یونیورسٹی میں جس کسی نے بھی اس کا حال پوچھا ساتھ میں اس واقعے کی تفصیل بھی ضرور چاہی۔

وہ ذلت و اہانت کا شکار ہو رہی تھی۔ ایڈی اور وہ دونوں ہی اپنے ڈیپارٹمنٹ میں بہت پاپولر تھے۔ صبیرہ اپنی ذہانت اور لئے دیئے رہنے والے مغرورانہ انداز کی وجہ سے اور ایڈی نہ صرف اپنی ذہانت بلکہ اپنی خوش مزاجی، خوش لباسی اور پرسنالٹی کے لحاظ سے۔

اور اس صورت حال میں ان دونوں کا اسکینڈلائز ہونا کوئی چھوٹی موٹی بات نہیں تھی۔

اور سائیکالوجی کی صباحت علوی کا وہ جملہ۔

''بھئی مان گئے تمہیں صبیرہ علی! گولڈ میڈل تو کیا، تم تو پورے کا پورا گولڈ میڈلسٹ اُڑا لے گئیں۔''

اس کی پوری ہستی جیسے منہ کے بل زمین پر آگری تھی۔ اور وہ جو منٹوں میں مقابل کی طبیعت صاف کر دینے میں مشہور تھی، گنگ کھڑی رہ گئی۔

شفق اور زارا اسے کھینچ کر لائبریری کی بغلی قدرے تاریک سیڑھیوں پر لے آئی تھیں۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں صبی؟'' اسے دیوار سے ٹیک لگائے بے دم بیٹھا دیکھ کر شفق کا دل ہولنے لگا تھا۔

''سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ایڈی نے یہ سب بکواس کی کیوں؟'' زارا بھی اپ سیٹ تھی۔

''مگر وہ تو یونیورسٹی آ ہی نہیں رہا۔ بلکہ تقریباً اسی روز کے بعد سے جب صبیرہ لیو پر تھی۔'' شفق نے اسے یاد دلایا۔

''جس روز وہ یونیورسٹی آیا تھا اسی روز سے یہ عجیب و غریب کہانی پورے ڈیپارٹمنٹ میں پھیلی ہوئی ہے۔'' زارا نے کہا تھا۔

''اس نے میری مدد ضرور کی تھی مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ وہ اس سارے واقعے کو اس فضول اور گھٹیا طریقے سے بیان کرتا۔'' صبیرہ ان دیکھی آگ میں جلنے لگی تھی۔ اس نے پورا واقعہ سنا دیا۔

''دفع کرو صبی! تم یوں ظاہر کرو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کہنے والوں کے منہ اپنے آپ ہی بند ہو جائیں گے۔'' شفق نے پوری بات سننے کے بعد اسے سمجھایا تو اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔

''آج تک میری طرف کسی کو آنکھ اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی شفق! اور اس ذلیل شخص کی وجہ سے سب مجھ پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔''

''لوگوں کو تو یونہی موقع چاہئے ہوتا ہے بات بڑھانے کا۔ اور پھر میں ایڈی کو اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ وہ ایسی فضول حرکت نہیں کر سکتا۔'' زارا نے کہا تو وہ تلخی سے بولی۔

''اس کے علاوہ تو میں ہی گواہ ہوں اس سارے واقعے کی۔ اگر اس نے نہیں تو میں نے یہ سب پھیلایا ہوگا۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا صبیرہ!'' زارا گڑبڑا گئی تھی۔ ''لیکن جس حد تک میں اس کی فطرت کو جانتی ہوں اس کے سبب میں کہہ رہی ہوں۔ اب آگے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔''

''مگر میں اسے اتنی آسانی سے نہیں بخشوں گی۔ اس نے میری انا پر، میری عزتِ نفس پر وار کیا ہے جس کی میں کبھی اسے اجازت نہیں دے سکتی۔'' وہ پھنکاری تھی۔ شفق

اس کا ہاتھ تھپکنے لگی۔

"صبیرہ! غصہ نہ کرو، جتنا اس بات کو بڑھاؤ گی اتنا ہی تمہارا نقصان ہوگا۔ تم بھولوگی تو لوگوں کو بھولنے میں دیر نہیں لگے گی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں اسے یونہی بھونکتا چھوڑ دوں۔ وہ میرے متعلق جو جی میں آئے بکتا پھرے؟" اس کی سرمئی آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ شفق نے ایک مرتبہ پھر تحمل کے ساتھ اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اسے جو کرنا تھا کر دیا۔ اب اگر تم بھی کوئی توجہ نہیں دوگی تو باقی سب کے لئے بھی اس سارے کھیل میں کوئی لطف نہیں رہ جائے گا۔ بھول جاؤ اور اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ ایگزیمز سر پر ہیں اور تمہیں اس بار گولڈ میڈل لینا ہے۔"

اس کے ذہن میں صباحت علوی کا استہزائیہ جملہ گونجا تو وہ نئے سرے سے ایک آگ میں جلنے لگی۔

"میں اتنی آسانی سے ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہوں۔ ایڈی نے جو کیا ہے اس کا بھگتان بھی اسی کو بھرنا ہوگا۔" وہ مشتعل سی پیر پٹختی چلی گئی تھی۔ وہ دونوں بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

جب تک ایڈی سے اس کا سامنا نہیں ہوا تھا، وہ جانے کس خیال میں سرد رہی تھی۔ مگر سر کرامت کی کلاس سے نکلتے ہی کوریڈور کے آخری سرے پر کھڑکی کے فریم میں بیٹھے اپنے دوستوں کے ساتھ بے فکری سے گپیں لڑاتے ایڈی کو دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا تھا۔

اسے تیزی سے ان لوگوں کی طرف بڑھتے دیکھ کر ثمین، زارا اور شفق پریشان سی اس کے پیچھے لپکی تھیں۔

اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ سب ایک دم ہی چپ ہو گئے تھے مگر ان کی دبی دبی مسکراہٹ اور معنی خیز اشارے صبیرہ سے چھپے نہیں رہ سکے تھے۔ اس کے چہرے سے شعلوں کی لپٹیں نکلنے لگیں۔

"تم ایک نہایت ہی گھٹیا انسان ہو۔" اس نے کھڑکی میں براجمان ایڈی کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا تھا۔ "جسے اس بات کی بھی تمیز نہیں ہے کہ کسی لڑکی کی مدد بھی ڈھنگ سے کر سکے۔ مگر اتنا یاد رکھو، میں ان بے ہودہ لڑکیوں میں سے نہیں ہوں تم جن سے افیئر زچلاتے ہو اور جن کو اسکینڈلائز کرتے ہو۔ میرے متعلق ایسا کچھ سوچو گے تو منہ کی کھاؤ گے۔ اور اس روز جو تم نے انسانیت کے نام پر میری مدد کی تھی، اس کا کریڈٹ تو تم اچھا خاصا لے ہی چکے ہو۔ اس لئے اب مجھے اپنی احسان مند مت سمجھنا مسٹر ایڈی!"

وہ شعلہ بار لہجے میں کہتی اردگرد موجود اس کے دوستوں اور دوسرے اسٹوڈنٹس کی بھی پرواہ نہیں کر رہی تھی جن کے ذہن پتہ نہیں کیا سوچنے لگے تھے۔ مگر وہ ہنوز سینے پر بازو لپیٹے خاموش بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ شفق نے بمشکل اسے وہاں سے گھسیٹا تھا۔

"یہ کیا بے وقوفانہ حرکت ہے صبیرہ! کیوں خوامخواہ خود کو تماشہ بنوا رہی ہو سب کے سامنے؟"

"اور وہ، اس نے جو کچھ کیا ہے وہ تماشہ نہیں ہے کیا؟" وہ چلا اٹھی تھی۔

"چلو مان لیا کہ اس نے اس روز والا واقعہ سب کو بتا دیا تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ تم کیا دنیا کی واحد لڑکی ہو جسے کسی نے تنگ کرنا چاہا؟ یا پھر ایڈی دنیا کا واحد لڑکا ہے جس نے تمہاری مدد کی؟ اس کی جگہ کوئی بھی انسانیت کا داعی ہوتا وہ تمہاری مدد ضرور کرتا۔" شفق نے رسانیت سے کہا تھا۔

"مگر اس نے یہ گھٹیا حرکت کر کے خود کو انسانوں کی کیٹگری سے نکال دیا ہے۔" اس کے کانوں کی لویں تک تپ رہی تھیں۔

"خیر تم نے یہ سب اچھا نہیں کیا۔ اتنے سارے لوگوں میں اس کی انسلٹ کر دی۔ سوچو اگر وہ مقابلے پر اتر آتا تو کیا ہوتا؟" زارا نے تاسف سے کہا تھا۔

"ہنہ، بولنے کو تھا ہی کیا اس کے پاس۔" وہ تلخی سے بولی تھی۔

"یہ بات یوں چلتے پھرتے نہیں بلکہ آرام سے بیٹھ کر کلیئر کی جانے والی تھی۔ جسے تم اپنی بے وقوفی کی وجہ سے ایک نیا رنگ دے آئی ہو۔ پہلے تو سب کچھ بھی نہیں کہہ رہے تھے مگر اب ضرور ذہن دوڑانے لگیں گے۔" زارا نے جل کر کہا تو وہ ٹھنڈی پڑ گئی۔

جذباتیت کا بھوت اترا تو اسے اپنی حرکت کی سنگینی کا احساس ہونے لگا تھا۔

"یہ کیا دھوم مچا دی ہے تم نے اور ایڈی نے یونیورسٹی میں۔ ذرا سی بات کو پہلے اس نے اتنا پھیلایا اور اب تم اسے لے کر اس قدر رنجی ہو رہی ہو۔" ثمین ناگواری سے کہہ رہی تھی۔ پھر بولی۔ "بس اب اس سارے قصے کو بھول جاؤ۔ ایڈی سے کون سی ہمارے گروپ کی بہت اچھی فرینڈ شپ تھی۔"

"تم تو یہ مت کہو۔ تمہاری تو اس سے بچپن کی دوستی ہے۔ آئی مین اسکول سے لے کر اب یونیورسٹی تک تم، ثوبان اور ایڈی کی فرینڈ رہی ہو۔" زارا نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو وہ وضاحتاً بولی۔

"میں اپنی نہیں بلکہ پورے گروپ کی بات کر رہی ہوں۔"

"اچھا اب بس کرو اور کچھ اسٹڈیز کی طرف بھی توجہ دو۔ فائنل ایگزیمز سر پر ہیں۔ زارا! تم صبی کو سر عباس کے نوٹس دے دو۔" شفق اپنی فائل کھنگال کر پچھلے تمام لیکچرز کے نوٹ کئے ہوئے اہم پوائنٹس والے پیپرز نکالنے لگی۔ صبیرہ نے بمشکل خود کو کچھ پڑھنے اور سمجھنے پر آمادہ کیا تھا۔

❁......❁

"وقار! اب اٹھ بھی جاؤ۔ کتنی دیر سوؤ گے؟ ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔"

بے جی تقریباً چھٹی مرتبہ اسے جگانے آئی تھیں۔ بالوں میں ان کی نرم انگلیوں کے لمس کو محسوس کر کے اس نے آنکھیں کھول کر ایک نظر انہیں دیکھا پھر تھوڑا کھسک کر ترچھا ہوتے ان کی گود میں سر رکھ لیا۔

"کیا ہے بے جی! اتنے دنوں کے بعد حویلی آیا ہوں۔ نیند تو پوری کر لینے دیں۔"

بے جی نے جھک کر محبت سے اس کی کشادہ پیشانی چوم لی۔

"میں صدقے میری جان! پر ہمارا بھی تو جی چاہ رہا ہے تجھ سے باتیں کرنے کو۔ سب باہر انتظار میں بیٹھے ہیں کہ کب وقار جاگے گا۔"

"تو سب کو میری آمد کی خبر ہو گئی ہے؟"

"تو اور کیا۔ بس اب تم جلدی سے اٹھ جاؤ۔ صدیقہ تمہارے لئے ناشتہ بنانے لگی تھی۔ میں نے ہی روک دیا کہ تازہ تازہ ورقی پراٹھے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔"

بے جی کے منہ سے ورقی پراٹھوں کا نام سن کر اس کی بھوک یکلخت ہی جاگ اٹھی تھی۔ ڈیڑھ ماہ تک شہر میں ہوٹلنگ کرتے ہوئے زبان کا ذائقہ ہی بدل چکا تھا مگر حویلی کے پُرتکلف کھانوں کی تو کیا ہی بات تھی۔

"آپ جا کر بڑی بھابی سے ناشتہ بنوائیں، میں دس منٹ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔"

وہ چھلانگ لگا کر پلنگ پر سے اترا تھا۔ بے جی ہنسنے لگیں۔

"صدیقہ بھی کہہ رہی تھی کہ اس کے سامنے تازہ ورقی پراٹھوں کا نام لو تو بجلی کی طرح اٹھے گا۔"

"میری پیاری بھابی میری پسند و ناپسند بہت اچھی طرح جانتی ہے۔" وہ تفاخر سے کہتا الماری میں سے اپنے کپڑے نکال رہا تھا۔

"اچھا اب جلدی سے آ جانا۔ یہ نہ ہو کہ ناشتہ ٹھنڈا ہوتا رہے۔" بے جی جاتے جاتے ایک بار پھر تلقین کرتی گئی تھیں۔ وہ ان کی محبتوں پر مسکراتا کپڑے لئے باتھ روم میں گھس گیا۔

وہ تیار ہو کر ڈائننگ روم میں پہنچا تو اس کے تمام کزنز وہیں موجود تھے۔

سب سے پہلے وہ اعزاز علی کی کھلی بانہوں میں سمایا تھا جو کہ اس کا بھائی ہی نہیں بلکہ ایک بہترین دوست بھی تھا۔

"مجھے تو یہ دونوں بھائی کم اور ایک دوسرے کے محبوب زیادہ لگتے ہیں۔" نوشابہ نے ہمیشہ کی طرح ناک چڑھا کر جملہ پھینکا تھا۔

"بے وقوف لڑکی! دو محبت کرنے والے ایک دوسرے کے محبوب ہی ہوا کرتے ہیں۔" وقار علی اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے باقی کزنز سے ملنے لگا۔

رات گئے جب وہ حویلی پہنچا تو سب خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ اس لئے وہ کسی کو بھی ڈسٹرب کئے بغیر صرف بے جی سے مل کر سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

"اور بھئی تم لوگ کیسی ہو؟" وہ سب سے مل کر لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"ہم لوگ تو بالکل ٹھیک ہیں۔ تم بتاؤ کن چکروں میں حویلی کا چکر لگانا بھولے ہوئے ہو؟" فوزیہ نے اپنے تیکھے لب و لہجے میں پوچھا تو بے اختیارانہ مسکراہٹ وقار علی کے لبوں کی تراش میں پھوٹ پڑی۔

اک دلکش و دلنواز سا سراپا ذہن کی اسکرین پر جگمگا اٹھا تھا۔ تابندہ ضیاء۔

اپنے نام ہی کی طرح دلکش اور پُرنور۔

جو دنوں میں اسے یوں تسخیر کر گئی کہ وہ حویلی تو کیا اپنا آپ بھی بھولے رہا تھا۔

"یہ لو، یہ پھر سے وہیں پہنچ گیا ہے۔" طالب نے اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تو وہ جھینپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں ذرا بھابی سے مل آؤں۔"

وہ کچن کی طرف آ گیا تھا۔ جہاں دو کام والیوں کی موجودگی کے باوجود صدیقہ بھابی اس کے لئے اپنے ہاتھوں سے ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔ اس کے زوردار سلام کرنے پر وہ ہنستی ہوئی پلٹیں اور اس کے گھنے بالوں میں آنے والا ہاتھ ہی پھیر دیا۔

''اُف بھابی! ساری پرسنالٹی ڈاؤن کردی آپ نے۔'' وہ تڑپ اٹھا تھا۔

''اتنی ذرا سی بات پر مرد لوگوں کی پرسنالٹی ڈاؤن نہیں ہوا کرتی۔'' وہ ہنس کر کہہ رہی تھیں۔

''بہت ڈھیل دے رکھی ہے بھایا نے آپ کو۔'' وہ ہاتھوں سے بال جھاڑتے ہوئے تاسف سے کہہ رہا تھا۔

''ڈھیل تو میں نے دے رکھی ہے تمہارے بھایا کو۔ ورنہ ابھی تمہیں وہ بھی کچن میں دکھائی دیتے کام کرتے ہوئے۔''

ان کی بات پر وہ ہنس دیا تھا۔

''اس بار بہت دیر لگا دی شہر میں۔ خیریت تو تھی نا؟ فون پر بھی بات نہیں ہو پائی۔''

''بس یونہی، نئی نئی جاب ہے نا۔ کام کا لوڈ کافی تھا۔ اور پھر دو تین مرتبہ بھایا سے بات ہوئی تھی میری۔ اور اعزاز تو تقریباً ہر دوسرے روز فون کرتا ہے۔''

''کوئی نہیں۔ تمہارے بھایا بھی کہہ رہے تھے کہ بس یونہی چلتے پھرتے ہی تم سے بات ہوئی ہے۔''

''تو وہ چل پھر رہے ہوں گے نا۔ میں تو کرسی پر بیٹھا آرام سے بات چیت کر رہا تھا۔'' وہ چمچے میں بھنا ہوا قیمہ بھرتے ہوئے شرارت سے بولا تھا۔

''بات کرتی ہوں میں اس بار بے جی سے۔ بہت آزاد رہ لئے تم۔ اب تو مرضی کی جاب بھی مل گئی ہے۔ زمینداری تو تم ٹھکرا ہی چکے ہو۔ اب کی بار تو تمہاری شادی کی بات طے کروا کے ہی رہوں گی۔'' وہ پراٹھے کو ہلکی آنچ پر کرتے ہوئے اپنا منصوبہ بتا رہی تھیں۔

''میں بھی اس بار یہی ارادہ لے کر آیا ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں جگمگاہٹ سی اتر آئی تھی۔

''سچ؟'' وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگیں۔

''کیوں، مجھے کیا پادری بننا ہے؟''

''بدتمیز، تمہاری وجہ سے اعزاز بھی لیٹ ہو رہا ہے۔ اب تم مان گئے ہو شادی کو تو وہ بھی مان جائے گا۔''

''اچھا اب دوسری باتوں کی طرح یہ بات بھی فوراً دوسروں کے کانوں میں مت پہنچا دیجئے گا۔ میں خود موقع دیکھ کر بے جی سے بات کروں گا۔''

''تم کیوں، میں خود بات کروں گی۔'' انہوں نے کہا تھا۔ ان کے چہرے پر استعجاب دیکھ کر وہ جلدی سے بولا۔

''اچھا بہت زبردست بھوک لگی ہے۔ جلدی سے ناشتہ لے کر آئیں۔''

وہ ڈائننگ روم میں واپس چلا آیا تھا۔

گجرات کے نواحی علاقے کڑیانوالہ میں موجود یہ قدیم و جدید تعمیر کا امتزاج لئے پُرشکوہ حویلی ان کے آباؤ اجداد کی نشانی تھی جو کہ والدین کی وفات کے بعد دونوں بھائیوں قدیر الحق اور عبدالحق کے حصے میں آئی تھی۔ قسمت کی بات یہ تھی کہ دونوں بھائیوں کی شادی بھی ایک ہی گھر میں دو سگی بہنوں سے ہوئی۔ تو محبتوں کے یہ بندھن اور بھی مضبوط ہوتے چلے گئے تھے۔

''ہاں بھئی، اب بتاؤ کیا بات ہوئی ہے؟'' رات کے کھانے کے بعد حسب عادت وہ دونوں سب کی نظر بچا کر چہل قدمی کے لئے باہر نکلے تو اعزاز کو موقع مل گیا تھا۔

''کیا؟ کچھ بھی تو نہیں۔'' وہ مکر گیا تھا۔

''بکو مت۔ پچھلے ایک مہینے سے میں تمہارے بدلے ہوئے انداز دیکھ رہا ہوں۔ اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ سمجھ نہ سکوں۔''

اعزاز نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ خجل سا سر کھجانے لگا۔

''اور میں خوامخواہ اتنے عرصے سے تمہیں اتنا ہی بے وقوف سمجھتا رہا۔'' جواباً اعزاز نے ہنستے ہوئے اس کے شانے پر مُکا رسید کیا تھا۔ ''اب سیدھی طرح بتا دو کہ کس چکر میں ہو؟''

وہ تو اس کے اندر کا بھید پا لیتا تھا۔ اب بھی اس کی آنکھوں کی چمک اور بے ساختہ مسکراہٹ اسے کھٹک گئی تھی۔

''یار! تم تو جان ہی کو آ گئے ہو۔ آدمی کا کچھ پرسنل بھی ہوتا ہے۔'' وقار علی نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا تو اعزاز نے اسے آنکھیں دکھائی تھیں۔

''ہم دونوں میں کچھ بھی پرسنل نہیں، سمجھے؟ اور پھر میں تم سے پورے ڈیڑھ سال بڑا ہوں۔ تمہارا فرض بنتا ہے کہ میرے ہر سوال کا ٹھیک سے جواب دو۔''

''اچھی زبردستی ہے۔'' اسے ہنسی آ گئی۔

''اب بتا رہے ہو یا پھر میں اپنی سی آئی ڈی کو متحرک کر کے پتہ لگواؤں؟ ہو سکتا ہے کہ اگلی بار تمہارے پرسنلز بابا جان کھولیں۔'' اعزاز نے بڑے بارعب انداز میں اسے دھمکایا تھا۔

''شرم کرو۔ بڑے بھائی ہو کر چھوٹے بھائی کو بلیک میل کر رہے ہو۔'' وقار علی نے اسے تاسف سے دیکھا تو وہ آرام سے بولا۔

''کبھی کبھار گھی نکالنے کے لئے انگلی ٹیڑھی کرنے میں مضائقہ بھی کیا ہے۔''

''اس بار میں بے جی سے تمہاری شادی کی بات کرنے والا ہوں۔ تمہارا دماغ کچھ زیادہ ہی چلنے لگا ہے۔'' وقار علی نے اس کی بات کو مذاق میں اُڑانا چاہا تو وہ چلتے چلتے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''اور تم ..... تمہارا اپنے متعلق کیا ارادہ ہے؟''

اس کا سوال بے حد اچانک تھا۔ وہ گڑبڑا گیا۔

''میرا کیا ......؟''

اعزاز نے بغور اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے سرخ و سپید چہرے کی تمتماہٹ کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ہونٹوں کی تراش میں دبی دبی نرم سی مسکراہٹ انوکھے راز افشا کر رہی تھی۔

''تم کسی کو چاہنے لگے ہو وقار؟''

وہ بے حد بے ساختگی سے بولا تو انداز سوالیہ نہیں بلکہ یقینی تھا۔ جواباً وقار کو سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ سنجیدہ رہنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی اس کی کھلتی ہوئی مسکراہٹ نے سارا پول کھول دیا تھا۔

''کون ہے وہ؟''

''تابندہ ضیاء۔'' اس کے لب و لہجے میں شیرینی سی گھل گئی تھی۔ سیاہ آنکھوں میں اترتا نشہ اعزاز نے بہت شدت سے محسوس کیا تھا۔

''تمہارے ساتھ جاب کرتی ہے؟''

''اونہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ پھر بولا۔ ''آج کے لئے بس اتنا ہی کافی ہے۔ باقی سب بے جی کے سامنے بتاؤں گا۔''

''پھر بھی یار! ہے کیسی وہ؟'' اعزاز متجسس تھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے ..... جسے وقار علی نے چاہا ہو گا وہ کیسی ہو گی؟''

اس نے بے حد اعتماد سے پوچھا تو لحظہ بھر اسے دیکھتے رہنے کے بعد اعزاز نے گہری سانس کے ساتھ شانے جھٹکے تھے۔ پھر قدرے تشویش بھرے انداز میں پوچھنے لگا۔

''اور فوزیہ کا تم نے کیا سوچا ہے؟''

''اس کا سوچنا اس کے والدین کا کام ہے میرا نہیں۔ اور پلیز یار! اس وقت یہ ذکر کر کے میرا موڈ خراب مت کرنا۔''

''تم جب بھی اپنی فرسٹ لیڈی کی بات کرو گے فوزیہ کا ذکر ضرور ہو گا۔ اس لئے پہلے ہی یہ سوچ لینا بہتر ہو گا۔''

اعزاز اس کی نسبت کافی متحمل مزاج تھا۔ اگر اس کے مزاج میں ذرا سی بھی جذباتیت تھی تو صرف اور صرف وقار علی کی محبت کے معاملے میں۔ بچپن سے لے کر اب تک ان دونوں کے درمیان بھائیوں کے رشتے سے بڑھ کر دوستی کا اٹوٹ بندھن رہا تھا۔

''تو تم کس لئے ہو، جب بھی کوئی پرابلم ہوئی میں تمہارے سامنے کر دوں گا۔'' وہ مزے سے بولا۔ پھر شرارت سے اضافہ کیا۔ ''اور ویسے بھی شادی کی باری اب تمہاری ہے۔ یہ تو پتہ نہیں بی جان کا دل مجھ پر کیسے آ گیا جو فوزیہ کے لئے شوشہ چھوڑ دیا۔ میں بات کروں گا بے جی سے۔''

''شٹ اپ۔'' وہ لاپروائی سے ہنس دیا تھا۔

''ابھی کسی سے کچھ مت کہنا۔ پہلے میں بھابی سے بات کروں گا۔''

واپسی پر اس نے اعزاز کو تاکید کی تو اس نے سمجھداری سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور وہ پہلے بھایا کو بتائیں گی۔ تب بھایا تمہاری کھال اتاریں گے۔''

جواباً وہ اسے گھور کر رہ گیا تھا۔

اور اس نے یہی کیا تھا۔

صدیقہ بے چاری خود سہم گئی تھیں۔ مگر وقار علی کی جذباتیت انہیں مجبور کرنے لگی۔

''بھابی! آپ مجھے اچھی طرح جانتی ہیں۔ اگر کسی نے میری مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ کرنے کی کوشش کی تو میں انتہائی قدم بھی اٹھا سکتا ہوں۔''

اپنے تئیں انہوں نے رات سب کے سو جانے کے بعد بے جی کا بہت اچھا موڈ دیکھ کر بات شروع کر ڈالی مگر تابندہ ضیاء کا نام ان کے لبوں سے نکلتے ہی سدا کی حلیم الطبع بے جی ایسے جلال میں آئیں کہ بھابی کا خون خشک ہونے لگا۔

''کہاں ہے وقار علی، بلاؤ اسے۔'' غصے سے بے قابو ہو کر انہوں نے اونچی آواز میں کہا تو ان کی پکار صرف وقار علی ہی کو نہیں بلکہ حویلی کے دوسرے مکینوں کو بھی چونکا گئی تھی۔

وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے ان کی ڈانٹ پھٹکار کی زد میں تھا۔ ان کے سامنے موڑھے پر سر جھکائے بیٹھا وہ جواب میں ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا مگر چہرے پر چھائی ضبط کی سرخی اس کی قوتِ برداشت کی گواہی دے رہی تھی۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی کسی دوسری لڑکی کا نام لینے کی۔ غضب خدا کا۔ نہ صرف خالہ بلکہ تمہارے چچا کی بھی بیٹی ہے۔ دو دو رشتے اور تیس اپچھلے دو سالوں سے بات چیت میں ہے۔ برباد کرنا چاہتے ہو تم اس گھرانے کو۔ پتہ بھی ہے ایسی باتوں سے دلوں میں کتنی دوریاں آجاتی ہیں۔ میرا اتنا فرمانبردار بیٹا۔ میں تو پہلے ہی تمہاری شہری نوکری کے حق میں نہیں تھی۔ پھانس لیا نا کسی چنڈال نے تمہیں اپنے جال میں۔''

اور وقار علی کی برداشت کی شاید یہی آخری حد تھی۔

''پلیز بے جی! آپ تابندہ کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہیں گی۔''

مسلسل بولتی، اپنا غصہ نکالتی بے جی اس کا سرخ چہرہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں۔

''جیسا آپ سوچ رہی ہیں ویسا کچھ بھی نہیں۔ میں اسے پسند کرتا ہوں اور میں نے ہی اس سے بات کی تھی۔ اس کی طرف سے ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی ایسا سوچنے کی بھی۔ یہ بھی نہیں خیال کیا کہ میں تمہاری خالہ کو کیا جواب دوں گی۔'' بے جی کو سخت غصہ آرہا تھا۔

''یہاں کون سا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ صرف بات ہی تو چل رہی تھی۔ اور ویسے بھی میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ شادی میں اپنی مرضی سے کروں گا۔ اب آپ نے میری بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تو اس میں میرا کیا قصور؟''

اس کے اطمینان پر بے جی کو اور طیش آیا تھا۔

''ہاں سارا قصور میرا ہی ہے۔ جس لاڈ پیار میں آج یہ دن دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ اسی وقت دو تھپڑ لگائے ہوتے تو آج تم باغی نہ ہوتے۔''

''بے جی پلیز!'' وہ زچ آگیا تھا۔ ''آپ خوامخواہ بات کا بتنگڑ بنا رہی ہیں۔ اب اگر فوزیہ مجھے اپنی بیوی کے لحاظ سے پسند نہیں ہے تو کیا میں زبردستی اس سے شادی کر لوں؟ شادی زبردستی کا سودا نہیں ہوتی بے جی!''

''تم جو مرضی چاہے کہو۔ تمہاری شادی ہوگی تو فوزیہ کے ساتھ۔ اس گھر میں باہر سے کوئی لڑکی نہیں آئے گی۔'' بے جی کا انداز اٹل اور تختی سے بھرپور تھا۔

''کیوں، کیا مجھے اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا کوئی حق نہیں ہے؟ میں اپنی پسند کا فیصلہ کیوں نہیں کر سکتا؟'' اسے بھی غصہ آگیا تھا۔

''کر سکتے ہو مگر میری زندگی میں نہیں۔'' اب کی بار وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں تو ان کا مطلب سمجھتے ہوئے وہ پہلے تو بے یقینی سے انہیں دیکھتا رہا پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''تو پھر آپ بھی اپنی مرضی پوری کرنے کے لئے میرے مرنے کا انتظار کر لیں۔''

بے حد درشت لہجے میں کہتا وہ پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔ بے جی دہل کے دل پر ہاتھ رکھ کر رہ گئیں۔

''کسی لڑکی کو اسکینڈلائز کرنے کا اس سے گھٹیا طریقہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اور ایڈی نے یہ کام بہت بہترین طریقے سے کیا ہے۔ پہلے تو ہیرو بن کر صبیرہ کی مدد کی اور اگلے ہی روز پوری یونیورسٹی میں یہ خبر پوسٹرز کی طرح پھیلا دی۔''

زارا کا چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔ ثوبان کو بھی غصہ آنے لگا۔

''زارا! تم بلاوجہ ایڈی کو اس معاملے میں گھسیٹ رہی ہو۔ وہ بھلا ایسی گھٹیا حرکت کیوں کرنے لگا؟''

''یہ تو وہی بتا سکتا ہے۔'' اس نے تنفر سے ہونٹ سکیڑے تھے۔

''تمہارا پورا گروپ بے وقوفوں سے بھرا ہوا ہے۔'' وہ چڑ گیا تھا۔ ''اس روز محترمہ بھری لابی میں سب کے سامنے ایڈی کو لتاڑ گئیں اور اب تم الزام تراشیاں کر رہی ہو۔''

''گناہ گار کو بھی گناہ گار کہتے ہیں۔'' وہ مطمئن تھی۔

''فضول مت بولو۔'' وہ اسی چڑے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔ پھر اسے سمجھانے والے انداز میں کہنے لگا۔ ''بھلا ایڈی کو اس خبر کے پھیلانے کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ اس نے تو کبھی دوسری نظر تمہاری اس مس یونیورس کو دیکھا بھی نہیں ہوگا۔''

''اگر وہ بے قصور ہوتا تو اس روز صبی کے انسلٹ کرنے پر بھڑک اٹھتا۔ مگر وہ تو یوں ڈھیٹوں کی طرح بیٹھا سنتا رہا جیسے اسے بہت اعلیٰ خطابات سے نواز ا جارہا ہو۔''

''یہ اس کی شرافت ہے۔'' وہ بہت تحمل سے بولا تو زارا نے فی الفور کڑوے کریلے جیسا لقمہ دیا۔

''ڈھٹائی، اسے عرف عام میں ڈھٹائی کہتے ہیں۔''

''دیکھو زارا! ذرا عقلمندی سے سوچ کے دیکھو۔ اگر اس روز صبیرہ کی فضول الزام تراشی کے جواب میں ایڈی مقابلے میں اتر آتا تو کیا ہوتا؟ کیا کوئی لڑکی کسی لڑکے کے غیر مہذب رویے کا سامنا کر سکتی ہے؟ ایڈی نے صرف اس کی عزت کا خیال کیا ہے۔ اس کے احترام میں سب کڑوی کسیلی سنی ہیں۔ ورنہ تم جانتی ہو اسے۔ غلط بات کرنے والوں کے سامنے اس کی زبان بعد میں اور ہاتھ پہلے چلتا ہے۔ صبیرہ کو شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس کے سامنے ایڈی تھا۔ اگر کوئی اور لڑکا ہوتا تو اب تک پوری یونیورسٹی میں صبیرہ علی کو مشہور کر چکا ہوتا کسی اور ہی انداز میں۔'' ثوبان صاف گوئی سے کہہ رہا تھا۔

''تم اور تمہارے دوست سب ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہو۔ اور تم ...... تم تو کبھی ایڈی کی غلطی مانو گے ہی نہیں۔'' زارا نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''کیونکہ وہ غلط انسان نہیں ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔ زارا اپنا بیگ شانے پر ڈالتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''اب تو مجھے لگ رہا ہے کہ صرف تمہی غلط ہو۔''

''مگر تم میرے لئے بہت صحیح ہو۔'' وہ شرارت سے مسکرایا تھا۔

''اسی لئے ہر دوسری لڑکی کو دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھر رہے ہوتے ہو۔'' اس کے دل کی جلن ہونٹوں پر آہی گئی تھی۔

''میرا یہ دل صرف تیری محبت کے لئے ہے
مگر یہ پیشکش محدود مدت کے لئے ہے''

دوسرا مصرعہ خصوصی طور پر پاس سے گزرتی لڑکیوں کے گروپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو زارا نے فائل اٹھا کر اس کے شانے پر دے ماری۔ مگر ثوبان کو ڈھٹائی سے ہنستے دیکھ کر اسے بھی ہنسی آگئی تھی۔

''میں ...... میں یہ سب جا کر آغا جان کو بتاؤں گی۔''

ہمیشہ کی طرح زارا نے اسے دھمکایا تو وہ اسے چڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا ہے، بتا دینا۔ وہ تمہارے لئے کوئی اور فرمانبردار سا بندہ ڈھونڈ لیں گے اور میرے دل کا کمرہ پھر سے کرائے داری کی تلاش میں .....'' وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے ابھی پورا جملہ بھی نہیں بول پایا تھا کہ زارا کے خونخوار تاثرات نے اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

آخری فری پیریڈ میں وہ چاروں اکٹھی ہوتی تھیں۔

''میں نے پوچھا ہے ثوبان سے۔ مگر وہ ماننے کو تیار ہی نہیں ہے کہ یہ سب باتیں ایڈی نے پھیلائی ہیں۔'' زارا نے ایک ہی سانس میں کہہ دیا تو شفق اسے ملامتی نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔

پچھلے ایک ہفتے سے وہ ادھر اُدھر کی باتوں میں بہلا کر صبیرہ کو یہ قصہ بھلانے کی کوشش میں تھی اور زارا بی بی آج نیا کھاتہ کھول بیٹھی تھیں۔

''ثوبان بھی تو اسی کا دوست ہے۔ اس کی حمایت نہیں کرے گا تو کس کی کرے گا؟'' صبیرہ نے تلخی سے کہا تھا۔

''اب چھوڑو بھی، سارا قصہ تمام ہو چکا۔ پھر سے وہ سب فضولیات دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں صرف اپنی اسٹڈیز پر دھیان دینا چاہئے۔ بولنے والے خود ہی تھک کر چپ ہو جائیں گے۔''

شفق نے رسان سے بات سمیٹی تھی مگر ثمین نے تیز لہجے میں کہا۔

''لیکن ایڈی نے بھی کوئی اچھی حرکت تو نہیں کی نا۔ سب لوگ پتہ نہیں کیسی باتیں کرتے ہوں گے۔ پہلے ہی سبھی کو شک ہو رہا ہے کہ ضرور اس روز صبیرہ بی بی اغوا ہونے والی تھیں مگر ایڈی نے اس اغوا کو اپنی بہادری سے ناکام بنا دیا ہے۔ یعنی کہ چھوٹی سی بات کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے۔''

''خدا کے لئے ثمین! بس کرو۔ شفق ٹھیک کہہ رہی ہے۔ جتنا ہم اس بات کو اہمیت دیں گے اتنا ہی سبھی لطف اندوز ہوں گے۔ نظر انداز کرنا سب سے بہترین طریقہ ہے کسی بات کو ختم کرنے کا۔'' زارا نے اس کی بات پر صبیرہ کے چہرے پر چھائی سرخی بھانپ کر جلدی سے کہا تھا۔

''نفرت ہو گئی ہے مجھے اس شخص سے۔ آج تک کبھی کسی نے میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کی۔ اور اس کی وجہ سے میں یوں موضوعِ گفتگو بنی ہوئی ہوں۔ جی چاہتا ہے اسے شوٹ کر دوں۔'' صبیرہ نے زہرخند لہجے میں کہا تو شفق نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

''یا خدا! یہ لڑکی میری بات کیوں نہیں سمجھتی۔'' وہ کراہی تھی۔

''اچھا اب چھوڑو اس فضول ٹاپک کو۔ میوزیکل کنسرٹ میں کون کون چل رہا ہے؟'' زارا نے اچانک پوچھا تو ثمین کا نعرہ سب سے بلند تھا۔ جبکہ شفق اور صبیرہ نے کوئی

خاص جوش نہیں دکھایا تھا۔

''پتہ نہیں تمہیں پڑھائی کے دوران ایسی فضولیات کیسے سوجھ جاتی ہیں۔'' شفق سدا کی کتابی کیڑا تھی۔ زارا کے ایسے پروگرامز میں وہ یونہی نقص نکالا کرتی تھی۔

''اگر میں ایسی فضولیات میں نہ پڑوں تو تم بہت جلد ایک خشک مزاج پروفیسر لگنے لگو، یہ جو منہ پر ذرا سی رونق ہے نا، یہ میرے ہی بنائے ہوئے تفریحی پروگرامز کی بدولت ہے۔'' زارا نے جتلایا تھا۔

''میں تو نہیں جا رہی۔'' صبیرہ تو یوں بھی ان دنوں سخت بیزار ہو رہی تھی۔

''تمہارے تو اچھے بھی جائیں گے۔ تمام پاپولر سنگرز آرہے ہیں وہاں۔ کسی صورت مس کرنے والا کنسرٹ نہیں ہے۔'' زارا نے اٹل لہجے میں کہا تو اپنے پسندیدہ پاپ سنگرز سے متعلق سن کر ثمین کے دل کو پنکھے لگ گئے۔

''بھئی کچھ بھی ہو جائے، ہم ضرور جائیں گے۔''

''دس بجے کے بعد ہوسٹل میں داخل ہونا منع ہے۔ وارڈن کے غصے سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ وہ کسی طور اجازت نہیں دیں گی۔'' صبیرہ نے نزدیک ہی سے بات ختم کرنا چاہی تھی۔

''دس بجے تک تو کنسرٹ ختم بھی ہو جائے گا۔ چھ بجے پروگرام اسٹارٹ ہو جائے گا۔'' زارا نے جلدی سے بتایا تھا۔

''پھر بھی کیا ضرورت ہے یوں مارے مارے پھرنے کی۔'' وہ ابھی بھی راضی نہیں تھی۔

''بس اب کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ ہم آج شام کو پروگرام دیکھنے جا رہی ہیں۔ اینڈ دیٹس آل۔'' ثمین نے دونوں ہاتھ ایسے اٹھائے گویا فیصلے پر مہر ثبت کر دی ہو۔

''تمہیں پتہ بھی ہے کہ میرا بالکل بھی انٹرسٹ نہیں میوزک میں۔'' شفق بے چارگی سے بولی تھی۔

''تم اپنے نوٹس ساتھ لے جانا اور انہیں پڑھ کے لطف اٹھاتی رہنا۔'' زارا کو غصہ آیا تھا۔ ''یعنی کہ حد ہوگئی۔ اتنی مشکل سے یہ چار ٹکٹس ملی ہیں اور تم فضول بک بک کر کے موڈ خراب کر رہی ہو۔''

''او کے ہم سے کون بحث کرے گا۔'' شفق نے بوکھلا کر ہار مان لی تھی۔

''یہ ہوئی نا بات۔ تو پھر میں ٹھیک ساڑھے پانچ بجے تم لوگوں کو پک کرلوں گی۔'' زارا نے پروگرام سیٹ کیا تھا۔

''ڈرائیور کو ضرور ساتھ لینا۔ کہیں اکیلی نکل پڑو۔'' شفق نے اس کی لاپرواہ طبع سے واقفیت کی بناء پر تنبیہہ کی تو اس نے فرمانبرداری سے سر جھکا دیا۔

''گرمی بہت ہو رہی ہے۔ کیا خیال ہے، آئس کریم نہ ہو جائے؟'' ثمین کو اپنا کوٹا پورا کرنے کا خیال آ ہی گیا تھا۔ سارا موسم گرما وہ آئس کریم کھا کھا کر ہی گزارتی تھی۔

''شکر ہے تم نے آئس کریم کا نام لیا۔ ورنہ میں تو سمجھ رہی تھی کہ تمہاری دماغی کیفیت گڑبڑ ہو گئی ہے، خدانخواستہ یہ پیریڈ تو بغیر آئس کریم کے ہی گزر جاتا۔'' صبیرہ نے شرارت سے کہا تو وہ خوشدلی سے ہنس دی۔

اور پھر وارڈن سے اجازت کا مسئلہ بھی ثمین ہی نے منٹوں میں حل کیا تھا بلکہ ٹائم کا دورانیہ بھی گیارہ بجے تک کروا لیا جو کہ عام حالات میں تو کبھی بھی نہیں ہوتا تھا۔ مگر ثمین نے جانے کس رشتے دار کو بیمار کر کے اپنا کام نکلوا لیا تھا۔

''اگر وارڈن کو پتہ چل گیا کہ ہم کسی کی عیادت کی بجائے میوزیکل شو دیکھنے جا رہی ہیں تو ہمارا سامان باہر پڑا ہوگا۔'' صبیرہ کو اس کا جھوٹ گراں گزرا تھا۔

''ایسے ہی پتہ چل جائے گا؟ اور تم یہ خوفناک خیالات اپنے دماغ کی تجوری میں بند ہی رہنے دو تو بہتر ہے۔ چپ چاپ تیاری پکڑو۔ چار بج چکے ہیں اجازت لینے کے چکر میں۔'' ثمین نے لاپروائی سے اسے ٹوک دیا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے لئے کپڑے نکالنے لگی۔

زارا نے شفق کو پک کرنے کے بعد ٹھیک ساڑھے پانچ بجے انہیں ہوسٹل سے لیا تھا۔

''کچھ کہا تو نہیں وارڈن نے؟'' زارا نے ڈرائیور کو چند ہدایات دینے کے بعد پوچھا تو صبیرہ نے اسے شکایتی انداز میں بتایا۔

''میں تو کہہ رہی تھی کہ اگر کنسرٹ سے متعلق نہیں بتانا تو پارٹی ہی کا بہانہ کر لو۔ مگر یہ ثمین کی بچی نے تو آج رات ساڑھے دس بجے تک اپنی دادی جان کے دماغی آپریشن کا نام رکھ لیا ہے۔ کتنی غلط بات ہے نا۔''

''تو اس سے دادی کو کیا فرق پڑنے والا ہے؟ وہ تو دس سال پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے پاس جا چکی ہیں۔ میں کون سا سچ مچ ان کا آپریشن کرانے والی ہوں۔'' ثمین نے ڈھٹائی سے کہا تھا۔ زارا نے اسے داد دی۔

''بہت دماغ چلتا ہے تمہارا۔''

''صرف الٹے کاموں میں۔'' شفق نے سنجیدگی سے لقمہ دیا تھا۔ ''مگر بعض دفعہ ایسے چھوٹے موٹے جھوٹ بہت بڑے نقصان کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔''

''کبھی کبھار اپنے مفاد نکالنے کے لئے ایسے معصوم سے جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔'' وہ ناصحانہ انداز میں بولی۔ صبیرہ نے متاسفانہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''یعنی دادی جان کا برین ٹیومر کا آپریشن معصومانہ جھوٹ ہے؟''

''اوہ گاڈ...... تم لوگ تو اس بات کے پیچھے ہی پڑ گئی ہو۔ اور وہ وارڈن کون سی گنگا نہائی ہوئی ہے۔ اپنی چہیتی اسٹوڈنٹس کو آدھی آدھی رات تک باہر رہنے کی پرمیشن دے دیتی ہے۔ بس ہماری دفعہ ہی اس کے دل کو کچھ ہوتا ہے۔ ہوسٹل کے رولز یاد آ جاتے ہیں۔'' اب کی بار ثمین چڑ گئی تھی۔

''خیر اب خود کو ان لڑکیوں سے تو مماثل مت کرو۔ ان کی ریپوٹیشن کی خبریں میرے کانوں میں بھی اُڑتے اُڑتے پڑی ہیں۔'' صبیرہ نے سنجیدگی سے اسے ٹوک دیا تھا۔

''اب بس بھی کرو یار! یوں لگ رہا ہے جیسے ہم میوزیکل کنسرٹ میں نہیں کسی جرگے میں شرکت کے لئے جا رہی ہیں۔ اب یہ بحث و مباحثہ چھوڑو اور اس پکنک کو انجوائے کرو۔'' زارا نے انہیں ٹوک دیا تو واقعی تھوڑی دیر کے بعد وہ چاروں بہت خوشگوار موڈ میں باتیں کرتیں اس کنسرٹ سے لطف اٹھانے کو تیار تھیں۔

✡......✡

وسیع و عریض ہال میں شائقین کے لئے کرسیوں کا انتظام تھا۔ پورا ہال رنگ برنگی لائٹس سے جگمگا رہا تھا۔ سامنے اسٹیج پر میوزیکل انسٹرومنٹس تو موجود تھے مگر میزبان ندارد۔

بمشکل وہ چاروں اپنی نشستوں پر پہنچی تھیں۔

اس سے آگے کا ایک گھنٹہ انہوں نے چپس، کوک اور باتوں کے سہارے گزارا۔ اگلے ایک گھنٹے تک چند ایک نشستوں کے علاوہ پورا ہال کھچا کھچ بھر چکا تھا۔

''کیا بوریت ہے یار۔ سارا ٹائم تو یونہی گزر جائے گا۔'' شفق نے چپس کا تیسرا خالی پیک کرسی کے نیچے گھساتے ہوئے بے زاری سے کہا تھا۔

''فی الحال لوگوں کو دیکھ کر انجوائے کرو۔'' ثمین یوں بھی ہلے گلے کی شوقین تھی۔ جوش سے بولی۔

''پچھلے دو گھنٹوں سے یہی کام کر رہی ہوں۔'' وہ بے زار تھی۔

''تو بس پھر اگلے دو گھنٹے بھی یہی کرو۔ ٹائم گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔'' زارا نے اسے پچکارا تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

اسی وقت کوئی ان کے سر پر آ کھڑا ہوا تھا۔

''ایکسکیوز می مس! آپ شاید غلط سیٹ پر بیٹھی ہیں۔''

صبیرہ نے حیرت سے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا تھا۔

''آپ مجھے کہہ رہے ہیں؟''

''جی، یہ دیکھئے۔ ان ٹکٹس پر سیٹ نمبر بھی لکھا ہے۔ اس لحاظ سے یہ میری مسز کی سیٹ بنتی ہے۔''

وہ شخص شائستگی سے کہہ رہا تھا۔ صبیرہ نے ایک نظر اس کے ہاتھ میں موجود ٹکٹ کے ایک حصے پر ڈالی اور پھر گھور کر زارا کو دیکھا جو خود بھی اس صورت حال پر گڑبڑا گئی تھی۔

''دیکھیں یہ کوئی ہوائی جہاز کی سیٹ تو ہے نہیں کہ جس کی ہے وہی بیٹھے گا۔ ہم چاروں اکٹھی ہیں۔ اب یہ سیٹ آپ کو دے کر ہماری ساتھی کہاں بیٹھے گی؟'' ثمین نے تیکھے لب و لہجے کا سہارا لے کر مخالف کو دباؤ میں لینے کی کوشش کی تو جواباً وہ بھی شائستگی بھول کر اکھڑ انداز میں بولا۔

''تو محترمہ! اس میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ میری مسز میرے ساتھ ہیں۔ اب میں ان کو تو اکیلے کہیں اور نہیں بٹھا سکتا۔''

''تو پھر اب......؟'' زارا پریشان ہونے لگی۔

''تو پھر یہ کہ آپ اپنا سیٹ نمبر دیکھیں اور وہاں شفٹ ہو جائیں۔'' وہ اطمینان سے بولا تھا۔

''تم نے ایک ہی سیریل کی ٹکٹس نہیں لی تھیں کیا؟'' ثمین کو غصہ آنے لگا۔ ایک تو پروگرام بھی شروع ہونے لگا تھا اوپر سے وہ شخص کلیم کرنے آ گیا تھا۔

''اتنی آسانی سے تھوڑی مل جاتی ہیں ٹکٹس۔ تین ٹکٹس عدیل بھائی نے لا کر دی تھیں اور ایک میں نے خود......'' وہ مجرمانہ انداز میں بولی۔

''دیکھیں آپ لوگ خوامخواہ وقت ضائع کر رہی ہیں۔ جلدی سے سیٹ خالی کریں۔ لوگ بھی ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔''

پچھلی نشست والوں کے شور مچانے پر اس شخص نے تیز لہجے میں کہا تو صبیرہ خائف سی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

''تم بیٹھی رہو۔'' ثمین اپنے خونخوار موڈ میں آنے لگی تو صبیرہ نے معاملہ ہی سمیٹ دیا۔

''اٹس او کے۔ تھوڑی دیر کی تو بات ہے۔ میں اپنی سیٹ پر چلی جاتی ہوں۔'' اس نے ٹکٹ پر موجود سیٹ نمبر دیکھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ اس کی سیٹ ان سے دو رو پیچھے تھی۔

کلیم کرنے والا شخص اور اس کی طرحدار بیوی اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے۔

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔'' شفق پریشان ہونے لگی تھی۔

''تم یہاں بیٹھ جاؤ۔ میں پیچھے چلی جاتی ہوں۔'' زارا نے حل پیش کیا جسے صبیرہ نے مسترد کر دیا۔

''بات تو ایک ہی ہے، تم وہاں جاؤ یا میں۔ ڈونٹ وری۔ میں بچی تو نہیں ہوں جو اکیلے میں ڈر جاؤں۔''

وہ سائیڈ سے ہو کر سیڑھیاں طے کرتی اوپر تھرڈ رو میں چلی گئی جہاں اس کے آس پاس تین چار نشستیں ابھی خالی تھیں۔

''شکر ہے ساتھ کوئی جھنجٹ نہیں۔'' صبیرہ نے آس پاس کی خالی نشستیں دیکھ کر سوچا تھا۔

پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ زارا کا کہنا بالکل صحیح تھا کہ یہ اچھے گلوکاروں کا کنسرٹ تھا۔ جن کے گلے میں سُر بھی تھا اور گانوں میں شاعری بھی اچھی تھی۔ تھوڑی دیر میں اس کی دلچسپی پروگرام میں بڑھ گئی تو اسے تنہا بیٹھنے کا احساس بھی نہیں رہا تھا اور کچھ وہ تینوں بھی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گردنیں موڑ کر اس کی خیر و عافیت دریافت کر رہی تھیں۔

ہال میں جلتی بجھتی لائٹس نے اندھیرے کو بھی پر رونق بنا رکھا تھا۔ یا پھر شاید زندگی میں پہلی مرتبہ اس طرح کا بڑا امیوزیکل کنسرٹ اٹینڈ کرنے کا تجربہ صبیرہ کو اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے اردگرد موجود نشستیں بھی پُر ہو چکی تھیں۔ اتنے اندھیرے میں اس نے ساتھ بیٹھنے والوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس کی داہنی سائیڈ پر بیٹھے دونوں لڑکے بہت بے ہودگی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اسٹیج پر موجود گلوکارہ پر فضول کمنٹس پاس کرتے وہ لچرپن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ پتہ نہیں لوگ کیسے ان کو برداشت کر رہے تھے یا پھر شاید یہ روٹین کا ایک حصہ تھا۔ مگر ان کی فضول گفتگو صبیرہ کو تپا گئی تھی۔ وہ دونوں آس پاس موجود خواتین کا بھی احساس نہیں کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں اچھل کود کرتے نعروں کے ساتھ بھنگڑا ڈالتے ہوئے وہ لڑکا اپنی نشست پر بڑے بے ڈھنگے انداز میں بیٹھا تو اس کا شانہ صبیرہ کے شانے سے ٹکرا گیا۔ اب چاہے یہ سب غلطی سے ہوا ہو یا جان بوجھ کر، صبیرہ فوری طور پر مشتعل ہو اٹھی تھی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تم لوگوں کو انسانوں میں بیٹھنے کی تمیز نہیں ہے کیا؟'' اس نے چلا کر کہا مگر لوگوں کے شور، ہنگامے اور تیز میوزک میں اس کی آواز دب کر رہ گئی۔ لیکن وہ دونوں بدتمیز لڑکے ضرور متوجہ ہو گئے تھے۔

''میں نے کیا، کیا ہے؟'' وہ لڑکا اپنی سرچ لائٹ جیسی آنکھوں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ صبیرہ کا جی چاہا تھپڑوں سے اس کا منہ لال کر دے۔

''اگر پروگرام دیکھنا ہے تو تمیز سے بیٹھ کر دیکھو اور دوسروں کو بھی دیکھنے دو۔''

غصے میں وہ ہر انجام سے عاری ہو جاتی تھی۔ اب بھی آگے پیچھے دیکھے بغیر بھڑک اٹھی تھی۔ مگر وہ بدتمیزی سے بولا۔

''دیکھیں میڈم! آپ خوامخواہ بات بڑھا رہی ہیں۔ ایسے فنکشنز میں تو یہ سب چلتا ہی رہتا ہے۔ اگر اتنا ہی اعتراض ہو رہا ہے تو گھر میں بیٹھا کریں۔''

''کیا مسئلہ ہے یار! کیوں بات کو بڑھا رہے ہو؟'' اس کے ساتھی نے بھی لڑکی کو تیز ک جان کر اپنی گردن معاملے میں گھسیڑ دی تو پہلے والا لڑکا لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔

''غصہ کھا رہی ہے یار!''

اس کی بے ہودگی پر صبیرہ کا خون کھول اٹھا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اٹھ گیا۔ مگر مقابل بھی بے خبر نہیں کھڑا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے اس کا اٹھا ہوا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں جکڑ لیا تھا۔ وہ پوری جان سے کانپ کر رہ گئی۔

✡......✡

''ایک بار کا کہا تمہاری سمجھ میں نہیں آتا رخشی! میری طرف سے صاف انکار ہے۔ اور جتنی بار تم پوچھو گی میرا یہی جواب ہو گا۔'' تابندہ نے بہت ہٹیلے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے سختی سے کہا تو رخشی کو بھی غصہ آنے لگا۔

''آج سے پہلے تو تمہیں کبھی بھی اس رشتے پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا، پھر یہ اچانک تمہیں احسن بھائی میں خامیاں کیسے دکھائی دینے لگیں؟''

''مجھے آج سے نہیں بلکہ شروع ہی سے اس رشتے پر اعتراض تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے کبھی کہا نہیں۔'' تابندہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

''تو پھر آج ایسی کیا بات ہو گئی۔ جب کہ خالہ جان منگنی کی تاریخ مقرر کرنا چاہ رہی ہیں؟''

رخشی نے تلخی سے پوچھا تو وہ سابقہ انداز میں لاپروائی سے بولی۔ ''تاریخ مقرر ہونی ہے۔ ہوئی تو نہیں نا۔''

''بڑوں کے درمیان جو بات طے ہو جائے وہ تاریخ مقرر ہونے کے مترادف ہوتی ہے۔ باقی سب تو ضابطے کی کارروائی ہوتی ہے۔ نبھائیں چاہے نہ نبھائیں۔''

''بہر حال، شادی میں سب سے زیادہ اہمیت لڑکی کی رضامندی کی ہوتی ہے۔ اور میں اس شادی پر بالکل بھی رضامند نہیں ہوں۔''

اس نے صاف لفظوں میں انکار کر دیا تھا۔

''تم کیا سمجھتی ہو کہ تمہاری اس بے کار کی ضد کو کوئی مانے گا؟ سب لوگ جواز مانگیں گے۔'' رخشی نے غصے سے کہا تو وہ آرام سے بولی۔

''میرے پاس مضبوط سبب موجود ہے۔''

''کیا؟''

''وقار علی......''

اس نے دھماکا ہی تو کر دیا تھا۔ رخشی پھٹی پھٹی آنکھوں میں بے یقینی کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر لئے اسے دیکھتی رہ گئی۔

تابندہ نے مختصر لفظوں میں اپنے اور وقار علی کے مابین تعلق کی وضاحت کی تو وہ پھٹ پڑی۔

''شرم کرو تابی! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم ایسی گری ہوئی حرکت بھی کر سکتی ہو۔''

''اس میں گراوٹ کی کون سی بات ہے؟'' اب کی بار تابندہ کو بھی غصہ آ گیا تھا۔ ''ہمارا مذہب ہمیں اجازت دیتا ہے اس معاملے میں اپنی پسند بتانے کی۔''

''مذہب کی آڑ مت لو۔ مذہب یہ نہیں کہتا کہ راہ چلتے شخص کے لئے اپنے والدین کے فیصلوں کی دھجیاں اڑانا شروع کر دو۔ کیا تم اپنے لئے ان سے بہتر سوچ سکتی ہو؟'' رخشی نے تیز لہجے میں کہا۔

''ہر کوئی اپنی زندگی کا فیصلہ بہتر طور پر خود ہی کر سکتا ہے۔'' جواباً وہ آرام سے بولی تھی۔

''کس قدر چھوٹی سوچ ہے تمہاری تابندہ!''

رخشی تاسف اور دکھ کے مارے کچھ کہہ ہی نہیں پائی تھی۔

''دیکھو رخشی! اگر احسن کے مقابلے میں میرے پاس اور کوئی چوائس نہیں ہوتی تو میں شاید اسی کے لئے ہاں کہہ دیتی۔ مگر اب جب کہ قدرت نے مجھے ایک بہترین موقع دیا ہے اپنی زندگی سنوارنے کا تو میں کیوں نہ فائدہ اٹھاؤں؟''

''تم کہنا چاہتی ہو کہ امی ابو کا احسن کو تمہارے لئے چننا ایک بہترین فیصلہ نہیں تھا؟'' رخشی نے تلخی سے سوال کیا تھا۔

''میرے نزدیک تو نہیں تھا۔ کیونکہ وہ کسی طور بھی میرے ذہنی معیار پر پورا نہیں اترتا۔''

''ہنہ...... تمہارا ذہنی معیار۔'' رخشی نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹکا اور کڑوے لہجے میں بولی۔ ''تمہارا ذہنی معیار تو اب سامنے آ ہی گیا ہے۔ ایک ایسا شخص جسے تم بچپن سے اب تک ایک اچھے کزن اور ایک اچھے دوست کا مقام دیتی رہی ہو۔ آج وہ تمہارے ذہنی معیار سے کمتر ہے اور راستے میں ملنے والا کوئی راہ چلتا، تمہارے ذہنی معیار پر پورا اتر آیا ہے۔ وہ بھی چند دنوں میں......''

تابندہ نے اس کے لہجے کی کڑواہٹ کو بہت تحمل سے برداشت کیا تھا۔

''وہ کوئی راہ چلتا نہیں ہے۔ میں اسے پچھلے ایک ماہ سے جانتی ہوں۔ وہ بہت نائس شخص ہے۔ ویل مینرڈ ہے۔ ویل ایجوکیٹڈ ہے۔''

''جاہل اور گنوار تو احسن بھائی بھی نہیں۔ پھر ایسا کیا ہے اس شخص میں جو احسن بھائی میں نہیں ہے؟''

رخشی احسن سے بہت متاثر تھی اور یوں بھی شروع ہی سے اس گھر میں احسن کو ایک نمایاں حیثیت دی جاتی رہی تھی۔ تابندہ کے حوالے سے اس کا مقام بہت خاص تھا۔ تو اب وہ تابندہ کی الٹی سیدھی باتیں کیسے برداشت کر لیتی؟

''بس وہ میرا آئیڈیل نہیں ہے۔'' وہ بیزار لہجے میں بولی تو رخشی نے تلخی سے کہا۔

''یوں کہو کہ تمہیں ان کی شرافت سے زیادہ وقار علی کا سرِ راہ تمہاری راہ روک کر بے باکانہ اظہارِ محبت کرنا اچھا لگا ہے۔ جب کہ میرے نزدیک اس سے زیادہ گری ہوئی حرکت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ کل کو اسے کوئی اور لڑکی پسند آ جائے تو کیا وہ یونہی راہ چلتے اسے اپنی عشقیہ داستان سنانا شروع کر دے گا؟''

''اس میں گراوٹ والی کون سی بات ہے؟'' تابندہ کو رخشی کی بات سخت ناگوار گزری تھی۔ اس نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ ''وہ بہت صاف گو اور پُراعتماد شخص ہے۔ احسن کی طرح دبی ہوئی شخصیت کا مالک نہیں۔ جو اس کے دل میں تھا اس نے چھپانے کی بجائے صفائی سے مجھے بتا دیا اور مجھے اس کا یہی اعتماد اور انداز اچھا لگا ہے۔''

''تمہیں اچھی طرح پتہ ہے تابی! احسن بھائی تمہیں بہت چاہتے ہیں۔ منہ سے نہیں کہتے تو کیا ہوا مگر ہم سب جانتے تو ہیں وہ تمہاری کتنی عزت کرتے ہیں۔'' رخشی نے خود کو بے بس محسوس کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر سے اسے سمجھانے کی کوشش کر ڈالی۔ وہ استہزائیہ انداز میں ہنس دی۔

''یہی دوغلا پن تو مجھے نہیں بھاتا۔ دل سے چاہتا ہے اور لبوں سے کہنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ بزدل۔''

''ارے بزدلی نہیں، کردار کی پختگی اور شرافت کی دلیل کہتے ہیں۔ اگر ایسی ہی محبت تمہارے لئے اپنے دل میں رکھتے ہوئے گلی کا کوئی لفنگا محبت کا منہ زبانی اظہار بھی کر دے تو کیا تم اسے بھی صاف گوئی اور پُراعتمادی کے ایوارڈ سے نوازو گی؟'' رخشی کا بس نہیں چل رہا تھا کیسے اس کی برین واشنگ کر دے۔

''بات کو گھماؤ نہیں رخشی! اور ویسے بھی میں اب فیصلہ وقار کے حق میں دے چکی ہوں۔ مجھے احسن کسی طور بھی قبول نہیں ہے۔ اور اگر تم یہ بات امی تک نہیں پہنچا سکتیں تو بتا

دو میں خود ان سے بات کرلوں گی۔'' تابندہ نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا تو رخشی کو رونا آنے لگا۔

''کس قدر احسان فراموش ہو تم تابندہ! یہ صلہ دے رہی ہو تم امی ابو کی محبتوں کا؟ آج تک تمہاری زبان سے نکلی ہر فرمائش شام ہونے سے پہلے پوری کی ہے انہوں نے۔ اور اب جبکہ تمہاری فرمانبرداری کا وقت آیا ہے تو تم اپنے راستے ہی الگ کر رہی ہو۔''

اس کی آنکھوں سے چھلکتی نمی سے تابندہ کا دل بھی پسیج گیا۔

محبتوں کے معاملے میں تو وہ واقعی بہت امیر رہی تھی۔ امی سے زیادہ ابو اس کے نازنخرے برداشت کرتے تھے۔ شادی کے پانچ طویل سالوں کے بعد جس نے ان کے آنگن میں آنکھ کھول کر انہیں معتبر کر دیا تھا۔ حالانکہ اس کے بعد رخشندہ بھی تھی مگر جو لاڈ پیار تابندہ کے حصے میں آیا وہی شاید آج اس کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

''میں بہت بے بس ہوں رخشی! میں کیا کروں۔ کیسے اپنے دل کو ماردوں؟'' وہ بھی روہانسی ہونے لگی تھی۔

''خدا کے لئے تابی! زندگی میں ایسے بہت سے مقامات آتے ہیں جہاں دل کو مارنے ہی میں عقلمندی ہوتی ہے۔ ہر بار دل کی ماننے والے اکثر نقصان اٹھاتے ہیں۔ کیونکہ دل کے فیصلے جذباتیت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتے۔'' رخشی زچ آ گئی تھی۔

''مگر میں اپنے دل کو مارنا نہیں جانتی۔ کیونکہ مجھے امی ابو نے کبھی اس کی عادت ڈالی ہی نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ سے میری ہر خواہش پوری کرتے آئے ہیں۔ میری زندگی کا فیصلہ میری خواہش سے ہٹ کر کیسے کر سکتے ہیں؟'' اس کے لب و لہجے میں محبتوں کا تفاخر بول رہا تھا۔

''اور تم ...... تم کیا صلہ دے رہی ہو ان کی محبت کا؟ کبھی خود سے ہٹ کر بھی سوچ لیا کرو تابندہ ضیاء! تمہارے اس فیصلے سے خاندان بھر میں کیا عزت رہ جائے گی ہماری فیملی کی؟ سبھی جانتے ہیں کہ احسن کو امی ابو نے تمہارے لئے پسند کیا ہے۔ اب کیا وقار علی کا رشتہ قبول کرنے سے بات تم پر نہیں آئے گی کہ لڑکی کی پسند سے شادی ہو رہی ہے۔''

''تو اس میں شرم کی کیا بات ہے؟ شریعت اجازت دیتی ہے اس بات کی۔''

وہ کہنے لگی تھی کہ رخشی بہت تلخی سے اس کی بات کاٹ گئی۔

''شریعت والدین کے بہترین فیصلے کو رد کر کے اپنی راہ چلتی پسند ٹھونسنے کی اجازت کسی طور نہیں دیتی۔ برائے کرم تم اپنے اس فیصلے کو شرعی طور پر درست ثابت نہ ہی کرو تو بہتر ہوگا۔ ہم سب تو احسن بھائی کی شرافت، ان کے اخلاق و کردار کی ضمانت دے سکتے ہیں۔ تم وقار علی کے گواہ کہاں سے لاؤ گی؟''

''وہ اپنے والدین کو لائے گا۔ باقاعدہ رشتہ لائیں گے وہ لوگ۔'' اس نے تحمل سے کہا تو وہ تمسخرانہ انداز میں بولی۔

''تو پھر بہتر یہی ہوگا کہ اس کے والدین کو آ لینے دو۔ یہ نہ ہو کہ ادھر سے بھی جاؤ اور ادھر کی بھی کوئی خبر نہ ملے۔''

''شٹ اپ رخشی!'' وہ بھڑک اٹھی تھی۔

''تو پھر اگر تم میں اتنی ہمت ہے تو جا کر امی ابو کو اس رشتے سے انکار کر آؤ۔ کیونکہ منگنی کے ساتھ ہی شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو جائے گی۔''

رخشی رکھائی سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ تابندہ کا دل ذرا ڈول کر سنبھلا۔

''اوکے۔ میں خود ان سے بات کرلوں گی۔''

اس نے بہت اعتماد کا مظاہرہ کیا تو رخشی مزید کچھ کہے بغیر اس کے کمرے سے نکل گئی۔

تابندہ نے امی ابو کو قائل کرنے کے لئے ذہن میں مکالمے تیار کرنا شروع کر دیئے۔

✡......✡

وہ بے بس سی کھڑی بے دم ہونے کو تھی۔ آس پاس کے لوگوں میں سے کوئی بھی نہیں بولا تھا۔ سب لوگ ناچ کود اور شوروغل میں مگن تھے۔ اس کا ہاتھ ابھی تک اس لڑکے کی جارحانہ گرفت میں تھا۔ اس نے صبیرہ کے ہاتھ کو خباثت سے ہنستے ہوئے ہلکا سا جھٹکا دیا تو وہ اگلی کرسیوں پر الٹنے سے بمشکل بچی۔

''او بے غیرت، بے حیا!'' ایک دم ہی کوئی آ کر اس لڑکے پر پل پڑا تھا۔

وہ لرزتی کپکپاتی اپنی کرسی میں دھنس گئی۔ آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے ابل پڑے تھے۔

اسے اندازہ ہوا کہ آنے والے کے ہمراہ اس کے تین چار ساتھی بھی تھے جو کہ ان دونوں لڑکوں کو مارتے ہوئے اب سکیورٹی کے آدمی کے ساتھ ہال سے باہر لے جا رہے تھے۔ اتنے شور ہنگامے میں چند ایک ہی کو اصل بات کا پتہ چل پایا تھا۔ مگر کسی نے بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ شاید ایسے مکس گیدرنگ فنکشنز اٹینڈ کرنے والوں کے لئے یہ ایک عام سی بات ہو چکی تھی۔

اس کے وجود میں جیسے آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ اس نے جھک کر صبیرہ کی کلائی تھامتے ہوئے اسے اٹھایا تھا۔

''چلو یہاں سے۔''

وہ ذلت کے احساس سے چور خود فراموشی کے عالم میں اس کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔

اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں وہ لڑکے اتنی بدتمیزی پر اتر آئیں گے اور لوگوں میں بھی تو جیسے غیرت و حمیت کا جذبہ عنقا ہو چکا تھا۔ کسی نے بھی آگے بڑھ کر معاملہ جاننے یا پھر اس کی مدد کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اور یہ شخص۔

ایک نظر اس کے مضبوط ہاتھ میں دبی اپنی کلائی پر ڈالنے کے بعد اس نے دھندلائی نگاہ خود سے دو قدم آگے چلتے ایڈی پر ڈالی تو اسے اپنا آپ ذلت و اہانت کے عمیق گڑھے میں دھنستا محسوس ہونے لگا۔

'کیا یہ ضروری ہے کہ میں ہر بار اسی شخص کے ہاتھوں ذلت کا سامنا کروں؟'

وہ یونہی تیز قدموں سے چلتا اسے ہال سے باہر لے آیا تھا۔

انہیں دیکھتے ہی ثوبان اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر ان کی طرف آ گیا۔

''اکیلی آئی ہو؟'' ثوبان کے لب و لہجے کی سردمہری اور تناؤ اسے بہت زیادہ محسوس ہوا تھا۔ اس کا حلق آنسوؤں کی نمکینی سے بھرنے لگا۔ ایڈی اس کا ہاتھ چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔

''وہ تینوں بھی ہیں۔'' اس کی عزت نفس نڈھال ہو رہی تھی۔

''اوہ ..... تو بے وقوفوں کا پورا گروپ یہاں موجود ہے۔ میں بھی کہوں اتنی بہادری تم اکیلی تو نہیں دکھا سکتیں۔''

ثوبان کے انداز میں فوراً محسوس کن تبدیلی آئی تھی۔ اب کی بار اس کے لب و لہجے میں اطمینان کی جھلک تھی۔

''میں اسے ڈراپ کر کے آتا ہوں۔ تم ان تینوں کو لے آؤ، فوراً۔'' اتنی دیر میں وہ پہلی بار بے تاثر سے لہجے میں بولا تو ثوبان سر ہلاتا داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''کیا ضرورت تھی تمہیں ان فضول لوگوں سے الجھنے کی۔ بہت شوق ہے تمہیں اپنی بہادری دکھانے اور زمانے پر اپنی دھاک بٹھانے کا؟'' وہ تلخی سے بولا تو صبیرہ کے اعصاب کو بے یقینی کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ بات کو اس رخ پر لے جائے گا۔

''کیا؟ تمہارا مطلب ہے کہ میں شوقیہ طور پر ان سے الجھ رہی تھی؟'' اس پر صدمے کی سی کیفیت طاری تھی اور پھر رفتہ رفتہ اس کو غصہ آنے لگا۔

''اور تم ہوتے کون ہو مجھ پر یہ فضول کمنٹس پاس کرنے والے؟''

''یہی تمہارا باغی انداز تمہیں ہر وقت پرابلمز میں گھیرے رکھتا ہے۔''

اس کا طنزیہ وار بہت کاری تھا۔ صبیرہ کی روح تک بلبلا اٹھی۔

''مائینڈ یو مسٹر ایڈی! میں نے تمہیں مدد کے لئے نہیں پکارا تھا۔ تم اپنی مرضی سے آگے بڑھے تھے۔ تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح بیٹھ کر تماشہ دیکھتے رہتے تو مجھے کوئی فرق نہ پڑتا۔''

باٹل گرین ہمرنگ کڑھائی سے مزین کاٹن کے سوٹ میں ملبوس دوپٹہ سلیقے سے شانوں پر ڈالے غصے کی تمتماہٹ سے سرخ چہرہ لئے وہ ایڈی کو باغیوں کی لیڈر محسوس ہو رہی تھی۔

''بہت شوق ہے تمہیں تماشہ بننے کا؟'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا تھا۔

صبیرہ کی پیشانی تپ اٹھی۔

''شٹ اپ!''

''مان لو صبیرہ علی! کہ یہ نام نہاد آزادی عورت کو ذلت کے سوا اور کچھ نہیں دیتی۔ آج کے معاشرے میں مرد کے لئے صرف اپنی ماں، بہن اور بیٹی قابل عزت ہیں۔ اکیلی اور مادر پدر آزاد عورت کی حیثیت اس کے لئے صرف ایک شکار کی سی ہے اور کچھ نہیں۔''

اس کے لب و لہجے میں بھی غصے کی تپش اتر آئی تھی مگر اس کے الفاظ صبیرہ کو اپنی روح پر کوڑوں کی طرح رسید ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ اسے کیسی لڑکی سمجھ کر اتنی گہری باتیں سمجھا رہا تھا۔ اس کے کانوں کی لوئیں تک تپ اٹھیں۔

''ایڈی! اپنا رویہ درست کرو۔ تم نے میری مدد کی ہے تو صرف انسانیت کے ناتے۔ اس کے علاوہ میرا تمہارا ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے کہ تم مجھ سے اتنی فضول گفتگو کرو اور نہ ہی تمہیں میری انسلٹ کرنے کا پرمٹ حاصل ہے۔'' وہ دانت پیستے ہوئے بولی تھی۔

چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد دفعتاً وہ شانے جھٹکتا پلٹ گیا تھا۔

''آؤ تمہیں ہوسٹل ڈراپ کردوں۔''

وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں تھی۔

''مجھے تمہارے ساتھ کہیں نہیں جانا ہے۔''

''واٹ؟'' وہ تحیر میں گھرا اس کی طرف مڑا تھا۔ ''دماغ تو خراب نہیں ہوگیا تمہارا؟'' اسے صبیرہ کی ہٹ دھرمی پر غصہ آنے لگا۔

''دماغ خراب نہیں ہوا اسی لئے انکار کررہی ہوں۔'' وہ بے حد سرد مہری سے کہتی ہوئی ہوا کے جھونکے سے بکھرتی بالوں کی لٹ کان کے پیچھے اڑسنے لگی۔

''تو کیا تم یہیں کھڑی ان غنڈوں کے دوبارہ لوٹنے کا انتظار کروگی؟'' خون تو اس کا بھی بہت گرم تھا۔ اوپر سے صبیرہ کی ہٹ دھرمی۔

''تمہارے ساتھ جانے سے بہتر ہے کہ میں یہیں کھڑی ہوکر کوئی نقصان اٹھالوں۔'' وہ بے حد تلخی سے بولی تو جانے کیسے آواز بھرا سی گئی۔ وہ رخ موڑے ہال کے داخلی دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم جیسے لوگ واقعی نقصان اٹھاتے ہیں صبیرہ علی! اور وہ بھی اپنی بے جا انا اور اکڑ کے ہاتھوں۔'' وہ چڑ گیا تھا۔

''اور تم جیسے لوگ ایسی سچویشن سے بھی فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکتے۔ جتنا ہوگیا وہی کافی ہے۔ میں تمہارے ساتھ جاکر یونیورسٹی کی دیواروں پر اپنے پوسٹرز نہیں لگوانا چاہتی۔'' وہ کڑوے لہجے میں بولی تھی۔

''تم بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو صبیرہ علی۔'' وہ غصے میں آکر کہنے لگا تھا کہ اسی وقت ثوبان ان تینوں کو لئے چلا آیا۔

''کیا ہوگیا صبی؟ ثوبان بتا رہا تھا کہ.....'' زارا متوحش سی اس کی طرف بڑھی تو وہ بیزاری سے بولی۔

''اپنے ڈرائیور کو بلاؤ۔ باقی کی کہانی کل یونیورسٹی کے لوگوں سے سن لینا۔''

اس کے الفاظ میں مخفی طنز پاکر ایڈی نے گہری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ ثوبان نے ان چاروں کو ڈراپ کرنے کی ذمے داری اپنے سر لے لی تو وہ خاموشی سے اپنی بلیک اسپورٹس بائیک کی طرف بڑھ گیا۔

✡......✡

''نہ پتر! اتنی ہیکڑ (ضد) اچھی نہیں ہوتی۔ ماں جو کہتی ہے مان لے۔'' مثالی غصے کے مالک ابا جی اپنے اس جذباتی اور لاڈلے بیٹے کے آگے دھیمے پڑ جاتے تھے۔

''آج تک ماں ہی کی تو مانتا آیا ہوں ابا جی! کیا صلہ مل رہا ہے ان کی فرمانبرداری کا؟'' وہ بے حد تلخی سے کہہ رہا تھا۔ بے جی کا ضبط جواب دے گیا۔

''کیا مانی ہے تم نے ماں کی؟ ارے آج تک تو ہم لوگ ہی تمہاری ضد، تمہاری اکڑ اور نخرے مانتے چلے آئے ہیں۔ صلہ تو ہمیں ملنا چاہئے ان محبتوں، ان ریاضتوں کا۔''

''حق تھا میرا ان محبتوں اور ریاضتوں پر۔ احسان نہیں کیا آپ لوگوں نے مجھ پر۔'' وہ غصے میں یونہی ادب آداب بھول جاتا تھا۔ انتہائی جذباتیت اسے کچھ اچھا سوچنے ہی نہیں دیتی تھی۔

''وقار!'' بھایا اسے تنبیہی انداز میں ٹوک گئے تھے۔ وہ چڑ کر ان سے کہنے لگا۔

''تو پھر آپ ہی بتائیں، میں کن الفاظ میں ان سے کہوں کہ میں کسی بھی صورت فوزیہ سے شادی کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ کیوں یہ لوگ میری زندگی برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں؟''

''شاباش ہے بیٹا تمہاری سوچ پر۔'' بے جی صدمے کی گرفت میں آگئیں۔ ''یعنی ہم لوگ تمہاری زندگی برباد کررہے ہیں؟ ارے اپنے منہ سے نوالہ نکال کر تجھے کھلاتی رہی ہوں۔ خود گیلے پر سوکر تجھے خشک جگہ پر سلاتی رہی ہوں اور آج ہم تیری زندگی برباد کرنے والے ہوگئے۔''

ان کی آواز بھرا گئی تو وہ اندر ہی اندر شرمسار ہونے لگا۔ مگر اس قدر نازک وقت میں کمزوری دکھانے کا مطلب تھا تابندہ ضیاء کو کھو دینا جو وہ کسی طور نہیں کرسکتا تھا۔

''بہر حال میں آپ کو اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں اور آپ لوگ کچھ بھی کہیں، میں اس پر سے ایک انچ بھی ہٹنے والا نہیں ہوں۔'' وہ سرد لہجے میں کہتا اٹھ کر کمرے سے نکل گیا تو بھایا بھی تیزی سے اس کے پیچھے لپکے تھے۔

''وقار!''

ان کے پکارنے پر اس کے قدم دھیمے تو ضرور پڑے مگر وہ رکا نہیں۔ چلتا رہا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے اسے پائیں باغ میں لے آئے۔ وہ جھلا کر فوارے کے حوض کے کنارے بیٹھ گیا تھا۔ اکتا کر بولا۔

''پلیز بھایا! اب آپ بھی میری برین واشنگ کا سلسلہ شروع نہ کردیجئے گا۔''

''پاگل ہو تم۔ ہر مسئلہ جذباتیت سے حل نہیں کیا جاتا۔'' انہوں نے اسے ڈپٹ دیا تھا۔

''جذباتیت سے کب؟ میں نے اتنے آرام سے بھابی کے ذریعے یہ بات بے جی کو کہلوائی تھی اور انہوں نے پوری حویلی میں دھوم مچادی۔ اوپر سے میرے خلاف محاذ بھی کھول لیا۔'' وہ روٹھے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''تو کیا وہ غلط ہیں؟'' وہ سینے پر بازو لپیٹے ان کے سامنے آکھڑے ہوئے تھے۔ بجری کے پتھر اٹھا کر فوارے کے پانی میں پھینکتا وہ تاسف سے انہیں دیکھنے لگا۔

''آپ تو یہ مت کہیں۔ آپ کی بھی لو میرج ہے۔''

ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''وقار علی! صدیقہ میری کزن بھی تھی اور دوسرے یہ کہ میں پہلے سے منگنی شدہ نہیں تھا۔ سو میری فرمائش پر اس شادی کو ارینج کردیا گیا۔''

''ایک ہی بات ہے۔ اور منگنی شدہ تو میں بھی نہیں ہوں۔ یہ بچپن کے کھیل میرے نزدیک کچھ اہمیت نہیں رکھتے ہیں۔'' وہ خفگی سے پُر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''بچپن کے یہی چھوٹے چھوٹے کھیل وقت کے ساتھ پل کر جب جوان ہوتے ہیں تو رشتوں کو مزید مضبوط کرتے ہیں وقار!'' انہوں نے اسے رسان سے سمجھایا تھا مگر وہ منطق اور دلیل نہیں صرف جذباتیت سے قائل ہونے اور قائل کرنے والا شخص تھا۔

''ہر بار ایسا ہونا ضروری نہیں ہوتا بھایا! جذبے کوئی پیڑ پودے نہیں ہوتے کہ جب جی چاہا بیج ڈال کر آبیاری کرلی۔ یہ تو دل کی زرخیز مٹی میں خود بخود نمو پاکر سر اٹھاتے ہیں اور پھر ایک روز ساری دنیا کے سامنے ظاہر ہوجاتے ہیں۔ انہیں کسی دلیل کی کلہاڑی سے گرایا نہیں جاسکتا۔''

''مگر بعض جذبے کچھ جذبوں پر بھاری بھی تو پڑتے ہیں وقار!'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بے اختیار بولا۔

''تو پھر جیت ہر حال میں تابندہ ضیاء کی ہوگی بھایا! میں نے اس کے لئے اپنے جذبوں کو ہر جذبے پر حاوی پایا ہے۔''

اس کی بات پر وہ لحظہ بھر لب بھینچے اسے دیکھتے رہے پھر گہری سانس لے کر اس کے پاس آبیٹھے۔

''یہ زندگی بھر کے فیصلے ہیں وقار! کم از کم انہیں تو اس قدر جذباتی انداز میں طے مت کرو۔ ایک مرتبہ اپنے دل و دماغ سے رجوع کرکے اچھی طرح سوچ لو کہ کن جذبوں کا پلڑا بھاری ہے۔ ورنہ بعد میں تم اپنی پوری ہستی سمیت ڈول کر رہ جاؤگے۔''

وہ ہلکے سے ہنس دیا۔ پھر اطمینان سے بولا۔

''میری تھیوری آپ سے بہت مختلف ہے بھایا! یہی تو وہ رشتے ہوتے ہیں جنہیں جذباتی انداز میں طے کیا جانا چاہئے۔ ورنہ زندگی تو فوزیہ کے ساتھ بھی بہر طور گزر ہی جاتی۔''

''مگر اس جذباتیت میں تم یہ بات بھول رہے ہو کہ وہ لڑکی جو اس گھر کا حصہ بننے سے پہلے ہی ناپسندیدہ قرار پاگئی ہے وہ اس ماحول میں کیسے بس سکے گی؟ کیا مقام ملے گا یہاں اسے؟'' انہوں نے بڑے تحمل سے کہا تھا۔ مگر اس کے اطمینان میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

''ایسا کبھی بھی نہیں ہوا بھایا کہ مجھ سے منسلک کسی چیز کو اس گھر میں برداشت نہ کیا گیا ہو۔ اس کا مقام میں طے کروں گا۔''

''تو تم اسے برداشت کروانا چاہتے ہو؟ برداشت کرنے اور پسندیدہ ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔'' انہوں نے کہا تھا۔

''بے جی کا غصہ وقتی بات ہے بھایا! پتہ ہے جب میں نے بہت ضد کرکے ابا جی سے جرمن شیفرڈ منگوایا تھا تو بے جی کتنی خفا ہوئیں کہ گھر میں کتے موجود ہوں تو فرشتے نہیں آتے۔ مگر میری ضد کے آگے ہار مان گئی تھیں اور آج حویلی میں چار جرمن شیفرڈ رکھوالی کرتے ہیں۔''

وہ اپنے بچپن کا واقعہ یاد کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''انسانوں اور جانوروں میں بہت فرق ہوتا ہے وقار علی!'' انہوں نے اسے ٹوک دیا تھا۔

''وہ ایک پڑھی لکھی اور سمجھدار لڑکی ہے۔ اسے دلوں میں جگہ بنانی آتی ہے۔ بے جی بھی اسے ناپسند نہیں کریں گی۔''

وہ بے حد مطمئن تھا لیکن وہ اس کی طرح دل سے نہیں بلکہ دماغ سے کام لینے کے عادی تھے۔

''فوزیہ بے جی کی سگی بھانجی ہے اور ابا جی کی بھتیجی بھی۔''

''تابندہ میری پسند ہے۔ اب میں بے جی کی بھانجی اور ابا جی کی بھتیجی کے چکر میں اپنی لائف تو برباد نہیں کروں گا۔'' وہ صاف گوئی سے بولا تھا۔

''پھر بھی وقار! میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ تم ایک مرتبہ پھر اپنے فیصلے کو ٹھونک بجا کر دیکھ لو۔ اگر تمہاری پسند ہے تو تابندہ ضیاء یقیناً ایک بہترین لڑکی ہوگی۔ مگر یہاں حالات اس کے حق میں بالکل بھی نہیں۔ اور جس سے محبت کرتے ہوں اسے آزمائشوں کی تپتی بھٹی میں لا کھڑا کرنا کہاں کا انصاف ہے؟'' بھایا نے بے حد سنجیدگی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

”مجھے اس فیصلے کو ٹھونکنے یا بجانے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں بھایا! کیونکہ میں جانتا ہوں میرا یہ فیصلہ بالکل بے عیب ہے اور جہاں تک بات ہے آزمائشوں کی تو بھایا! اس بھٹی میں تپ کر محبت کندن بن جایا کرتی ہے۔“ وہ معنی خیز لہجے میں کہتا تیز قدموں سے حویلی کے بلند و بالا بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گیا تو وہ گہری سانس لے کر افسردگی سے بولے۔

”اور کبھی کبھی راکھ بھی۔“

✡......✡

اس پر تمام تر سختی آزما کر دیکھ لی گئی تھی۔ صرف ہاتھ اٹھانے کی کسر باقی تھی۔ مگر تابندہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔

پچھلے ایک ہفتے سے وہ اپنے کمرے میں مقید تھی۔

امی کا خالہ کو چند ماہ بعد شادی کی تاریخ دینے کا پکا ارادہ دیکھ کر مجبوراً انہیں تابندہ اور وقار علی کی حقیقت بتانا پڑی تھی۔ ان کا ہاتھ بے اختیار کلیجے پر جا پڑا۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ ان کی اس قدر با اعتبار بیٹی ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہ کھیل کیسے کھیل سکتی تھی؟ مگر جب تابندہ نے بہت پُر اعتماد انداز میں اس جرم کا اعتراف کیا تو وہ اس پر الٹ پڑی تھیں۔

”یہ میری زندگی ہے اور مجھے اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔“ وہ ذرا بھی نہیں گھبرائی تھی۔

اسے معلوم تھا کہ ان لوگوں کا غصہ وقتی ہوگا۔ ان کی بے پایاں محبتوں ہی نے تو اسے پُر اعتماد بنا رکھا تھا۔

مگر جب یہ بات ابو کے کانوں تک پہنچی تو ان کے غصے کی کیفیت لحظہ بھر کو اسے بھی دہلا گئی۔ سدا کے حلیم الطبع ضیاء احمد کا روپ اس سمے تابندہ کو بہت اجنبی لگا تھا۔

”جو فیصلہ ایک مرتبہ ہو چکا تم اسے کسی طور بدل نہیں سکتیں۔“

”مگر یہ میرا حق ہے۔“ وہ مدھم انداز میں بہت جرأت کے ساتھ بولی تھی۔

”اور ہم...... ہمارا کوئی حق نہیں ہے تم پر؟“ امی بھڑک اٹھی تھیں۔ پھر وہ سارا دوش ابو کو دینے لگیں۔ ”میں کہتی تھی ضیاء صاحب! لڑکی ذات ہے۔ اسے اتنا سر پر مت چڑھاؤ۔ اتنا اعتماد مت دو کہ کل کو یہ منہ کو آنے لگے۔“

”لڑکی ہے تو کیا ہوا ثریا بیگم! بیٹی بھی تو تھی۔ اس پر اعتبار کر کے اسے اعتماد نہ دیتا تو اور کیا کرتا؟“ وہ بھی ڈھے سے گئے تھے۔

وہ عقلمند ہوتی تو ان کے اس جملے کا بوجھ نہ سہار پاتی۔ اس کا سر ان کی محبت اور مان کے سامنے سدا کے لئے جھک جاتا۔ مگر جو شخص اپنے مفاد کے لئے اندھا ہو رہا ہو وہ ہر بات میں سے اپنی پسند کا مطلب نکالتا ہے۔ تابندہ بھی نفسی طمع کا شکار ہو گئی تھی۔

”میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا جس سے آپ کے اعتبار کو کوئی ٹھیس پہنچنے کا خدشہ ہو۔ میں نے صرف اپنا حق استعمال کیا ہے جو کہ مجھے میرے مذہب نے دیا ہے۔“

”بکواس مت کرو۔ اب بھی اعتماد و اعتبار کی بات کرتی ہو۔ ماں باپ کے فیصلے کے خلاف سر اٹھا کر کھڑے ہونے کو تم اپنا حق کہتی ہو۔“ امی بھڑک اٹھی تھیں۔

”تو اس میں غلط بات کیا ہے؟ کیا شریعت کی رو سے مجھے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ میں اپنی پسند آپ کو بتا سکوں؟“ اسے بھی غصہ آ گیا تھا۔

”لعنت ہے تم پر تابندہ! ہم نے تمہارے لئے کیا کوئی غلط شخص چنا ہے جو تم اس کے مقابلے میں اس راہ چلتے کو لے آئیں؟ شریعت اس بات کی اجازت دیتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر کوئی اس حق کو اس قدر آزادی سے استعمال کرنا شروع کر دے۔ اگر ہم تمہارے لئے کچھ غلط سوچتے تب تم یہ حرکت کرتی بھی اچھی لگتیں۔“

امی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کی تکہ بوٹی ہی کر ڈالتیں۔ اتنے عرصے تک تماشا دیکھتے رہنے کے بعد کیسے عین وقت پر اسے شریعت کی اس شق سے فائدہ اٹھانا یاد آیا تھا۔ یعنی اگر وقار علی نہ ملتا تو احسن ہی بہتر تھا اور اب جبکہ احسن کے مقابلے میں چوائس تھی تو اسے اپنا شرعی حق یاد آ گیا تھا۔

”آپ جو بھی کہیں مگر میرا پہلا و آخری فیصلہ یہی ہے کہ میں کسی طور بھی احسن سے شادی نہیں کروں گی۔“ وہ بے حد خود سری سے بولی تو ابو ڈھے سے گئے۔

”اسے لے جاؤ۔ میری نظروں سے دور لے جاؤ اسے۔ میں اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔“

وہ بے یقینی سے انہیں دیکھے گئی تھی۔

کس قدر چاہتے تھے وہ اسے۔ اس کی ہر بات منہ سے نکلتے ہی پوری کر دینے پر ایمان رکھتے تھے۔ اور آج؟

وہ اپنے کمرے میں آ کر کتنی ہی دیر روتی رہی تھی۔

اور پھر سوچیں۔ امی ابو کا رویہ، اس کے دل کو بھی پتھر کرنے لگا تھا۔ ہر سوچ منفی طرز اختیار کر رہی تھی۔

”انہیں میری خوشی کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ وہ مجھ سے اپنی محبتوں کا خراج چاہتے ہیں۔ اپنے احسانات کا تاوان مانگ رہے ہیں۔ مگر میں کسی طور اپنے دل کو نہیں مار سکتی۔“

اس کی سوچیں سلگ رہی تھیں۔

اک ذرا سی رنجش سے
شک کی زرد ٹہنی پر پھول بدگمانی کے
اس طرح سے کھلتے ہیں
زندگی سے پیارے بھی
اجنبی سے لگتے ہیں

اور ابھی ابھی رخشی دھیمے لہجے میں اسے بتا کر گئی تھی کہ امی نے خالہ کو منگنی کی بجائے شادی کی تاریخ طے کرنے کے لئے بلایا ہے تو اس کے اندر جیسے ایک الاؤ سا دہک اٹھا تھا۔

رات سب کے سو جانے کا یقین کر لینے کے بعد وہ بہت احتیاط کے ساتھ فون اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے وقار علی کا موبائل نمبر ملایا تھا۔

”ہیلو!“

کافی دیر کے بعد اس نے کال اٹینڈ کی تو اس کی نیند سے بوجھل آواز تابندہ کے وجود میں کرنٹ سا دوڑا گئی۔

”میں...... تابندہ......“ وہ دھیمی آواز میں بولی تو لحظہ بھر کی خاموشی کے بعد وہ بے حد مسرت سے بولا۔

”خدا کا شکر ہے کہ تمہیں بھی میری یاد آئی۔ میرے پاس تو تمہارا فون نمبر بھی نہیں تھا کہ یہاں سے بات ہی کر لیتا۔ کیسی ہو؟“ اس کا اپنائیت بھرا لب و لہجہ تابندہ کا ضبط چھلکانے لگا۔ بہت ضبط کے باوجود بھی اس کی آواز بھر آ گئی تھی۔

”ٹھیک ہوں۔“

”کیا بات ہے تابی! کیا ہوا ہے؟“

اتنا تو اسے جان ہی گیا تھا کہ اس کے لب و لہجے کے اتار چڑھاؤ سے اس کی کیفیت سمجھ لیتا۔ بے تابی سے پوچھنے لگا۔

”یہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں وقار! سب مجھ سے خفا ہو گئے ہیں۔ میں نے احسن سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔“ وہ روہانسے لہجے میں بولی تو وہ پُر جوش ہوا تھا۔

”ویلڈن تابندہ! بس اب چند دنوں کی بات ہے۔ میں بھی گھر میں تمہاری بات کر چکا ہوں۔ انشاء اللہ جلد ہی بے جی کو تمہارے گھر بھیجوں گا۔“

”میں بہت پریشان ہوں وقار! ابو مجھ سے بہت سخت ناراض ہیں۔ پورا ایک ہفتہ ہو گیا ہے انہوں نے مجھ سے بات تک نہیں کی۔“ وہ رو پڑی تھی۔

”تابی پلیز، خود کو سنبھالو یار۔ سب کی ناراضگی وقتی ہے۔ جب یہ لوگ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ خوش اور مطمئن دیکھیں گے تو خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔“ وہ اسے حوصلہ دینے لگا۔

”تم پلیز جلدی کرو وقار! امی ایک دو دن میں خالہ سے بات کرنے والی ہیں۔ اگر ایک مرتبہ شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی تو پوری فیملی کو پتہ چل جائے گا۔ دیر کرو گے تو مجھے ہمیشہ کے لئے کھو دو گے۔“

حالات کی سنگینی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے شرم و حیا کو پس پشت ڈال کر اسے وارن کیا تھا۔ وہ بے اختیار اسے ٹوک گیا۔

”ایسا مت کہو تابی! صرف دو دن...... دو دن انتظار کرو۔ اگر تم وہاں پرابلم میں ہو تو میں بھی یہاں پھولوں کی سیج پر نہیں سو رہا۔ مجھے بھی تمہارے لئے جنگ لڑنا پڑ رہی ہے۔ مگر میرا یقین ہے کہ جیت ہماری ہی ہوگی۔“

اس کا پُر اعتماد لہجہ تابندہ کو بھی حوصلہ بخش گیا تھا۔

”تم پر یقین کر کے ہی تو اس خارزار پر چل پڑی ہوں وقار! بس تم کبھی میرا یہ یقین، یہ مان مت توڑنا۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی تو وہ بے حد جذباتی ہونے لگا۔

”تم تو میری جان ہو تابی! تمہاری محبت پر فخر ہے مجھے۔ بس یہ چند دنوں کی آزمائشیں ہیں۔ تمہارے تمام خار میں اپنی پلکوں سے چن لوں گا۔ اور یاد رکھنا تابی! ہم دونوں ایک دوسرے کا یقین بھی ہیں، مان بھی اور اعتبار بھی۔ کبھی سوچنا بھی نہیں کہ تمہارا وقار علی بدل جائے گا۔ تمہیں پا کر ہی تو میرے روم روم میں زندگی کا احساس متحرک ہوا ہے۔ اور کوئی بھلا اپنی زندگی سے منہ کیسے موڑ سکتا ہے؟“

فون رکھنے کے بعد بھی کتنی ہی دیر سرشاری وہ اس کے لفظوں کے ساحرانہ حصار میں مقید رہی تھی۔

سامنے موجود تمام مشکلات اس کی محبت کے آگے ہیچ لگنے لگیں۔ اس قدر چاہنے والے شخص کو احسن جیسی دبی دبائی خاموش سی شخصیت کی خاطر ٹھکرانا اسے سخت بے وقوفی لگی تھی۔

''ٹھیک کہتا ہے وقار۔ جب امی ابو مجھے خوش وخرم دیکھیں گے تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔ اور پھر یوں بھی بچوں کی خوشی میں ہی والدین کی خوشی ہوتی ہے۔ آج تک وہ میری ہر خواہش پوری کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ تو پھر میری زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔''

آگے کی تمام منزلیں اسے بے حد آسان دکھائی دے رہی تھیں۔

گہری سانس لیتے ہوئے طمانیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ وہ ریسیور اٹھا کر نمبر پش کرنے لگی۔ اس کی توقع کے عین مطابق فون احسن ہی نے ریسیو کیا تھا۔ رات کو خالہ جان کی ڈسٹربنس کے خیال سے وہ ٹیلی فون سیٹ اپنے کمرے میں رکھ لیتا تھا۔

''میں تابندہ بول رہی ہوں۔'' اس کی آواز سنتے ہی تابندہ نے بلا تمہید کہا تو دوسری طرف یقیناً وہ حیران ہو اٹھا تھا۔

''خیریت تو ہے نا؟''

''میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''اس وقت؟'' اس کی تحیر میں ڈوبی آواز ایئر پیس میں گونجی تو وہ جھلا کر بولی۔

''ابھی کیا میرا دماغ خراب ہوا ہے۔ صبح۔''

''بات کیا ہے تابندہ؟ ابھی کیا فون پر نہیں بتا سکتیں؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''یہ فون پر کرنے والی بات نہیں ہے۔ تم سیدھی طرح بتاؤ کل آ رہے ہو یا نہیں؟'' اس نے قدرے تیز لہجے میں پوچھا تو وہ ہمیشہ کی طرح اس کے لب و لہجے سے خائف ہو گیا۔

''او کے...... او کے، میں کل آ جاؤں گا۔''

''صبح سویرے ہی مت آ جانا۔ دس بجے کے بعد آنا۔ جب ابو آفس جا چکے ہوں۔'' تابندہ نے اسے یاد دہانی کرائی تھی۔

''کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے نا؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ تابندہ کو کوفت ہونے لگی۔

''فی الحال تو نہیں ہے۔ البتہ کل کا کچھ پتہ نہیں۔ تم آؤ گے تو ہی کچھ کلیئر ہو گا۔''

''او کے، میں ساڑھے دس بجے تک آؤں گا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ تابندہ نے الوداعی کلمات کی ادائیگی کا تکلف کئے بغیر ریسیور رکھ دیا۔

وہ سوا دس بجے ناشتے کی میز پر پہنچی تو ابو آفس اور رخشی کالج کے لئے روانہ ہو چکی تھیں۔ امی اسے دیکھ کر اٹھیں اور کچن میں چلی گئیں۔ وہ ان کی بے اعتنائی پر کڑھ کر رہ گئی۔ کپ اپنی طرف گھسیٹ کر وہ اس میں چائے انڈیلنے لگی۔ اس کے دل پر عجیب سی کثافت جم رہی تھی۔ یہی وہ میز تھی جہاں پر ناشتے اور کھانے کے اوقات میں ہمیشہ تابندہ کا انتظار کیا جاتا تھا اور اب......''

اس نے دکھ سے سوچتے ہوئے کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ اسی وقت احسن چلا آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بے اختیار پوچھنے لگا۔

''خیریت تو ہے نا؟'' اس نے کنکھیوں سے کچن کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا۔

''یہاں نہیں، کہیں باہر چل کے بات کرتے ہیں۔ تم امی سے اجازت لو۔ میرا نام مت لینا۔''

وہ بے حد الجھ گیا تھا۔ بھلا تابندہ کو کسی کام کے لئے یوں سفارش کرانے کی ضرورت ہی کب پیش آئی تھی۔ اسے تو سب کچھ کرنے کی آزادی تھی۔

بہر حال وہ تابندہ کی خفگی کے پیش نظر ہمیشہ کی طرح فوراً اس کے حکم کی تعمیل میں اٹھ گیا تو وہ چائے یونہی چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کی توقع کے مطابق تھوڑی ہی دیر میں امی اس کے کمرے میں آئی تھیں۔

''احسن آیا ہے۔ تمہیں ساتھ لے جانے کا کہہ رہا ہے۔ میں نے اسے اجازت دے دی ہے۔ اب تم ذرا اپنے حواس میں رہنا۔ اس سے کوئی الٹی سیدھی بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اس رشتے سے متعلق تمہاری رائے جاننا چاہتا ہو۔ کوئی بھی فیصلہ کرتے ہوئے اپنے والدین کی عزت کو ضرور دھیان میں رکھنا۔'' وہ سرد لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ انہیں اندازہ بھی نہیں تھا کہ احسن بے چارہ تو خود اس کی ایک فون کال پر دوڑا چلا آیا تھا۔ ان کے جواب میں وہ بالکل خاموش رہی تھی اور اس کی اس خاموشی ہی نے ان کو شاید قدرے مطمئن کر دیا تھا۔

''اپنا حلیہ ٹھیک کر و پھر جانا کہیں۔'' وہ کہتی ہوئی چلی گئی تھیں۔

تابندہ نے جلدی سے کپڑے تبدیل کئے اور بیگ کھول کر اپنا والٹ چیک کرنے لگی۔

''ہو سکتا ہے کہ واپسی پر پیدل ہی آنا پڑے۔'' وہ بڑبڑائی تھی۔ پھر اپنی سوچ پر خود ہی ہنس دی۔

رات وقار علی سے ہونے والی بات چیت نے اسے بہت مطمئن کر دیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے منزل بس چند قدموں کے فاصلے پر رہ گئی ہو اور یہ ایک بہت جانفزا احساس تھا جو اسے اندر تک ہلکا پھلکا کر گیا تھا۔

''چلیں۔'' اس نے امی کے ساتھ باتوں میں مصروف احسن سے کہا تو وہ فوراً اٹھ گیا۔ امی کی تنبیہی نظریں تابندہ کو بہت اچھی طرح سمجھ میں آ رہی تھیں۔ وہ ان کی طرف توجہ دیئے بغیر احسن سے پہلے باہر نکل گئی۔

''تم تو جانتے ہی ہو کس قدر ضدی ہے یہ۔ بس غلطی ہو گئی لاڈ پیار نے اسے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ کچھ الٹا سیدھا بکے تو دھیان مت دینا۔'' امی نے دبے لفظوں میں احسن سے کہا تو وہ یونہی اثبات میں سر ہلاتا تابندہ کے پیچھے باہر نکل گیا۔

''کہاں جانا ہے؟'' گاڑی گیٹ سے باہر لاتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

''کہیں بھی۔ جہاں اطمینان سے بات ہو سکے۔'' وہ آرام سے بولی تو وہ دل ہی دل میں حیران ہو کر رہ گیا۔ آج تک کبھی تابندہ نے خود سے یوں کہیں چلنے کی بات نہیں کی تھی۔ وہ تو رات اس کا فون پا کر ہی متحیر رہ گیا تھا۔ اور پھر جس انداز میں تابندہ نے اس سے بات کی تھی اس نے باقی رات کی نیند آنکھوں سے اڑا کے رکھ دی۔ جانے کس طرح وہ صبح کا انتظار کر پایا تھا اور صبح اس کے دیئے گئے ٹائم سے چند منٹ پہلے ہی وہ اس کے سامنے موجود تھا۔ اور تب سے اب تک وہ ہر پل اسے حیرت زدہ کر دینے کا تہیہ کئے بیٹھی تھی۔ وہ قیاس کے گھوڑے دوڑاتا ایک اچھے سے ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی پارک کرنے لگا۔

''یہاں ٹھیک ہے؟'' انجن آف کرتے ہوئے وہ تائید طلب نظروں سے تابندہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بری طرح چونک گئی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔''

''کیا بات ہے تابندہ! پریشان ہو؟'' وہ مخصوص مشفقانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''مجھے کیا ہونا ہے۔ بالکل ٹھیک ہوں میں۔'' وہ بیزار کن لہجے میں کہتی دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی تو احسن نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ گاڑی لاک کرتا وہ اس کے ساتھ ریسٹورنٹ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ایئر کنڈیشنڈ ہال میں پُرسکون خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ نیم تاریک ماحول کی خنکی بہت جانفزا اثر پیدا کر رہی تھی۔ چار پانچ میزوں کے علاوہ ریسٹورنٹ لوگوں سے خالی تھا۔

''اس طرف کارنر میں۔'' تابندہ نے کہا تو وہ اس کے ساتھ کارنر والی میز پر آ گیا۔

''کیا لوگی؟'' بیٹھتے ہی وہ پوچھنے لگا تو تابندہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں یہاں تم سے کچھ بات کرنے آئی ہوں اور بس۔''

''باتیں تو ساری عمر اب ہوتی رہیں گی۔ تم یوں فرمائش کر کے میرے ساتھ پہلی مرتبہ آئی ہو۔ اچھا میں تمہارے لئے مینگو شیک منگوا لیتا ہوں۔ تمہیں بھی پسند ہے۔'' احسن کے موڈ میں یہ خوشگوار سی تبدیلی تابندہ نے پہلی بار محسوس کی تھی۔ مگر اس نے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا اور اپنی گود میں رکھے بیگ کے اسٹریپ سے کھیلتی رہی۔

ویٹر کو آرڈر دینے کے بعد وہ میز پر بازو ٹکاتا پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''اب بتاؤ، کیا پریشانی تھی جو رات اتنی لیٹ تمہیں میرا خیال آ گیا؟''

''کتنی بار کہوں احسن! میں پریشان نہیں تھی۔'' وہ قدرے جھنجلا کر بولی مگر وہ بے حد تیقن بھرے لہجے میں بولا۔

''ابھی تو میں یہ جملہ تمہارے چہرے کو دیکھ کر کہہ رہا ہوں تابندہ! لیکن رات جب فون پر صرف تمہاری آواز سنائی دے رہی تھی تب بھی مجھے بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ تم کسی پرابلم کا شکار ہو۔''

اس کے انداز پر تابندہ جز بز ہونے لگی۔ پھر آہستگی سے بولی۔

''تمہارا اندازہ ٹھیک ہے۔''

''کیا بات ہے؟'' وہ بھی متفکر ہونے لگا۔ مگر تابندہ کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ویٹر آ کر آرڈر سرو کرنے لگا تھا۔

''اب بتاؤ، کیا ہوا ہے؟'' ویٹر کے ہٹتے ہی احسن کے صبر کا پیمانہ جیسے لبریز ہونے لگا۔

''احسن! بات یہ ہے۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ تب اسے احساس ہوا کہ بات سوچنا بہت آسان ہے مگر کسی کے منہ پر کہنا بہت مشکل کام تھا۔

''احسن! میں شروع ہی سے اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ خدا نے ہر کسی کے لئے اس کا جیون ساتھی اس دنیا میں اتار رکھا ہے۔ کسی کو جلد تو کسی کو بدیر۔ مگر یہ جیون ساتھی ضرور مل جاتے ہیں اور اگر کبھی کبھار ہم اپنی بے وقوفی یا پھر ناسمجھی میں کسی غلط شخص کو چن لیتے ہیں تو قدرت ایسے وقت میں ہماری مدد کرتی ہے۔ ہمیں اس انجان راہ سے ہٹا کر ایک ایسا سنگ میل دکھاتی ہے جو ہمیں ہماری منزل تک پہنچانے میں مدد دیتا ہے۔'' وہ کہتے ہوئے رکی اور گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔ کہنی میز کی سطح پر ٹکا کر بند مٹھی ہونٹوں پر جمائے وہ بغور اسے دیکھ اور سن رہا تھا۔ تابندہ اس سے نظریں چرا کر میز کے وسط میں رکھے خوبصورت کرسٹل کے گلدان کو دیکھنے لگی جس میں

زندگی سے بھرپور سرخ وسفید گلاب رنگینی بھر رہے تھے۔ وہ مجرمانہ انداز میں پھر سے گویا ہوئی۔

''لیکن اس میں انسان کا کوئی قصور نہیں ہوتا احسن! ہوتا وہی ہے جو لوحِ محفوظ پر دستِ قدرت لکھ چکا ہے۔ انسان اپنی لاکھ کوشش کر کے دیکھ لے مگر وہ صرف ارادے باندھ سکتا ہے۔ جتنی جی چاہے چالیں چل سکتا ہے کیونکہ قدرت نے اسے یہ اختیار دے رکھا ہے۔ مگر انجام ہمیشہ اوپر والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور ہم لوگ بنا سوچے سمجھے اس سے شکوے شکایات کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ملتا تو وہی ہے جو قسمت میں لکھا ہو اور ضروری تو نہیں احسن کہ ہر پسندیدہ چیز انسان کو حاصل بھی ہو جائے۔'' وہ تائید طلب انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

''ہوں......'' وہ مبہم سے انداز میں بولا۔ پھر گہری سانس بھر کے یونہی ریسٹورنٹ میں نگاہ دوڑانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں اترتی مضطربانہ کیفیت تابندہ کو بہت شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

''محض کسی کو پالینا میرے نزدیک محبت نہیں ہوتی احسن! محبت میں تو کسی کو دل وجان سے پانا پڑتا ہے۔ اور جہاں دل میں کسی اور کی تصویر ہو اور نصیب کسی اور سے جڑ جائے تو وہاں صرف تعاون ہی ہوتا ہے، محبت نہیں۔''

وہ آہستہ آہستہ اپنے مقصد کی طرف آ رہی تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ سامنے بیٹھا شخص سوچ کی کن گہرائیوں سے ہو آیا تھا۔ اس کے رکتے ہی احسن نے آہستگی سے چہرہ گھما کر اسے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں اترتی خفیف سی سرخی تابندہ سے مخفی نہیں رہ سکی تھی۔

''کیا نام ہے اس کا جس سے تم محبت کرتی ہو؟'' اس کا سوال اس قدر اچانک اور حیرت زدہ کر دینے والا تھا کہ تابندہ جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی۔

***

''زارا کے آغا جان کی طبیعت بہت سخت خراب ہے۔ ہارٹ اٹیک ہوا ہے انہیں۔ اسی وجہ سے وہ تین دنوں سے یونیورسٹی نہیں آ رہی۔'' ثمین نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ آ کر بتایا تو وہ دونوں بھی سخت پریشان ہو گئیں۔

''اوہ گاڈ! اور ہم لوگوں کو پتہ بھی نہیں۔'' شفق تاسف سے بولی۔

''تمہیں کس نے بتایا؟'' صبیرہ نے پوچھا۔

''ابھی ایڈی سے پتہ چلا ہے۔ وہ وہیں تھا ثوبان کے ساتھ۔'' اس نے کہا تو وہ چپ ہو گئی۔

''ہمیں بھی جانا چاہئے وہاں۔ کون سے ہسپتال میں ہیں وہ؟''

''ابھی ایڈی اور فرحان جا رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اگر ہم لوگ ان کے ساتھ جانا چاہیں تو چلیں۔ ان کے پاس گاڑی ہے۔''

''ہم لوگ خود سے چلے جائیں گے۔'' صبیرہ نے سب سے پہلے انکار کیا تھا۔

''ایڈی کو ہسپتال اور روم نمبر دونوں کا پتہ ہے۔ اور پھر ان لوگوں کے ساتھ ہم آسانی سے واپس بھی آ سکتی ہیں۔'' ثمین نے اس کا اعتراض مسترد کر دیا تھا۔

''اس میں حرج بھی کیا ہے۔ یوں بھی گاڑی یقیناً فرحان کی ہو گی۔'' شفق نے بھی ثمین کی تائید کی تھی۔ پھر فوراً ہی خیال آنے پر سنجیدگی سے بولی۔ ''تم شاید ایڈی کی وجہ سے انکار کر رہی ہو۔ مگر یہ بھول رہی ہو کہ ہم لوگ اس کے ساتھ کسی تفریح پر نہیں بلکہ زارا کے آغا جان کی عیادت کو جا رہی ہیں۔''

''چلو اب جلدی کرو۔ وہ لوگ نکلنے والے ہیں۔'' ثمین نے بعجلت کہا تو دل پر جبر کرتے ہوئے صبیرہ کو بھی ان کے ساتھ چلنا پڑا۔ مگر گیٹ سے کچھ دور ہی ایڈی مل گیا۔ انہیں دیکھ کر وہ رک گیا تھا۔

''کدھر جا رہی ہو؟'' وہ ثمین سے پوچھنے لگا۔

''تم لوگ ہسپتال جا رہے ہو تو ہمیں بھی لے جاؤ۔'' وہ بولی تو اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''آئی ایم سوری۔ مگر گاڑی میں جگہ نہیں ہے۔''

''مگر ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تم لوگ بھی آ جاؤ۔'' ثمین نے احتجاج کیا تھا۔

''وہ تب کی بات تھی۔ اب بھی میں ہی کہہ رہا ہوں کہ جگہ نہیں ہے۔ میں تم لوگوں کو کل لے چلوں گا۔'' وہ بالکل سنجیدہ تھا۔ صبیرہ سلگ اٹھی۔ یقیناً اسے ان دونوں کے ساتھ دیکھ کر یہ پروگرام بدلا گیا تھا۔ کنسرٹ والی رات اس کے ساتھ جو نہیں گئی تھی۔

''ہم لوگ خود بھی تو جا سکتی ہیں ثمین!'' وہ رہ نہیں سکی تھی۔ ایڈی نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا اور قدرے تمسخرانہ انداز میں بولا۔

''آپ کے لئے تو خدا کی پوری زمین پڑی ہے، جہاں جی چاہے جائیں۔ کون روک سکتا ہے۔'' اس کے انداز نے صبیرہ کو تپا ڈالا تھا۔

''شٹ اپ! میں تم سے بات نہیں کر رہی۔''

''میں بھی جنرل بات کر رہا ہوں۔'' وہ اسے چڑانے والے انداز میں بولا پھر اس کے مزید الجھنے سے پہلے شفق اور ثمین سے کہنے لگا۔ ''میں واقعی چاہتا ہوں کہ تم لوگ کل ہی ہسپتال جاؤ۔ میں پہلے دیکھ آؤں۔''

''او کے۔'' شفق فوراً مان گئی تھی۔

''کچھ تو وجہ ہو گی آج نہ جانے کی۔'' ثمین نے الجھ کر اسے دیکھا تو وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔

''میں کہہ رہا ہوں کیا یہ کافی نہیں ہے؟''

''ہنہ......'' صبیرہ کے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی تھی۔ وہ سخت ناگواری سے پاؤں پٹختی واپس مڑ گئی۔ شفق اسے پکارتے ہوئے اس کے پیچھے لپکی تھی۔

''دماغ خراب ہے اس لڑکی کا۔'' ایڈی زیر لب بڑبڑایا تو ثمین نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اب بتاؤ یہ پروگرام میں تبدیلی کیسے آئی؟''

''ایک تو تم لڑکیاں بھی نا۔'' وہ قدرے جھنجلایا تھا۔ پھر تیز لہجے میں کہنے لگا۔ ''ابھی شہباز کا گروپ جا رہا ہے۔ تم لوگوں کو کیسے لے جاؤں؟''

''تو ہم الگ سے بھی تو جا سکتی ہیں۔ اس پر پابندی کیوں؟'' ثمین نے جرح کی تو وہ تاسف سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

''تم بھی عقل کی پوری ہو۔ بتا تو رہا ہوں کہ وہاں صرف لڑکے ہی ہوں گے۔ ثوبان نے زارا اور آنٹی کو بھی گھر واپس بھیج دیا ہے۔ وہ صرف رات کو آتی ہیں۔ ایسے میں تم لڑکیوں کا وہاں کیا کام ہے؟ اسی لئے کہہ رہا تھا کہ کل چلی جانا۔ آنٹی اور زارا بھی موجود ہوں گی۔''

''تو یہ بات تم صبیرہ اور شفق کے سامنے بھی بتا سکتے تھے۔''

ثمین نے مطمئن ہوتے ہوئے اسے گھورا تو وہ گہری سانس کھینچتے ہوئے تاسف سے سر ہلانے لگا۔

''ابھی میں اس مس لبرٹی کے سامنے بتاتا تو وہ فوراً ہسپتال جانے کو تیار ہو جاتی کہ اگر لڑکے جا سکتے ہیں تو لڑکیاں کیوں نہیں؟ اسے سمجھانا بہت مشکل ہے۔''

''واقعی، یہ بات تو ہے۔ اسے سمجھانا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔'' ثمین نے معنی خیزی سے کہا تو وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ بس مددِ خدا ہونی چاہئے۔''

''او کے، میں ذرا جا کے صبیرہ کا غصہ ٹھنڈا کرتی ہوں۔'' ثمین ہاتھ ہلاتی اندر کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ایڈی واپس گیٹ کی طرف پلٹ گیا۔

صبیرہ کو دیکھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کا موڈ واقعی خراب ہے۔ شفق شاید اس پتھر مزاج سے ماتھا چھوڑنے کے بعد ناکام ہو کر اب کتاب کھولے بیٹھی تھی۔ ثمین کو دیکھتے ہی اس نے شکایتاً کہا۔

''اس کو دیکھو، مجھ پر خفا ہو رہی ہے کہ ہمیں ایڈی کی بات ماننے کی کیا ضرورت تھی۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔ یوں اس کی ہاں میں ہاں ملانے کا کیا مطلب ہے۔ یونین کا صدر ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب ہمیں سانس لینے کے لئے بھی اس کی اجازت کی ضرورت محسوس ہونے لگے۔ اس کی تو مردانہ انا کو تسکین مل گئی ہو گی ہم پر حکم صادر کر کے۔'' صبیرہ پھٹ پڑی تھی۔

''دیکھا کس قدر منفی سوچتی ہے یہ لڑکی۔'' شفق کو اس کی شدت پسندی ہمیشہ کی طرح ذہنی خلجان میں مبتلا کرنے لگی تھی۔

''بات تو اس کی واقعی صحیح ہے شفق!'' ثمین نے قدرے پُرسوچ انداز میں کہا تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''اب دیکھو نا، ابھی وہ مجھے ساتھ ہسپتال چلنے کی آفر کر رہا تھا اور ابھی جب تم لوگ ساتھ تھیں تو اس نے انکار کر دیا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' شفق نہ سمجھنے والے انداز میں حیرانی سے پوچھنے لگی تو اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں اس نے صبیرہ کی وجہ سے۔''

''مگر وہ ایسا کیوں کرنے لگا؟'' شفق کو اس کی بات ہضم نہیں ہوئی تھی۔

''میں جانتی ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے۔'' صبیرہ نے تلخی سے بھرپور لہجے میں کہا۔ ''کنسرٹ والی رات میں نے اس کی ہوسٹل ڈراپ کی آفر کو ریجیکٹ کر کے یقیناً اس کی انا کو شدید چوٹ پہنچائی ہے۔ اسے کہاں عادت ہو گی لڑکیوں سے انکار سننے کی۔ اسی لئے اس گھٹیا طریقے سے مجھے جتانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''ہاں، یہی بات ہو گی۔'' ثمین نے بے ساختہ کہا تو شفق خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ گڑبڑا کر بولی۔ ''میرا مطلب ہے کہ اب اور تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی اس کے اس رویے کی۔''

''لیکن وہ تو کہہ رہا تھا کہ گاڑی خالی نہیں ہے۔'' شفق نے سوچ کر کہا تو وہ اسے یقین دلانے والے انداز میں بولی۔

''میں ابھی دیکھ کر آئی ہوں۔ گاڑی میں صرف ایڈی اور فرحان تھے۔''

''یہ شخص میری سوچ سے زیادہ گھٹیا ہے۔'' صبیرہ نے نفرت سے پُر لہجے میں کہا تو ثمین کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں جا رہی ہو؟''

''میں ذرا لائبریری تک جا رہی ہوں۔ ایک دو اہم بکس ایشو کروانی تھیں۔''

''جلدی آنا۔ پتہ ہے نا پھر پوائنٹ نہیں ملے گا۔'' صبیرہ نے کہا تو وہ سر ہلاتی چلی گئی۔

''تم نے کچھ عجیب سی بات نوٹ نہیں کی صبی؟'' شفق نے پُرسوچ انداز میں پوچھا تو وہ استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''آج پہلی مرتبہ ثمین یوں ایڈی کے خلاف بول رہی تھی۔''

''تو......؟'' وہ سمجھی نہیں تھی۔

''پتہ نہیں۔ بس مجھے بہت عجیب سا لگا۔ اس کی تو بہت پرانی فرینڈ شپ ہے ایڈی کے ساتھ۔ اس سے پہلے وہ سب سے زیادہ ایڈی کی حمایت کرتی تھی۔''

شفق خود بھی الجھن میں تھی۔

''ہم سب میں سے ثمین ہی ایڈی کو اچھی طرح جانتی ہے۔ ہم سے زیادہ ایڈی کی فطرت سے واقفیت اسی کو ہے۔ اب اگر وہ دوستی کے لحاظ میں کچھ نہ کہے تو الگ بات ہے۔ ورنہ جبر تو کسی سے بھی برداشت نہیں ہوتا۔'' صبیرہ نے اطمینان سے کہا۔

''ہوسکتا ہے کہ اسے ایڈی کی بات بری لگی ہو۔ مگر آج تک اس نے کبھی تمہارے سامنے ایڈی کی برائی نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ تم پہلے ہی اس سے بہت متنفر ہو۔''

شفق اپنی سوچ کو ٹھیک طرح سے الفاظ کا پیراہن پہنا نہیں پا رہی تھی۔

''بُرے کو ہر کوئی بُرا کہتا ہے شفق! اور مجھے خوشی ہے کہ ثمین نے دیر سے ہی سہی مگر ایڈی کی اصلیت جان تو لی۔'' صبیرہ نے اسی انداز میں کہا تو وہ گہری سانس لے کر بک بند کرتے ہوئے بیگ میں رکھنے لگی۔ مگر اس کے ذہن میں مسلسل ایک کریدسی جاری تھی۔ ثمین کے الفاظ اور چہرے کے تاثرات میں اسے کوئی تال میل دکھائی نہیں دیا تھا اور یہی بات اسے الجھا رہی تھی۔

⁂......⁂

''ایسے فیصلے ضد اور اکڑ میں نہیں کیے جاتے۔ اگر وہ بچکانہ پن دکھا رہا ہے تو ہمیں ہی عقل سے کام لینا چاہیے۔''

ابا جی انہیں سمجھا رہے تھے۔ مگر جب سے وقار علی نے تابندہ کے معاملے میں ہٹ دھرمی دکھائی تھی، بے جی کی ساری سوجھ بوجھ ان کے مزاج کی نرمی کے ساتھ کہیں دور جا سوئی تھی۔

''عقل ہی سے تو کام لے رہی ہوں۔ اب اتنا تو دماغ خراب نہیں ہے میرا کہ اسے اس کی مرضی پر بے لگام چھوڑ دوں۔ جانے کس چلتی پھرتی کو اٹھا کر ہمارے سروں پر لا بٹھائے۔'' وہ غصے سے بولیں تو بھایا نے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

''بے جی! آپ ذرا نرمی سے سوچیں گی تو اسے حق پر پائیں گی۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ ہے۔ اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ وہ لڑکی اس کے لئے بہتر شریک سفر ثابت ہوگی تو پھر ہم سب کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔''

''تم لوگوں کو بھلا کیا اعتراض ہونا ہے۔ اعتراض تو مجھے ہے۔ میں تو جیتے جی اپنی بہن کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔'' بے جی رونے لگی تھیں۔

ماحول کی کشیدگی بڑھنے لگی۔ صدیقہ آگے بڑھ کر بے جی کو تسلی دینے لگیں۔

''یہ صرف آپ کی سوچ ہے بے جی! ورنہ بی جان تو اب بالکل نارمل ہیں۔ غصہ تو انہیں بھی آیا تھا مگر وہ جانتی ہیں کہ زبردستی کے رشتے میں ان کی بیٹی کی زندگی برباد ہوسکتی ہے۔''

''تمہاری بھانجی ہے تو کیا میری بھتیجی نہیں ہے؟ مجھے بھی اتنا ہی دکھ ہے اس رشتے کے ختم ہونے کا۔ لیکن اپنے بیٹے کی ضد کو بھی تو جانتی ہو۔ وہ اپنے فیصلے سے نہیں ہٹنے والا۔'' ابا جی اپنے لاڈلے سپوت کی جذباتی طبیعت سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔

''تو کیا کروں؟ اسے اجازت دے دوں اپنی من مانی کرنے کی؟'' وہ پھٹ پڑی تھیں۔

''یہ بھی دے کر دیکھ لو۔ یہ تو پھر بھی اس میں لحاظ باقی ہے جو وہ اجازت مانگ رہا ہے۔ اگر بیاہ کر کے لے آتا تو ہم لوگ تب بھی کیا کر لیتے؟'' ابا جی نے اطمینان سے کہتے ہوئے حقے کا منہال منہ سے لگا لیا تو وہ ہول اٹھیں۔ پھر تنک کر کہا۔

''خیر اب اتنا بھی نافرمان نہیں ہے میرا بیٹا۔''

''اسی لئے تو کہتا ہوں کہ اس کی ضد کے آگے اپنی ضد کی دیوار مت کھڑی کرو۔ اس کی ضد مان لوگی تو ہمیشہ کے لئے تمہارا فرمانبردار بن جائے گا۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو ان کا دل پھر سے بھر آیا۔

''اتنی بڑی نافرمانی کے بدلے فرمانبردار بن کے کیا کمال دکھا لے گا وہ؟''

''بے جی پلیز۔ آپ جانتی ہیں اچھی طرح وقار کو۔ وہ صرف ضدی اور جذباتی ہے۔ نافرمان تو نہیں۔'' بھائی نے فوراً اس سر پھرے کی سائیڈ لی تھی۔

''بس تمہی لوگوں نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ میں تو پہلے ہی اس کی شہری نوکری کے خلاف تھی۔ اوپر سے یہ نیا تماشا شروع کر دیا اس نے۔'' بے جی چڑ گئی تھیں۔

''بے جی! اب آپ اس کی خوشی سے ہٹ کے فیصلہ تو نہیں کر سکتیں ناں۔ ماں کا دل تو اپنے بچوں کی خوشی ہی میں خوش رہتا ہے۔'' صدیقہ بھابی نے نپے تلے انداز میں اپنی رائے دی تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

یہ ٹھیک تھا کہ وقار کے فوزیہ سے شادی سے انکار کا انہیں شدید دکھ تھا مگر محض اپنی ضد میں آکر اپنے لاڈلے بیٹے کی زندگی برباد کرنا بھی انہیں منظور نہیں تھا۔ بھلا اسے ناشاد دیکھ کر ان کا دل شاد ہوسکتا تھا؟ کبھی نہیں۔

انہوں نے گہری سانس بھرتے ہوئے باری باری ان تینوں کے چہرے دیکھے تھے۔ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔

''اگر وقار علی کی خوشی کا فیصلہ ہوگا تو ساتھ ہی فوزیہ کے دُکھ کا مداوا بھی ہوگا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ سب حیران ہوئے تھے۔

''آپ ابھی اعزاز علی کو بلائیں۔ میں فوزیہ کے سلسلے میں اس کی رائے جاننا چاہتی ہوں۔ اگر وہ اس کے لئے راضی ہے تو مجھے بھی وقار علی کی شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔ مگر جب تک فوزیہ کا کوئی سبب نہیں بن جاتا میرے گھر میں بھی بہو نہیں آئے گی۔''

بے جی نے بہت سکون کے ساتھ فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ سب بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

⁂......⁂

وہ بہت بولڈ اور پُراعتماد لڑکی تھی اور احسن جیسے خاموش طبع شخص پر تو ہمیشہ ہی سے حاوی رہی تھی۔ مگر اس وقت احسن کے اس چھوٹے سے سوال کا جواب دینا تابندہ کو دنیا کا مشکل ترین کام لگا تھا۔ اسے لگا جسم کا تمام خون سمٹ کر چہرے پر آ گیا ہو۔

''محبت نہیں احسن!'' وہ بدقت تمام بول پائی تھی۔ ''اس کے ساتھ میری ذہنی مطابقت ہے۔ وہ میری پسند ناپسند، میری عادات، میری خامیاں خوبیاں سب جانتا ہے۔''

وہ کہتے کہتے رکی تھی پھر اس سے نظر ملائے بغیر مدھم لہجے میں بولی۔

''اور زندگی گزارنے کے لئے یہ سب بہت اہمیت رکھتا ہے کہ کوئی آپ کو جانتا ہو، اتنی گہرائی سے سمجھتا ہو کہ آپ کی محض آواز کا اتار چڑھاؤ ہی اسے آپ کے اندر کا پتہ دے جائے اور وہ ویسا ہی ہے۔'' وہ کہہ کر تھمی تو دونوں کے درمیان خاموشی کی دبیز فضا جم سی گئی۔

احسن کی بے یقینی اور حیرت اب ایک مسلسل اذیت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ سامنے بیٹھی یہ نازک و کومل سی لڑکی اس کی چاہتوں کا مرکز اور اس کی محبتوں کی امین تھی۔ مگر جانے یہ کیسی انکشافات کی آندھی تھی کہ ہر شے اپنے ساتھ اُڑا کر لے گئی تھی۔ اس نے سہمے ہوئے سے انداز میں اپنے دل کو ٹٹولا تو وہاں صرف درد ہی درد تھا۔

آرزو، ارمان، چاہت، مدعا کچھ بھی نہیں
تھا بہت کچھ پاس لیکن اب رہا کچھ بھی نہیں
کیسی کیسی قیمتی چیزوں سے اٹھا ہے حجاب
دوستی، دلجوئی، ہمدردی، وفا کچھ بھی نہیں

اس نے جلتی نگاہوں سے تابندہ کی طرف دیکھا جو اپنا تمام تر اضطراب اسے منتقل کر کے خود آرام سے بیٹھی تھی۔

''اب جب کہ تم اپنی زندگی کا نہایت بہترین فیصلہ کر چکی ہو تو مجھے یوں بلانے کا کیا مقصد ہے؟'' اس کے لہجے میں تلخی شعوری نہیں لاشعوری طور پر ہی اتر آئی تھی۔ زندگی کا حاصل ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہو تو کوئی کب تک شیریں گفتار رہ سکتا ہے۔ وہ بھی کرب و اذیت کے انتہائی مقام پر تھا۔

''گھر میں سب مجھ سے ناراض ہیں۔ کوئی بھی یہ بات سمجھنے کو تیار نہیں کہ اپنی زندگی کے اس اہم ترین فیصلے میں میری مرضی شامل ہونا کتنا اہم ہے۔ میں کوئی زمانہ جاہلیت کی عورت نہیں ہوں احسن! کہ جسے سب راضی برضا جا کر ریت میں دبا آئیں۔ میں احتجاج کا حق محفوظ رکھتی ہوں۔'' اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔

احسن نے اپنے دل کی اذیت کو کچھ اور بڑھتا محسوس کیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی ہمسفری کو وہ کیسی کریہہ و جاہلانہ رسم سے ملا رہی تھی تو گویا اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے فیصلے کو وہ اس درجہ بدتر گردانتی تھی۔ اس کی خالی نظریں تابندہ کے سرخ ہونٹوں پر تھیں۔ اسے یاد آنے لگا۔ ان ہونٹوں کا خم اسے کس قدر پسند تھا۔ مگر ان سے نکلنے والے یہ الفاظ کس قدر ظالم تھے۔ ہر لفظ قطرۂ تیزاب کی مانند دل و جاں کو تباہ کرتا چلا جا رہا تھا۔

''کوئی بھی میری بات نہیں مان رہا احسن! ایسے میں ایک تمہی ہو جو میری مدد کر سکتے ہو۔'' وہ بے بسی سے چور لہجے میں کہہ رہی تھی۔ مگر آج یہ پہلی بار تھا کہ جب احسن کو اس سے کوئی ہمدردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کس قدر سنگدلی کا مظاہرہ کر رہی تھی وہ۔

''میں؟''

''ہاں تم احسن! میں جانتی ہوں کہ تم کبھی بھی میرا ساتھ دینے سے انکار نہیں کرو گے۔'' وہ پُریقین لہجے میں بولی تو اسے اس لطیفے پر ہنسی آنے لگی۔

''اتنا جانتی ہو مجھے؟'' وہ عجیب سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے مترشح ٹوٹتی کیفیت تابندہ سے مخفی نہیں تھی۔ مگر اس پل تو وہ صرف اپنی دنیا بچانا چاہتی تھی۔ کچھ لمحوں کی دیر بھی سارا کھیل الٹ سکتی تھی۔

''اتنا تو جانتی ہی ہوں۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا پھر مجرمانہ انداز میں آہستگی سے بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم میرا ساتھ ضرور دو گے۔''

''کیونکہ تم جانتی ہو کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' وہ یکلخت ہی خود پر سے تابو کھو بیٹھا تھا۔ تلخی سے بھرپور مگر دبے ہوئے لہجے میں بولا تو لحظہ بھر ہی میں ہزاروں آندھیوں کا شور تابندہ کو چھو کر گزر گیا۔ مگر اسے معلوم تھا کہ اس وقت خود کو سنبھالے رکھنا ہی سب سے بڑی کامیابی تھا۔

''میں ایسا کچھ نہیں جانتی ہوں احسن!'' اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے تابندہ نے بہت مضبوط لہجے میں کہا تھا۔ ''میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ تم شروع ہی سے میرے بہت اچھے دوست رہے ہو اور بس۔''

''اور بس؟'' اس کی آنکھوں میں حسرت سی تھی۔

''یہ زبردستی کے سودے نہیں ہوتے احسن! تم تو خود محبت کے دعویدار ہو۔ اپنے ایمان سے بتاؤ، کیا تم اپنی محبت کھونے کا حوصلہ رکھتے ہو؟'' وہ بے اختیار کہہ گئی تھی۔ پھر اپنی بات غلط ہونے کا احساس ہوا تو روہانسی ہونے لگی۔

''میں اپنی مرضی، اپنی خوشی کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں احسن! اور زندگی کا حسن محبت میں چھپا ہے، کمپرومائز میں نہیں۔''

''تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' اب کی بار اس نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا تو وہ لحظہ بھر ہچکچانے کے بعد آہستگی سے بولی۔

''میں چاہتی ہوں کہ تم خود اس رشتے سے انکار کر دو۔''

لحاظ و مروت کی دیواریں منہدم ہو کر اجنبیت اور غیریت کا ڈھیر بن چکی تھیں۔

احسن کا دل چاہا اس کٹھور و سنگدل لڑکی کو جھنجھوڑ کر رکھ دے۔ مگر اس کی انا خود کو سمیٹے رکھنے کی متقاضی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کسی کے قدموں میں گر کر دل تک پہنچنے کا مقام حاصل نہیں کیا جا سکتا اور وہ زندگی بھر آئینے میں خود سے نظریں ملا کر زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اپنے مقام سے گرنا اسے قطعاً گوارہ نہیں تھا۔

تیری اس ادا سے بھی ہوں میں آشنا
تجھے جس پہ اتنا غرور ہے
میں جیوں گا تیرے بغیر بھی
مجھے زندگی کا شعور ہے
میں نکل کے یوں تیرے دام سے
نہ گروں گا اپنے مقام سے

''وقار اپنی امی کو ہمارے گھر بھیجنے والا ہے۔ مگر اس سے پہلے یہ تمام قصہ ختم ہو جانا چاہئے۔ میں چاہے جتنا بھی انکار کرتی رہوں، کوئی بھی نہیں سنے گا۔ امی تو یوں بھی ایک دو دن میں خالہ سے بات کرنے والی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم ان سے پہلے خالہ سے بات کر لو۔ کر لو گے نا احسن؟'' وہ آنکھوں میں آنسو بھرے، منت بھرے لہجے میں پوچھتی اس کے لئے امتحان بننے لگی۔

بچپن سے لے کر آج تک احسن اس کی کانچ کی گڑیا کی طرح حفاظت کرتا آیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آنسو ہمیشہ ہی اس کا دل بھینچ دیا کرتے تھے۔ اب بھی۔ ہاں اب بھی۔ اب جب کہ وہ ہر رشتہ، ہر بندھن توڑے جا رہی تھی۔

''تم انکار کر دو گے نا احسن؟'' اس کے آنسو اب رخساروں کو بھگونے لگے تھے۔

اس نے مانگا بھی جو ہم سے تو جدائی مانگی
اور اک ہم تھے کہ انکار نہ کرنا آیا

اس نے بمشکل اثبات میں سر ہلایا تو دل نے پہلو میں احتجاج کرنا شروع کر دیا۔ مگر کچھ بھی تو اپنے بس میں نہیں تھا۔

''تھینک یو احسن! تھینک یو ویری مچ۔'' وہ یکلخت ہی شبنم میں دھلے پتے کی طرح کھل اٹھی تھی۔

''تم اب جاؤ تابندہ!'' اس کا چہرہ بالکل سپید ہو رہا تھا اور آواز کسی بھی تاثر سے خالی تھی۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''آئی ایم سوری۔ میں تمہیں ڈراپ کرنے نہیں جاؤں گا۔ تم جاؤ۔'' وہ اسی بے تاثر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

تابندہ خاموشی سے اپنا بیگ سنبھالتی اٹھ گئی۔

احسن کی حسرت بھری نگاہ نے تاحد نگاہ اس کا پیچھا کیا تھا۔

'تو آج یہ باب بھی ختم ہوا احسن ملک۔' اس کا دل قطرہ قطرہ پگھلنے لگا تھا۔

⁂......⁂

وہ ڈرامہ دیکھ کر کامن روم سے آئی تو صبیرہ ابھی تک نوٹس سامنے رکھے سر کھپا رہی تھی۔

''تم پر بھی شفق کا اثر ہوتا جا رہا ہے۔ ہر وقت کتابوں کی دنیا میں کھوئی رہتی ہو۔'' ثمین نے اپنے بستر پر گرتے ہوئے اس پر چوٹ کی تھی۔

''تم دیکھ آئیں اپنا دھانسو سا ڈرامہ؟'' صبیرہ نے اس کے الفاظ دہرائے تو وہ جیسے آنکھیں موندے پھر سے انہی مناظر میں کھو گئی۔

''اُف یار! کیا رومانٹک ڈرامہ ہے۔ اس قدر نیچرل ایکٹنگ کہ ہائے۔'' اس کی سرد آہ پر صبیرہ کو ہنسی آ گئی۔

''ایکٹنگ تھی تو پھر نیچرل کیسے ہوئی؟ اور اگر نیچرل ہوتی تو تم اسے ایکٹنگ تو نہیں کہتیں۔''

''اُف۔'' ثمین نے اسے گھورا تھا۔ ''ایک تو تمہارا دماغ بہت تیز ہے۔''

''اگر یہ تعریف ہے تو شکریہ۔'' وہ نوٹس سمیٹتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

''بہت خوش ہو رہی ہو دوست کا دل جلا کر۔'' ثمین نے شکوہ کناں انداز میں کہا۔

''ایسا کبھی سوچنا بھی مت ثمین!'' صبیرہ نے فوراً اسے ٹوک دیا۔ ''میرے لئے دوستی بہت قیمتی اور انمول رشتہ ہے۔ دنیا میں ایک میری ماں ہے اور اس کے بعد تم تینوں۔''

''اور تمہارے ابو؟'' ثمین اس کے بارے میں صرف اسی کی ذات کی حد تک جانتی تھی۔ شفق اور زارا تو اس کی کالج فیلو بھی رہ چکی تھیں جب کہ ثمین سے اس کی دوستی یونیورسٹی میں آ کر ہوئی تھی۔ اس کے سوال پر صبیرہ کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔

''وہ جرمنی میں ہوتے ہیں۔''

''دراصل تم نے کبھی ان کا ذکر ہی نہیں کیا نا۔ اس لئے میرے بھی کبھی ذہن میں نہیں آیا کہ ان سے متعلق پوچھوں۔ ویسے ان کی نیچر کیسی ہے؟ تمہاری امی تو بہت سویٹ ہیں گریس فل پرسنالٹی۔'' ثمین اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔

اس کا حلق خشک ہونے لگا۔

یہ موضوع، کوئی اس کے دل سے پوچھتا کہ یہ موضوع اس کی ذات کو کیسے لمحوں میں بکھیر دیتا تھا۔ وہ جو خود کو اس قدر مضبوط بنائے پھرتی تھی، ایک یہ سوال اس کی پرتیں اتارتا چلا جاتا تھا اور اندر سے ایک ننھی اور سہمی ہوئی سی تشنہ لب صبیرہ نکل آتی۔ جو ہمیشہ باپ کی شفقت کے لئے ترستی رہی تھی۔

''ایکچوئیلی ہمارا ان سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔'' خود کو سنبھالتے ہوئے وہ عام سے انداز میں بولی تو ثمین کو ایک جھٹکا سا لگا۔

''کیا مطلب؟''

''میں ڈیڑھ سال کی تھی جب وہ جرمنی چلے گئے۔ اور اس کے بعد سے آج تک انہوں نے امی سے کوئی رابطہ نہیں رکھا۔'' وہ زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ ثمین کی آنکھوں میں تاسف اتر آیا۔

''اور باقی رشتے دار تمہارے دادا وغیرہ؟''

''جب باپ ہی اپنا نہیں ہو سکا تو باقی رشتے کیا معنی رکھتے تھے؟ امی مجھے وہاں سے لے آئیں۔''

''اور تمہارے ننھیال والے؟''

''امی کہتی ہیں کہ خدا نے یہ سارے رشتے ہماری خاطر بنائے ہی نہیں ہیں۔ بس خدا کی زمین پر وہ میرے لئے اور میں ان کے لئے ہوں اور بس۔'' اس کا دل بوجھل ہونے لگا تھا۔

''کہیں مردوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی یہی وجہ تو نہیں صبی؟'' ثمین نے بے ساختہ پوچھا تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''تو اس میں کیا برائی ہے ثمین؟''

''برائی تو نہیں۔ اور پھر ویسے بھی جو کچھ تمہارے ابو نے کیا اس کے جواب میں تمہاری امی کا حوصلہ کمال کا ہے۔ نہ صرف تمہاری بہترین پرورش کی بلکہ معاشرے میں اپنا بھی ایک مقام بنایا ہے۔''

''یہی تو میں کہتی ہوں کہ مرد کو عورت کی لاٹھی تصور نہ کیا جائے کہ اس کے بغیر وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو جائے۔ اس معاشرے میں عورت کا بھی ایک مقام ہے جو کہ اسے ملنا چاہئے۔ اور اگر نہ ملے تو خود عورت کو اس کے حق کے لئے آواز اٹھانی چاہئے۔'' صبیرہ کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔

''مگر یہاں کون سمجھتا ہے صبی! اب چھوٹی سی مثال ایڈی ہی کی لے لو۔ ہر فیلڈ میں اسے مرد ہونے کی وجہ سے برتری حاصل ہے، تبھی کامیاب ہو جاتا ہے۔'' ثمین نے اس کی تائید کی تھی۔

''جیسے اس کے خیالات ہیں نا، اس کا بس چلے تو عورت کے ہاتھ پاؤں باندھ کر گھر کے ایک کونے میں ڈال دے اور خود پوری دنیا میں عیاشی کرتا پھرے۔'' صبیرہ کو ایڈی کی آج صبح والی حرکت یاد کر کے پھر سے غصہ آنے لگا تھا۔ پھر تلخی سے بولی۔ ''پردے میں رکھ کر عورتوں کو تمام آزادیاں دینے کی بات کرتا ہے۔ یہ نہیں سمجھتا کہ پردہ ہی تو آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اب کون قبول کرتا ہے کہ کوئی لڑکی پائلٹ، انجینئر یا بینکر ہو اور وہ پردہ کئے بیٹھی ہو۔''

''خود اس کے گھر کی عورتوں نے تو اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ اس کی دونوں بہنیں جاہل، گنوار ہیں۔'' ثمین کے انکشاف پر وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

ہر چند کہ وہ ایڈی سے متعلق ایسا ہی سوچتی تھی مگر بظاہر اس قدر پالشڈ دکھائی دینے والا شخص واقعی اپنے افکار و نظریات کا اس قدر پکا ہو گا یہ کبھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔

''گھروں سے قدم باہر نکالنے کی بھی اجازت نہیں ہے انہیں۔ میرا تو کئی بار ایڈی سے اس بات پر جھگڑا ہو چکا ہے۔ مگر ان لوگوں کو عورت کو بے زبان جانور سمجھنے کی عادت پڑ چکی ہے۔'' ثمین نے تاسف سے کہا تو وہ جوش سے بولی۔

''ان لوگوں کو اپنے حق کے لئے آواز اٹھانی چاہئے ثمین! دنیا کی کوئی عدالت انہیں ان کے بنیادی حقوق غصب کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔''

''کیا فائدہ صبیرہ! اپنے حق کے لئے آواز اٹھا کر وہ کر بھی کیا لیں گی؟ ان پڑھ اور جاہل لڑکیاں نہ کہیں جاب کر سکتی ہیں اور نہ ہی بھائیوں نے دولت مند ہونے کے زعم میں انہیں کوئی ہنر سیکھنے دیا ہے۔'' ثمین نے گہری سانس بھری تھی۔

''مائی گاڈ، یقین نہیں آتا کہ ایک شخص جو خود ایک مرتبہ پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کرنے کے بعد اب انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کرنے والا ہے اس قدر تنگ ذہن و نظر کا مالک ہو سکتا ہے۔'' صبیرہ جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔

آج پہلی مرتبہ ثمین نے ایڈی کے متعلق اس قدر تفصیل سے بتایا تھا اور یہ سب کس قدر بھیانک تھا۔

''ایسے لوگوں کو گفتار کا غازی کہا جاتا ہے مائی ڈیئر! یہ صرف لفظی آزادی کے قائل ہوتے ہیں۔ اب دیکھا نہیں تمہارے کس قدر خلاف ہے وہ۔ اگر تم کنسرٹ والی رات اس کی آفر قبول کر لیتیں تو آج بھی بخوشی ہمیں ساتھ لے جاتا۔'' ثمین نے کہا تو وہ تنفر سے پُر لہجے میں بولی۔

''میں اس جیسی گھٹیا ذہنیت کے لوگوں سے بات بھی کرنا پسند نہیں کرتی۔ اس کی آفر قبول کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ اور اگر وہ میرے خلاف ہے تو میں بھی اس سے نفرت کرتی ہوں۔''

''چلو اب دفع کرو اس فضول موضوع کو۔'' ثمین نے اچانک ہی موضوع بدل دیا تھا۔ ''میں نے زارا کے گھر فون کیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اب آنا جان بہت بہتر ہیں اور یہ بھی کہ کل ہم ہسپتال جانے کی بجائے سیدھی اس کے گھر چلی جائیں۔ آنٹی اور وہ گھر پر ہی ہیں۔''

''یہ تو اچھا ہو گیا۔'' صبیرہ نے اطمینان کی سانس لی تھی۔

''وہ تھوڑی پریشان بھی تھی۔'' ثمین نے کہا تو وہ استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس نے لاعلمی کے اظہار کے طور پر شانے اچکائے تھے۔

''یہ تو اب جا کر ہی پتہ چلے گا کہ اس کی جانِ ناتواں پہ اب کون سا ستم ہونے والا ہے۔ مسلسل ثوبان کو کوس رہی تھی۔''

''کہیں کنسرٹ والی بات پہ تو جھگڑا نہیں ہو گیا؟'' صبیرہ کو خیال گزرا۔

''پتہ نہیں۔ صبح معلوم ہو جائے گا۔ اور اب پلیز تم اپنی بری ہمیٹو اور لائٹ آف کرو۔ سخت نیند آ رہی ہے۔'' ثمین نے جمائی لیتے ہوئے کہا تو وہ ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''یہی بری ایگزیمز میں کام آئے گی ڈیئر!''

''تو میں تمہاری بری سے کام چلا لوں گی۔'' وہ آنکھیں موندے اطمینان سے بولی تو صبیرہ نے اسے گھورتے ہوئے لائٹ آف کر دی۔

✡……✡

اگلے روز صبح ہی ثمین کو اس کا بڑا بھائی لینے آ گیا۔

''اُف صبی! آپی کی بات طے ہو رہی ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ اس قدر اچھا رشتہ تھا مگر بابا جان نہیں مان رہے تھے کہ لڑکا آؤٹ آف فیملی ہی نہیں آؤٹ آف کاسٹ بھی ہے۔'' وہ جلدی جلدی اپنی مختصر سی تیاری مکمل کرتے ہوئے پُرجوش انداز میں بتا رہی تھی۔

''اچھا تم زارا سے میری طرف سے معذرت کر لینا۔ بس دو ہی دن کی بات ہے۔ پرسوں واپس آ جاؤں گی تو اس کے آنا جان کی عیادت کو ضرور جاؤں گی۔'' اس نے جاتے جاتے کہا تھا۔ آج وہ اکیلی تھی سو جلدی یونیورسٹی کے لئے نکل پڑی۔

''ثمین کدھر ہے؟'' شفق نے اسے تنہا دیکھ کر پوچھا تو جواباً اس نے ساری تفصیل کہہ دی۔ ''پروگرام تو یہی تھا کہ آنا جان کو دیکھنے چلیں گے۔ مگر یار ہسپتال کا تو پوچھا ہی نہیں کہ وہ کون سے ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں؟'' شفق نے آخر میں پریشان ہوتے ہوئے کہا تو صبیرہ نے اسے تسلی دی۔

''زارا اور آنٹی گھر پر ہوں گی۔ ہم سیدھی گھر جائیں گی۔ ثمین نے بتایا تھا کہ اس کی رات زارا سے فون پر بات ہوئی تھی۔''

''یہ بھی اچھی بات ہے۔'' شفق کو تسلی ہوئی تھی۔

وہ دونوں پیریڈز اٹینڈ کرنے کے بعد کینٹین کی طرف چلی آئیں۔

''میں نے جلدی میں ناشتہ بھی نہیں کیا آج۔'' صبیرہ کا کہنا تھا۔ سو شفق کو بھی اس کی تقلید کرنا پڑی۔

''ایکسکیوزمی!''

وہ بیٹھتے ہوئے ٹھٹک کر آنے والے کو دیکھنے لگیں۔

وہ فرحان تھا۔

''آپ لوگ کل آنا جان کی عیادت کو جانے والی تھیں مگر جا نہیں پائیں۔ مجھے ایڈی نے کہا تھا کہ آپ لوگوں کو لے جاؤں۔'' وہ بے حد شائستگی سے کہہ رہا تھا۔

ایڈی کا گروپ اپنی شائستگی اور اخلاق ہی کی وجہ سے تو پوری یونیورسٹی میں پاپولر تھا۔ یہ بھی شاید ان لوگوں کی شخصیت کا ایک رخ تھا۔ دوسروں کو متاثر کرنے کیلئے یہ ملمع سازی ضروری تھی۔

''ہمیں جانا تو ہے۔ مگر آپ لوگوں کے ساتھ نہیں۔'' صبیرہ اندر ہی اندر سلگ اٹھی تھی۔

کس قدر ریاکار بن رہا تھا یہ ایڈی۔ یعنی جب اپنی مرضی ہوئی بات مان لی اور جب اپنی مرضی نہ ہوئی دوسرے کو ڈی گریڈ کر دیا۔

''آپ شاید کل والی بات سے ناراض ہیں۔'' وہ مسکرا دیا تھا۔

صبیرہ کی طبیعت سے ان کا پورا گروپ ہی واقف تھا۔ بظاہر نازک دکھائی دینے والی مغرورانہ تیوروالی یہ لڑکی اکثر اپنے نظریات کی وجہ سے ایڈی سے الجھتی رہتی تھی کیونکہ دونوں ہی انگلش ڈیپارٹمنٹ کے بہترین مقرر تھے۔ سو مخالفت اور حمایت کے چکر میں اکثر بات تلخ کلامی تک پہنچ جایا کرتی تھی۔ اب یہ ایڈی ہی کا حوصلہ تھا کہ وہ صبیرہ کا سامنا بڑے اطمینان سے کر لیا کرتا تھا۔ ورنہ ان کا باقی گروپ تو امن عامہ کا نمائندہ بنا اس سے چھپتا پھرتا تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' شفق نے اپنی امن پسند طبع کی بدولت بات سمیٹنی چاہی مگر صبیرہ نے تیز لہجے میں کہا۔

''ایسی ہی بات ہے۔ کل جب ہم جانے کو بالکل تیار تھیں تب اس نے بہت بدتمیزی کے ساتھ ہمیں ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔''

''آئی ایم سوری مس علی! آپ کو کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے۔ کل واقعی ہمارے ساتھ شہباز اور اس کے گروپ کے دو تین لڑکے بھی تھے اور ان کی شہرت سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ ایڈی نہیں چاہ رہا تھا کہ ہسپتال میں ان کی موجودگی میں آپ لوگ وہاں جائیں۔''

وہ بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ شفق حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''اور پھر کل ایڈی نے ساری بات مس ثمین سے کلیئر کر لی تھی۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ آپ پھر بھی بات نہیں سمجھیں گی۔''

''میں کیسے مانوں کہ آپ سچ کہہ رہے ہیں؟'' صبیرہ نے ناگواری سے پوچھا تو وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''آپ مس زارا سے کنفرم کر سکتی ہیں۔ کل یہاں سے نکلنے سے پہلے ایڈی نے ثوبان کو موبائل پر کال کی تھی اور اسے شہباز اور لڑکوں کی آمد کا بتا کر مس زارا اور آنٹی کو گھر بھجوانے کا کہا تھا۔''

صبیرہ نے بے اختیار شفق کی طرف دیکھا جو خود بے یقینی کی کیفیت میں گھری ہوئی تھی۔

✡……✡

بے جی کے فیصلے نے سب سے بڑا شاک وقار علی کو پہنچایا تھا۔

''بے جی! آپ یہ کیسے کرسکتی ہیں؟''

''خاندان میں رہتے ہوئے یہ سب دیکھنا پڑتا ہے۔ اپنی بھانجی کا گھر اُجاڑ کر اپنی بہو لانا میرے لئے بہت شرم کی بات ہوگی۔''

انہوں نے خوب صورت ریشمی جوڑے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے اطمینان سے کہا۔ یہ جوڑے انہوں نے وقار علی کی دُلہن کے طور پر فوزیہ کے لئے جمع کر رکھے تھے اور ابھی صدیقہ بھابی سے کہہ کر انہوں نے یہ سب جوڑے نکلوائے تھے اور اب ان کا نئے سرے سے تنقیدی جائزہ لیا جارہا تھا۔

''شادی وہیں ہوتی ہے بے جی! جہاں نصیب جڑا ہو۔ میری قسمت میں فوزیہ ہوتی تو اس گھر میں وہی آتی۔ اب آپ یہ زبردستی کا رشتہ اعزاز کے سر منڈھنے کی تیاری کیوں کررہی ہیں؟'' وہ جھلا اٹھا۔

''کوئی زبردستی نہیں۔ اعزاز علی تمہاری طرح نافرمان نہیں ہے۔ اس نے میرے آگے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اسے اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

بے جی نے طنزاً کہا تو وہ بے یقینی سے انہیں دیکھتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اعزاز کو اس نے اس کے کمرے میں جالیا تھا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں؟''

''کیا؟'' وہ مسکرا رہا تھا۔ وقار علی نے اسے شکی نگاہوں سے دیکھا۔

''یہی کہ تم فوزیہ سے شادی پر بالکل راضی ہو۔''

''اب تم تو اپنی گردن بچا کر بھاگ لئے، مجبوراً مجھے ہی یہ قربانی دینی پڑے گی۔'' وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولا تھا۔

''تم انکار کرسکتے ہو اعزاز! یہ تمہارا حق ہے۔''

وہ بے چین ہو اٹھا تھا، اس کے کئے کی سزا اس کے عزیز ترین بھائی کو ملے یہ اسے کسی طور پر منظور نہیں تھا۔

''اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ بے جی کے سامنے اقرار بھی کرلیا۔'' اس نے شکل پر مزید مسکینیت ظاہر کی تھی۔

''بے جی کو انکار بھی کیا جاسکتا ہے۔ میں خود بات کرلوں گا ان سے۔'' وہ غصے سے کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تو اعزاز نے ہنستے ہوئے اسے خود سے لپٹا لیا۔

''میں نے اس رشتے کے لئے اپنی تمام تر رضامندی کے ساتھ ہامی بھری ہے۔'' وہ بولا تو وقار نے شکی نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم سچ کہہ رہے ہونا؟''

''بالکل سچ۔ اب کیا میں تمہاری خاطر یہ ذرا سی قربانی بھی نہیں دے سکتا؟'' اعزاز نے محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''مجھے کوئی ضرورت نہیں تمہاری قربانی کی۔ تم خود پر جبر کرکے کچھ فیصلہ نہیں کروگے۔'' وقار نے انگشت شہادت اٹھا کر قطعی انداز میں کہا تو وہ اس کا امتحان لینے والے انداز میں بولا۔

''بے جی نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ اگر میں فوزیہ سے شادی نہیں کروں گا تو وہ کسی طور پر تابندہ ضیاء سے تمہاری شادی کے لئے راضی نہیں ہوں گی۔''

''میں ان کی رضامندی کے بغیر بھی شادی کرسکتا ہوں۔'' وہ شانوں کو خفیف سا اچکاتے ہوئے لاپروائی سے بولا تھا۔

''اس صورت میں تم ساری عمر حویلی میں قدم نہیں رکھ پاؤ گے۔'' اعزاز نے کہا تو وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔

''تو کیا اس وجہ سے تم نے اس رشتے کے لئے ہامی بھری ہے؟'' ابتدائی جھٹکے کے اثر سے نکلتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے پوچھا تو وہ فوراً بولا۔

''اب میں تم سے اتنی بھی محبت نہیں کرتا کہ اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگادوں۔ بس کچھ دل کا معاملہ تھا۔''

''کیا؟'' وقار کے تاثرات میں یکلخت خوشگوار سی تبدیلی آئی تھی۔ ''تو یاروں سے پردہ داری......؟''

''نہیں یار! بس یونہی۔ میں نے سوچا موقع مل رہا ہے محبت بچانے کا تو کیوں پیچھے رہا جائے۔'' وہ اس سے نظر ملائے بغیر بالوں میں ہاتھ پھیرتا کہہ رہا تھا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا اعزاز! مجھے کبھی کیوں نہیں بتایا؟ اگر میں یہ شادی کرلیتا تو......؟'' وقار کو اس کے گھنے پن پر حیرانی ہورہی تھی۔

''مجھے پتہ تھا شروع ہی سے کہ تمہارا رجحان فوزیہ کی طرف نہیں ہے۔''

''اسی لئے تم نے اپنا دھیان اس کی طرف لگالیا۔'' وقار نے اسے شرمندہ کرنے والے انداز میں دیکھا تو وہ ہنس کر چپ ہوگیا۔

''چلو، میری تسلی تو ہوگئی۔ اب میں ذرا بے جی کو کل تابندہ کے گھر جانے کے لئے تیار کردوں۔ ادھر بھی ایک مہابھارت میری منتظر ہوگی۔'' وہ کہتا ہوا چلا گیا۔

اعزاز تھکے ہوئے انداز میں اپنے بستر پر گر گیا۔ ''نوشابہ۔'' اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔ ''مجھے معاف کردینا نوشابہ! مگر مجھے اپنا گھر، اپنی فیملی بچانی ہے۔ مجھے ان رشتوں کو ختم ہونے سے بچانا ہے۔ فقط اپنی محبت کو پالینا ہی تو زندگی کی معراج نہیں ہوتی، نوشابہ! مجھے ان سب کی محبتوں کو اکٹھا کرنا اور ان کے ساتھ زندگی بتانا ہے۔ اور وقار علی! یہ محبت اور دل ہی کا تو معاملہ تھا جو میں نے اتنی آسانی سے فوزیہ کے لئے ہاں کردی۔ تم میرے جان سے عزیز بھائی، جس سے بچھڑنے کا خیال ہی میرے لئے سوہانِ روح ہے۔ میں کیسے اسے دربدر ہوتے دیکھ سکتا تھا؟ اور بے جی، ان کی تو جان تم میں بند ہے۔ کیا وہ اپنے فیصلے کے بعد جی پاتیں؟ وہ فیصلہ جو انہیں اس گھر کے مکینوں کو ہمیشہ جوڑے رکھنے کے لئے کرنا تھا، تم سے ہمیشہ کے لئے ناتا توڑنے کا فیصلہ۔ سو میں نے محبت پر محبتوں کو ترجیح دی اور رشتے پر رشتوں کو۔ وقار علی! تمہارے معاملے میں تو ہمیشہ میرا دل وسیع اور میری محبت لامحدود رہی ہے۔ پھر میں کیسے تمہیں مایوس کردیتا؟ ہمیشہ میں نے تمہاری خوشی میں اپنی خوشی دیکھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اب بھی تمہاری خوشیوں بھری زندگی کے سامنے میرا یہ دکھ ہیچ ہوگا۔ نوشابہ کی محبت ٹھکرانے کا دُکھ، اُسے دُکھ پہنچانے کا دُکھ۔ اور میں اعزاز علی۔ بھابیا کہتے ہیں کہ اعزاز علی بہت پریکٹیکل بندہ ہے۔ جذباتیت سے کوسوں دور۔ مگر آج جان لو وقار علی! کہ میرا دل اپنے لئے بے حد جذباتی ہے۔ اور اسے تمہاری جذباتیت ہی سے خوف آتا ہے جو ہر پل تمہیں کچھ انتہائی قدم اٹھانے پر تیار رکھتی ہے، سو میں نے تمہیں بچالیا۔ تم جو ہمیشہ سے اس گھر کی رونق اور ہم سب کی محبتوں کا مرکز رہے ہو، میں کیسے تمہیں ضائع ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ مجھے معاف کردینا نوشابہ!''

آنسوؤں بھری دو خوبصورت آنکھیں اس کی چشمِ تصور میں در آئیں۔ مرد ہونے کا زعم آڑے آرہا تھا ورنہ وہ بھی اس پل شاید رو کر ہی اندر کا سارا غبار نکال لیتا۔ ہر دُکھ، ہر کسک کو آنسوؤں سے مٹا دیتا۔

✡......✡

''اب تم لوگ بیٹھ کر باتیں کرو۔ میں رشیدہ کو دیکھتی ہوں۔ جب تک اس کے سر پر کھڑے ہوکر کام نہ کراؤ تب تک وہ کرتی بھی کچھ نہیں ہے۔'' زارا کی ممی مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''اب بتاؤ۔ کیا پریشانی ہے تمہیں؟'' ان کے ہٹتے ہی شفق نے پوچھا تو وہ یکلخت ہی گلابی ہونے لگی۔

''پتہ نہیں بات پریشانی کی ہے یا مجھے خوش ہونا چاہئے۔ مگر میرا دل بہت عجیب سا ہورہا ہے۔''

''تمہارا دل ہی نہیں، تمہارا رنگ بھی عجیب سا ہورہا ہے۔'' شفق نے تنقیدی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ صبیرہ بولی۔

''تم ہمیں پوری بات بتاؤ، یہ ہم بتادیں گے کہ بات پریشان ہونے والی ہے یا خوش ہونے والی۔''

''وہ پتہ ہے آغا جان نے......'' وہ ہکلائی، اٹکی پھر روہانسی ہوکر بولی۔ ''وہ چاہتے ہیں کہ ثوبان سے میری شادی ہوجائے۔''

اپنی طرف سے تو اس نے دھماکا ہی کیا تھا مگر ان دونوں پر قطعی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''تو کیا ہوا؟ یہ بات تو دو سالوں سے طے ہے کہ تمہاری شادی اسی کے ساتھ ہوگی۔'' صبیرہ نے اطمینان سے کہا تو وہ اب کی بار آنکھوں میں آنسو بھی بھر لائی۔

''وہ تو ہونا تھی، مگر اب ہورہی ہے۔''

''کیا؟'' اب کی بار وہ دونوں اچھلی تھیں۔

زارا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کب ہورہی ہے؟'' صبیرہ نے بے حد خوشی سے پوچھا تو وہ منہ لٹکا کر بولی۔

''اسی ماہ کی کوئی تاریخ ہوگی۔ فائنل ایگزیمز سے بھی پہلے۔''

''یعنی اب ایک نئے امتحان کی تیاری۔'' شفق نے اسے چھیڑا تھا۔

''بکومت۔'' اس کی رنگت میں سرخی کھیلنے لگی۔ ''میں یہاں اپنے ایم اے کی فکر میں گھل رہی ہوں اور تم لوگوں کو نئی سوجھ رہی ہے۔''

''اوہو، یعنی یہ شادی آپ کی رضامندی کے بغیر ہورہی ہے؟'' صبیرہ نے شرارت سے سر ہلایا تو وہ دانت کچکچا کر بولی۔

''یہ میں نے کب کہا۔ بس ٹائمنگ درست نہیں ہے۔''

''تو آنٹی سے کہونا۔'' شفق نے مشورہ دیا۔

''ان سے کیا کہوں۔ بلکہ میں تو ہلکا سا اعتراض بھی نہیں کرسکتی۔ آغا جان کی طبیعت بمشکل سنبھلی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد یہ خوشی دیکھ لیں۔ جانے کا وہم لگ گیا ہے انہیں۔'' وہ ملول ہونے لگی۔ صبیرہ نے اس کی اتری ہوئی صورت دیکھتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''تو یار! اس میں مسئلہ کیا ہے؟ کرلو شادی۔ آج نہیں تو کل بھی یہی ہونا ہے۔ ایگزیمز تو شادی کے بعد بھی دے سکتی ہو لیکن کسی کی خوشی پوری کرنے کا تو ایک وقت ہوتا ہے۔ مان لو آغا جان کی بات، انہیں بھی خوشی اور سکون ملے گا۔''

''واقعی زارا! اس میں پرابلم تو کچھ بھی نہیں۔'' شفق نے بھی کہا۔

''چلو ٹھیک ہے۔'' وہ فوراً مان گئی تھی۔ صبیرہ نے پہلے حیرت سے اسے دیکھا پھر پاس رکھا کشن اٹھا کر اسے دے مارا۔

"کس قدر گھنی ہے۔ اندر سے خود ہزار بار راضی ہے۔ بس یونہی ہمیں بتانے کو کہ اس پر ظلم کا پہاڑ ٹوٹ رہا ہے۔"

"قسم سے میں بہت پریشان تھی۔ منگنی اور بات ہے مگر ثوبان کے ساتھ شادی کا خیال ہی میری جان نکال لیتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا......؟" شفق نے نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا۔

"شروع ہی سے اسے ایک کزن، ایک فرینڈ کی حیثیت سے دیکھتی آئی ہوں۔ اب ایک دم سے اتنا قریبی تعلق۔" وہ جھجک کر رک سی گئی تھی۔

"الو ہو تم۔" صبیرہ نے اسے جھاڑا تھا۔ "دو سال ہو گئے ہیں منگنی کو۔ اب تک تو تمہیں اپنا مائنڈ میک اپ کر لینا چاہئے تھا۔"

"اس سے اندازہ کر لو میری سوچ کی پاکیزگی کا۔" وہ اترا کر بولی تو ان دونوں کو ہنسی آ گئی۔

"آغا جان نے ثوبان کو بھی الٹی میٹم دے دیا ہے کہ ایگزیمز کو چھوڑ کر اب بزنس کی طرف توجہ دے۔ وہ تو بس ایڈی کے ساتھ ڈبل ایم اے کا شوق پورا کر رہا ہے ورنہ اب تک اچھا خاصا بزنس سنبھال چکا ہوتا۔"

زارا بتا رہی تھی۔ شفق کو یکلخت کچھ خیال گزرا۔

"ہم لوگ تو کل ہاسٹل آنے والے تھے۔ مگر ایڈی نے جانے کیوں روک دیا۔"

"ہاں یار! کل ثوبان نے مجھے اور ممی کو بھی گھر بھجوا دیا تھا۔ ایڈی اور فرحان کے ساتھ شہباز گروپ تھا۔ اور ان کی ریپوٹیشن کا تو تمہیں پتہ ہی ہے۔"

صبیرہ کے قریب ہی کہیں زوردار دھماکا ہوا تھا۔

'اور وہ جو ثمین بتا رہی تھی؟'

زارا کمرے سے باہر گئی تو شفق نے خاموش بیٹھی صبیرہ کی طرف دیکھا۔

"ثمین کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی صبی؟"

"ہو سکتا ہے ایڈی نے اسے یہ سب نہ بتایا ہو۔ اور جب اس نے دیکھا ہو تب گاڑی میں کوئی بھی نہ بیٹھا ہو۔"

"فرحان بھی تو کہہ رہا تھا کہ ثمین سب جانتی تھی کہ ایڈی کے ساتھ شہباز گروپ بھی ہے۔" شفق نے اس کی بات رد کر دی تھی۔

"یہ بھی ایڈی کی ایک چال ہو گی، ہم لوگوں میں پھوٹ ڈلوانے کی۔ شہباز گروپ یقیناً ان کے ساتھ ہو گا۔ مگر ثمین کو ہم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟" صبیرہ نے قطعی لہجے میں کہا تو شفق ٹھنڈی پڑ گئی۔

"واقعی، یہ بات تو ہے۔ ثمین کو ایسا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایڈی کے ساتھ تو پہلے ہی ہماری ایسی کوئی دوستی نہیں ہے کہ جسے ختم کرانے کے لئے وہ ایسا کچھ کہتی۔"

"بس تم دیکھتی جاؤ کہ اس شخص کے چہرے پر کتنی پرتیں ہیں۔" صبیرہ نے اطمینان سے کہا تھا۔

اگلے روز زارا بھی یونیورسٹی آئی تھی اور ثمین بھی مٹھائی کے ڈبے سمیت موجود تھی۔

زارا کی شادی کی خبر سن کر پہلے تو اس نے زارا کی پشت پر دو دھمو کے جڑے پھر ایک شاندار سی ٹریٹ کا مطالبہ کر دیا۔

"ایسے ہی، میری اکیلی کی شادی تھوڑی ہو رہی ہے۔" وہ مکر گئی تھی۔

"تو پھر ثوبان سے کہو۔ اب تو وہ ویسے بھی جی حضوری پر اترا ہو گا۔ ایسے مانے گا تمہاری۔" ثمین نے شرارت سے کہتے ہوئے چٹکی بجائی تھی۔

"کہاں کوئی۔ اس روز کنسرٹ والی بات پر نہ صرف اس نے مجھے تسلی بخش ڈانٹ پڑوائی تھی بلکہ خود بھی کچھ کم نہیں کیا۔ بس کچا چبانے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔" زارا نے بہت دکھ سے بتایا تو انہیں ہنسی آنے لگی۔

"بہت ظالم شخص ہے پھر تو۔" شفق نے تاسف سے کہا تو وہ سادگی سے بولی۔

"خیر اتنا بھی برا نہیں۔ آغا جان کی طبیعت بہت خراب تھی تو وہ ہاسٹل میں میرے رونے پر اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ سب کے سامنے ہی میرا سر اپنے شانے سے لگائے بڑے بھائی کی طرح تھپکتا رہا۔"

"لعنت ہے زارا! ایسی سوچ پر۔" دلچسپی سے سنتے ہوئے ثمین بھڑک اٹھی تھی۔ ہنسی کے مارے شفق اور صبیرہ کا برا حال تھا۔ اوپر سے ثمین کی تلملاہٹ۔

"رومینس میں بھی برادرانہ جذبات ٹھونس دیئے۔ اندازہ کرو زارا! منگیتر کو لوگ پتہ نہیں کیا کیا القابات دیتے ہیں اور یہ محترمہ اسے بڑا بھائی بنا رہی ہیں۔"

"سچی میں تھوڑی بن رہی ہوں، ویسے ہی مجھے خیال آیا تھا۔" زارا گڑبڑا کر بولی تو ان کی ہنسی میں مزید شدت آنے لگی۔

"اندازہ کر لو اس کی سوچ کی پاکیزگی کا۔" ثمین نے سرد آہ بھری تھی۔

شفق نے ثمین سے کل والی بات کلیئر کرنے کا ارادہ کیا تو صبیرہ نے اسے روک دیا۔

"ابھی نہیں شفق! یوں سب میں پوچھنا اچھا نہیں لگے گا۔ خود وہ سمجھے گی کہ ہم اسے جھوٹی سمجھ کر پوچھ گچھ کر رہی ہیں۔ میں خود واپسی پر اس سے بات کر لوں گی۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ مگر بات کلیئر ضرور کر لینا۔" شفق نے اسے تنبیہ کی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اور پھر ہوسٹل پہنچ کر اس نے ثمین سے پوچھ ہی لیا تھا۔ جواب میں وہ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی تو صبیرہ خجل سی ہونے لگی۔

"یونہی میں نے سوچا بات کلیئر کر لینا مناسب ہے۔ فرحان ہمیں مس گائیڈ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ شہباز گروپ ہو۔ مگر میں نہیں جانتی تھی۔ مجھے ایڈی نے اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا، ساری بات تم لوگوں کے سامنے ہی تو ہوئی تھی۔ اگر ایسا کچھ ہوتا تو وہ تم لوگوں کے سامنے بتاتا۔ اس نے تو بس تمہیں ہمارے ساتھ دیکھتے ہی انکار کر دیا تھا۔" ثمین نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا تھا۔

"میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ یہ بھی ایڈی کی کوئی گھٹیا شرارت ہو گی ہمیں ایک دوسرے سے متنفر کرنے کی۔" صبیرہ کی رنگت غصے سے تمتما اٹھی تھی۔

"مجھے تو خود بہت افسوس ہو رہا ہے ایڈی کے رویے پر۔ ایسا تو وہ کبھی بھی نہیں تھا۔" ثمین نے بہت دکھ سے کہا تھا۔

"وہ ہمیشہ ہی سے ایسا ہو گا مگر تم نے دوستی میں کبھی غور نہیں کیا تھا۔" صبیرہ نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مگر اب میں اسے بہت اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔"

"اب ذرا دھیان سے رہنا۔" صبیرہ نے اسے نصیحت کی تھی۔

خود ایڈی کی طرف سے اس کے دل میں ایک اور گرہ پڑ گئی تھی۔

اپنی دشمنی سے ہٹ کر اب وہ ان کے گروپ میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کر رہا تھا۔

'تمہیں تو میں اچھی طرح مزہ چکھاؤں گی اس گھٹیا حرکت کا ایڈی!' وہ اندر ہی اندر سلگ اٹھی تھی۔

✡ ...... ✡

وہ بے حد بے یقینی سے اپنی بڑی بہن کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"میں خود بہت حیران ہوں کہ احسن ایسا کیسے کر سکتا ہے۔ میں نے تو اس کے آگے ہاتھ تک جوڑ ڈالے مگر وہ کسی طور شادی کے لئے تیار نہیں۔ پتہ نہیں اتنا پتھر دل کیسے ہو گیا ہے۔" وہ رو رہی تھی۔

تابندہ کی امی کے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔

انہیں فوراً پتہ چل گیا کہ یہ سب کس کی کارستانی ہے۔ ان تین چار دنوں سے تابندہ کا اطمینان دیدنی تھا۔ ظاہری سی بات تھی کہ وہ احسن کو ساری پٹی پڑھا چکی تھی۔ اپنا مسئلہ اس کے سر ڈال کر ہی اتنے آرام و سکون سے رہ رہی تھی۔

"آپا! آپ روئیں مت، میں بات کروں گی احسن سے۔"

ذلت و شرمساری انہیں بولنے ہی نہیں دے رہی تھی۔ اب لاکھ آپا کو اس بات کی خبر نہیں تھی مگر وہ تو اچھی طرح واقف تھیں کہ اصلیت کیا ہے۔

"اس سے کیا بات کرو گی نسرین؟ وہ نصیبوں جلا تو رات ہی کراچی چلا گیا ہے۔"

وہ دل گرفتگی سے کہتیں ان کا آخری سہارا بھی چھین گئیں۔

تابندہ کی امی اس پر جتنا بھی چیختیں چلاتیں، وہ کم تھا۔ اگر رخشی درمیان میں نہ آ جاتی تو وہ تابندہ پر ہاتھ اٹھانے سے بھی گریز نہ کرتیں جبکہ ابو نے بہت ٹھہرے ہوئے بے تاثر لہجے میں کہا۔

"اسے نکاح کر کے اسی شخص کے ساتھ رخصت کر دو نسرین! جو ہمارے گھر کی تباہی کا باعث ہے۔"

تابندہ کو تو جیسے زمین کی بادشاہی مل گئی تھی۔

اس نے فوراً فون کر کے وقار علی کو یہ خبر دی تو اس نے خوشی کے مارے ریسیور چوم لیا۔

اگلے ہی روز بے جی پوری تمکنت و طمطراق کے ساتھ شادی کی تاریخ لینے کو صدیقہ بھابی اور بی جان کے ساتھ ان کے خوبصورتی سے سجے ڈرائنگ روم میں موجود تھیں۔

ضیاء احمد کسی طور ڈرائنگ روم میں جانے کو تیار نہیں تھے مگر نسرین بیگم کے آنسو ان کا دل پسیج گئے۔

اب ان لوگوں نے کتنی بھی خوش اسلوبی سے بات چیت کیوں نہ کی ہو مگر کسی سے بھی ان کا اوپری پن اور بد دلی چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وقار علی کی طرح تابندہ ضیاء بھی کسی کی خوشیوں کے سوختہ محل پر اپنی محبتوں کی کامرانی کا تاج محل تیار کرنے کی کوشش میں تھی۔

''میں کوئی دھوم دھڑ کا نہیں چاہتا۔ آپ سادگی سے نکاح کر کے اپنی امانت لے جاسکتے ہیں۔'' ابو نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا تو دروازے کے ساتھ کان لگائے کھڑی تابندہ کو رونا آ گیا۔

''یہ سب تو طے تھا تابی! ابھی تو تمہیں اور بھی بہت کچھ جھیلنا ہوگا۔'' رخشی نے دکھ سے کہا تھا۔

''دیکھیں ہمارا بہت لاڈلا بیٹا ہے اور پھر ذات برادری والے لوگ ہیں ہم۔ بارات تو دھوم دھام ہی سے لائیں گے۔''

بے جی کو ان کی بات ناگوار گزری تھی۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔

''دیکھیں آپ اپنے گھر میں جا کر جتنا جی چاہے دھوم دھڑ کا کر لیجئے گا مگر یہاں سے صرف نکاح اور رخصتی ہی کی تقریب ہوگی۔''

''بے جی! ہمیں تو لڑکی سے غرض ہے۔ ولیمے پر ساری کسر نکال لیں گے۔ ان کی کوئی مجبوری ہوگی تبھی کہہ رہے ہوں گے۔'' صدیقہ بھابی نے اپنے دھیمے لہجے میں بات سنبھالی تھی۔

''اولاد کی خوشی میں ہی اپنی خوشی محسوس کرنی چاہئے۔ اب لاکھ ہمیں بھی اس رشتے پر اعتراض تھا مگر اپنے بیٹے کی خاطر اس در پر آنا پڑا۔ ایسے معاملوں میں اڑی کرنا اچھی بات نہیں ہوتی۔'' بی جان نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔

اور وہ بیٹی کے باپ تھے، بیٹے کے نہیں جو اتنے آرام سے تلخ و ترش برداشت کر جاتے۔ سرخ چہرہ لئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''آپ لوگ مناسب تاریخ طے کر لیجئے اور مقررہ روز نکاح کے لئے آ جائیے گا۔'' وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکلے تو ان کے کندھے ڈھلکے ہوئے اور قدموں میں لرزش تھی۔ انہوں نے رخشی اور تابندہ کی طرف بھی توجہ نہیں دی تھی جو وہیں دروازے کے قریب کھڑی صورت حال کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''ہمیں پتہ ہے کہ تابندہ کی بات پہلے سے طے تھی مگر اس میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں۔ اب وقار علی بھی تو میری بیٹی سے منسوب تھا، کیا میں نے آپ سے رشتہ توڑ لیا ہے؟ آج کل زمانہ ہی ایسا جا رہا ہے بہن! لڑکے، لڑکیاں خود ہی سب کچھ طے کر لیتے ہیں۔ ماں باپ کی بیوقوفی ہوتی ہے جو ان کے لئے بر ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ شادی کی تاریخ ہی رہ گئی ہے، وہ بھی انہی سے پوچھ لیتے۔'' بی جان کا تلخی و تمسخر سے بھرپور لہجہ نسرین بیگم کی پیشانی تپا گیا مگر دل پر پتھر رکھ کر نا سمجھی کا تاثر دینے پر مجبور تھیں۔

شاید یہی وہ لرزا دینے والا وقت ہوتا ہے جس سے بچنے کے لئے ہر ماں باپ بیٹی نہ ہونے کی دعا کرتے ہیں۔ اتنی ساری محبتوں اور خواہشوں کو روند کر آج تابندہ صحیح معنوں میں اس گھر کے لئے پرائی ہو گئی تھی۔

منع کرنے کے باوجود وقار علی کی بارات مختصر لوگوں کے ساتھ مگر بہت دھوم دھام کے ساتھ آئی تھی۔ شاندار بری نے جہاں لوگوں کو رشک میں مبتلا کر دیا وہیں بہت سے حاسدانہ رویے بھی شامل حال رہے۔

''اسی وجہ سے تو سالوں پرانی نسبت توڑ دی۔''

''بس جی۔ امارت دیکھی ان لوگوں نے۔ پیار محبت کی وقعت ہی کہاں رہی ہے آج کل۔''

''بہنیں تو ایک دوسرے پر جان چھڑکتی تھیں۔ یقیناً تابندہ کا کوئی چکر ہوگا۔ دیکھا نہیں، باپ نے کتنی آزادی دے رکھی تھی۔''

غرض جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ گھر والے چھپتے پھر رہے تھے۔

''آج کے بعد اس گھر سے یا اس کے مکینوں سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں۔ تم یہی سمجھنا کہ تمہارے ماں باپ ہیں ہی نہیں۔ ہم بھی بھول جائیں گے کہ ہماری کوئی اور اولاد تھی۔'' جب ضبط کا پیمانہ چھلکا تب ضیاء احمد نے اس سے تمام رشتے توڑ دیئے تھے۔

دلہن بنی وہ بلک بلک کر رو دی تھی۔

''بھلا ایسے بھی کبھی کسی باپ نے اپنی بیٹی کو رخصت کیا ہوگا؟ بیٹیوں کو تو ہمیشہ میکے کا مان دے کر وداع کیا جاتا ہے۔''

اور رخشی لب بھینچ کر رہ گئی ورنہ دل تو اس کا بھی بہت کچھ کہنے کو مچلا تھا۔

'کوئی بیٹی بھی تو ایسے رخصت نہیں ہوتی تابندہ! جیسے تم ہو رہی ہو۔ والدین کی آرزوؤں، ان کی محبتوں کو روند کر۔ تمام اعتماد اور مان، تم نے اپنے ہاتھوں اپنی کرنی ہی سے تو گنوایا ہے۔ اور اب جبکہ تم نے اپنی محبت پالی ہے تو یہ پچھتاوا کیسا؟'

وہ سوچ کر لرز گئی تھی۔

اور وقار علی بڑی شان سے اسے لئے رخصت ہو گیا۔

مہمانوں کی رخصتی عمل میں آئی تو گھر سنسان ہو گیا۔ اس گھر میں شادی والے گھر جیسی کوئی رونق موجود نہیں تھی۔ یوں لگ رہا تھا ابھی یہاں سے کوئی میت اٹھی ہو اور تینوں نفوس الگ الگ کمروں میں ماتم کر رہے تھے۔

✡......✡

''یہ لو بھئی اپنا اپنا حصہ۔''

ثمین نے پھولی سانسوں سے کہتے ہوئے ڈسپوزایبل پلیٹ ان کے سامنے رکھی جس میں تازہ گلاب جامنیں موجود تھیں، جن پر پستے کی ہوائیاں بھی چھڑکی گئی تھیں۔

''واہ، زبردست۔'' میٹھے اور خصوصاً گلاب جامن کی شوقین زارا نے سب سے پہلے ہاتھ بڑھایا تھا۔

''یہ تبرک کون بانٹ رہا ہے بھئی؟'' صبیرہ کو بھی یہ اچانک دعوت پسند آئی تھی۔

''ثوبان بانٹ رہا ہے۔ پورے ڈیپارٹمنٹ میں، اپنی شادی کی ڈیٹ فکس ہونے کی خوشی میں۔'' ثمین نے مزے سے بتایا تو گلاب جامن زارا کے حلق میں اٹک گئی۔

''کیا؟''

''اور نہیں تو کیا۔ یہ ڈبے کے ڈبے بانٹ رہا ہے اس کا گروپ۔'' وہ ہنسی تھی۔

''کیا مزے کا سین ہو گیا یار۔'' صبیرہ سوچ کر لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔

''کس قدر گدھا ہے یہ۔ بھلا یونیورسٹی میں دھوم مچانے کی کیا ضرورت تھی۔ سب میرا ریکارڈ لگائیں گے۔'' زارا نے دانت کچکچائے تھے۔

''کیا ریکارڈ لگائیں گے؟'' صبیرہ کو اعتراض ہوا تھا۔

''یہی کہ اس نے ایک گدھے سے شادی کی ہامی کیوں بھر لی۔'' ثمین نے لقمہ دیا تو زارا نے جھینپ کر اس کے شانے پر دھپ رسید کی تھی۔

''ہیلو لیڈیز!'' اسی وقت ثوبان چلا آیا تو زارا کا بوکھلاہٹ کے مارے برا حال ہونے لگا۔ محض دو ہفتوں کے بعد تو شادی ہونا قرار پائی تھی۔ گھر میں تو پھر اس سے پردہ چل جاتا تھا مگر یونیورسٹی میں اس کا سامنا ایک لازمی بات تھی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے بھئی۔ کیوں تم ہماری لڑکی کو پوری یونیورسٹی میں بدنام کر رہے ہو؟'' ثمین نے ثوبان کی کلاس لی تھی۔

''بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔'' وہ بڑے انداز سے بولا تھا۔

''پھر بھی آپ کو شرم آنی چاہئے یوں مٹھائیاں بانٹتے ہوئے۔'' صبیرہ نے بھی زارا کا ساتھ دیا تھا، وہ حیران ہوا۔ پھر طنزاً بولا۔

''شرم کیسی؟ بھئی ہم تو صاف دل لوگ ہیں۔ خوش ہیں تو مٹھائیاں بانٹ رہے ہیں۔ ''لوگوں'' کی طرح نہیں کہ دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں اور شکل پر ٹھیکرے برس رہے ہیں۔''

''فضول باتیں مت کرو۔'' زارا چلائی تھی۔

''دیکھا۔ جس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں، وہ خود ہی بول اٹھی ورنہ میں نے اس کا نام تو نہیں لیا تھا۔'' وہ فی الفور بولا تو زارا خفا ہونے لگی۔

''اسی لئے میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سنجیدگی تو تمہیں چھو کر نہیں گزری۔''

''مگر تمہارے معاملے میں، میں سو فیصد سنجیدہ ہوں سنجیدہ بیگم۔'' وہ قطعی غیر سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ اس کے انداز پر زارا جھینپ سی گئی۔

''اب تم لوگ آپسی لڑائی جھگڑے شادی کے بعد کے لئے اٹھا رکھو اور ٹریٹ طے کرو۔'' ثمین نے اصل نکتہ اٹھایا تھا۔

''اوہ یس، آف کورس۔ جب اور جہاں کہو۔''

ثوبان کو تو کچھ زیادہ ہی خوشی تھی جبکہ اس کے انداز پر زارا کو شرم آ رہی تھی۔

ثمین نے وقت اور جگہ طے کر کے پہلے ہی اپنی پسند کا مینو بھی سلیکٹ کر لیا تھا۔

''یہ کمبخت تو جیسے دعوتِ ولیمہ کھانے جا رہی ہے۔'' زارا کی حالت دیکھ کر صبیرہ اور شفق کو ہنسی آ رہی تھی۔

''کیا ہم زارا کو بھی لا سکتے ہیں؟'' ثمین نے بے حد معصومیت سے پوچھا تو وہ شرارتی انداز میں زارا کو دیکھنے لگا جو اس سے بہت کترائی بیٹھی تھی۔

''آف کورس، یس۔ بھئی یہ تو محفل کی جان ہیں۔ ان کے بغیر......'' وہ اسے نظروں کے حصار میں لئے مسکراہٹ دبا تا کہنے لگا تھا کہ زارا غرا کر اس کی بات کاٹ گئی۔

''ہوش میں رہو ثوبان!''

''صحیح کہہ رہا ہوں نا میں۔ تم نہیں آؤ گی تو بل کون پے کرے گا؟'' وہ معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

اس کی شرارت سمجھ کر وہ ہنس دی تھیں جبکہ زارا نے اسے وہاں سے گیٹ آؤٹ ہونے کا اشارہ دیا تھا۔

''بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے''

وہ آہ بھرتا چل پڑا تھا۔

وہ تینوں زارا کی شکل دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

پھر اگلے روز زارا نے ان تینوں کو پک کیا تھا۔

''بہت مشکل سے ممی نے اجازت دی ہے۔ ڈانٹ رہی تھیں کہ دلہن بن کر چہرے پر روپ نہیں آئے گا۔ آغا جان نے سفارش کی تب جاکے مانی تھیں۔''

وہ بتا رہی تھی۔ سرخ و سیاہ پرنٹڈ جارجٹ کے سوٹ میں تمتماتی رنگت لئے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

''انکل کب آرہے ہیں شارجہ سے؟'' شفق نے زارا سے پاپا کی بابت پوچھا تھا۔

''پرسوں تک انشاء اللہ تعالیٰ پاپا بھی آجائیں گے۔'' وہ خوش تھی۔

''ثمین! دیکھو تم ثوبان کو کوئی بدتمیزی نہیں کرنے دینا۔'' اسے خیال آیا تھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، وہ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھلے عام ہمارے سامنے تمہارے ساتھ بدتمیزی کرتا پھرے گا؟'' ثمین نے اسے گھورا تو وہ جلدی سے بولی۔

''میرا مطلب ہے کہ وہ جو فضول باتیں کرتا رہتا ہے۔''

''اب یہ تو تمہارا ہیڈک ہے۔ یہ تو ساری عمر برداشت کرنے والی عادت ہے۔'' ثمین نے رکھائی سے کہا تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

''خود میں اعتماد پیدا کرو زارا! کو ایجوکیشن کی اسٹوڈنٹ رہی ہو۔ اتنی نروس کیوں ہو رہی ہو؟'' صبیرہ نے اسے ٹوکا تھا۔

''یار! اب وہ ہونے والا شوہر ہے، کوئی کلاس فیلو تھوڑی ہے۔'' وہ بے ساختہ بولی۔ پھر خود ہی لال گلابی ہوگئی، اوپر سے ان کی معنی خیز ہنسی۔

''بہت بدتمیز ہو تم لوگ۔''

''یہ تو ابھی وہاں جاکر پتہ چلے گا کہ زیادہ بدتمیز کون ہے۔'' ثمین نے اسے دھمکایا تھا۔ وہ مدد طلب نظروں سے صبیرہ کو دیکھنے لگی تو اس نے بھی بے اعتنائی سے منہ گھما لیا۔

''بس خاموش رہو۔'' وہ تپ کر رہ گئی تھی۔ ''جیسے یہ ٹریٹ تو میں نے مانگی تھی نا۔''

وہ تینوں اس کی حالت دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھیں۔

تیز دھوپ سے اندر جانے کی وجہ سے ان چاروں کی آنکھیں بمشکل ریسٹورنٹ کے اندرونی منظر سے مانوس ہو پائی تھیں۔

وہ اپنی مطلوبہ ٹیبل کی طرف بڑھیں تو وہاں پہلے سے موجود ثوبان کے ساتھ ایڈی کو دیکھ کر صبیرہ کا وہیں سے پلٹ جانے کو دل چاہا اور واقعی وہ وہیں رک گئی تھی۔

✡......✡

حویلی کی بلند و بالا دیواریں بے حد خوبصورت لائٹنگ سے جگمگا رہی تھیں۔ پکوان کی دل پسند خوشبوئیں پھولوں کی دلفریب مہک کے ساتھ فضا میں چکرا رہی تھیں۔

ابھی کل ہی تو فوزیہ اس حویلی میں اعزاز علی کی دلہن بنی تھی۔ بے حد خوشیوں اور ہنگاموں کے ساتھ ایک خوبصورت دن بیتا تھا۔

''خوش ہونا اعزاز؟''

نکاح نامے پر سائن کرنے کے بعد ابھی وہ سیدھا بھی نہیں ہوا تھا کہ چھٹی بار وقار علی نے پوچھا تھا۔ اس کا مضطربانہ انداز صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ اعزاز ہولے سے مسکرا دیا پھر سکون بھرے لہجے میں بولا۔

''سائن تو کردیئے، اب اور کیا پروف دوں؟''

اور صدیقہ بھابی کا کتنا جی چاہا تھا کہ وہ ہر بات وقار علی کے سامنے کھول دیں۔ اسے بتادیں کہ اعزاز علی، نوشابہ کو کتنا چاہتا تھا، جو ان کی سگی ماموں زاد تھی۔ جو اعزاز علی کی دی گئی قسم کا بار اٹھانے کی سکت نہ رکھتے ہوئے اپنے گھر میں بخار میں جلتا وجود لئے پڑی تھی۔ اور یہ بھی کہ اعزاز علی کے ہونٹوں کی یہ مسکراہٹ فقط ایک ملمع سازی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ مگر وہ خود بھی تو اس سے کئے وعدے کے آگے بے بس تھیں۔

''بھابی! آپ وقار سے ایک لفظ بھی نہیں کہیں گی۔ وہ جذباتیت میں کوئی انتہائی قدم اٹھا لے گا۔ یہ خاندان بکھر جائے گا بھابی! اسے ایک بار برادری بدر کر دیا گیا تو وہ کبھی اس گھر میں قدم نہیں رکھ پائے گا۔ اس وقت میرا صرف خود کے لئے سوچنا بددیانتی ہوگا بھابی! وعدہ کریں کہ آپ کبھی کسی سے کچھ نہیں کہیں گی۔''

وہ بڑے ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں انہیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

اور اس قدر صاف دل رکھنے والا، محبتوں کو زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت دینے والا اعزاز علی زندگی کی بساط پر کس بری طرح پٹ گیا تھا۔ وہ تو اپنے ماضی کو دفنا کر فوزیہ کی طرف بڑھا تھا مگر فوزیہ میں شاید اتنی برداشت یا وسیع القلبی نہیں تھی کہ وہ سب کچھ اتنی آسانی سے بھلا دیتی۔ اعزاز علی کو اپنے قریب پاکر وہ بھڑک اٹھی تھی۔

''ہمیں گزری ساری باتیں، ساری تلخیاں بھلا کر نئی زندگی کا آغاز کرنا ہے فوزیہ! اور اس کے لئے تمہیں بھی میرا ساتھ دینا ہوگا۔'' اعزاز علی نے بہت ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔

''نئی زندگی، ہنہ۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولی تھی۔ ''اور نوشابہ کو آپ کس خانے میں فٹ کریں گے؟''

وہ جھلا کھا کر رہ گیا مگر پھر خود کو سنبھال کر بولا۔

''میں نے کہا نا کہ ہر بات قصہ ماضی بن چکی ہے۔ اب راکھ کرید کر کچھ حاصل نہیں۔ عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ خدا کی رضا جان کر اپنی نئی زندگی کی بنیاد باہمی اعتماد و محبت کے سہارے پر رکھی جائے۔''

''مگر میں کبھی نہیں بھول سکتی کہ آپ دونوں بھائیوں نے میری زندگی کو ایک کھیل بنا کر رکھ دیا ہے۔ ایک نے اپنی محبت کے لئے مجھے ٹھکرا دیا اور دوسرے نے اپنی محبتوں کے لئے مجھے اپنا لیا۔ کھلونا سمجھ رکھا ہے مجھے؟''

وہ ہسٹیریکل ہو رہی تھی۔ اعزاز علی بے بسی سے سر تھام کر رہ گیا۔ اسے کب معلوم تھا کہ بظاہر بہت آسان دکھائی دینے والی راہ پر خار بچھے ہوئے تھے جو پہلے ہی قدم پر لہولہان کردینے کے درپے تھے۔

صدیقہ بھابی اسے آدھی رات کو ٹیرس پر ٹہلتے دیکھ کر دنگ رہ گئی تھیں مگر مہمانوں سے بھری حویلی انہیں اس وقت کسی بھی قسم کی بازپرس سے روک رہی تھی۔ البتہ انہیں صورت حال کا اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا۔ فوزیہ کی طبیعت کی تیزی اور زبان کی تلخی سے وہ اچھی طرح واقف تھیں۔

اور آج وقار علی بڑی دھوم دھام کے ساتھ تابندہ ضیاء کو بیاہ لایا تھا۔

حویلی کے دروازے پر ہی گانے بجانے والیوں نے رونق لگا رکھی تھی۔

بے جی نے کالے بکروں پر دلہا دلہن کا ہاتھ لگوا کر صدقہ اتارا اور سینکڑوں روپے ان پر سے وار دیئے۔

تابندہ کا ہاتھ لگوا کر غریبوں میں کپڑے بانٹے گئے، روپے تقسیم ہوئے۔ وہ سب کچھ بھول بھال کر اس سارے منظر سے لطف اٹھا رہی تھی۔ اس قدر چاہت اور تفاخر بھرے استقبال نے اسے مغرور کر دیا تھا۔ میکے کے در بند ہونے کا دکھ دھیما پڑنے لگا۔

کیمروں کی چکا چوند اور مووی لائٹس اس کے پچھتاوؤں کو دھندلانے لگیں۔ اسے محسوس ہونے لگا جیسے اس نے زندگی میں یہ واحد عقل مندی کا کام کیا ہو۔ آج اس کا روپ سروپ ہی نہیں بلکہ استقبال بھی مہارانیوں جیسا تھا۔

اناج کے بھرے ہوئے تھال باری باری اس کے سامنے آتے گئے۔ وہ جس شے پر ہاتھ رکھتی، کام والیاں فوراً وہ چیز غریبوں میں بانٹنا شروع کر دیتیں۔

''بے جی! اب بس کریں۔ دلہن تھک گئی ہوگی کھڑی کھڑی۔'' صدیقہ بھابی ہی کو خیال آیا تھا۔

وقار علی اپنی متاع عزیز کی اس قدر آؤ بھگت دیکھ کر تفاخر سے مسکرا رہا تھا۔ لیمن ایلو ڈیسپاہ پرنس سوٹ میں خود اس کی وجاہت نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں تھی مگر اس کی نگاہ صرف اور صرف تابندہ پر ٹکی تھی جس کی تابندگی آج ستاروں کی شمعیں بجھا دینے کے درپے تھی۔ بیش قیمت سرخ لہنگے کی خاص ترین بات اس پر سونے کے تاروں کا نازک اور خوبصورت کام تھا۔ زیورات کے بوجھ سے لدی وہ اپسراؤں کو مات دے رہی تھی۔

بلاشبہ بے جی نے بہو کی بری بنانے میں اپنی سابقہ روایت کو برقرار رکھا تھا۔ کہیں سے بھی ہاتھ روک کر خرچ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سب سے پہلے صدیقہ بھابی، پھر فوزیہ اور اب تابندہ کے لئے بھی انہوں نے دل کھول کر پیسہ خرچ کیا تھا اور ہر شے بے مثال بنائی تھی۔

''وقار علی! اپنی بھابیوں کو کچھ نہیں دو گے؟'' بے جی نے مسکراتے ہوئے اس کی توجہ مبذول کرائی تھی۔

''انہیں چاہئے کہ یہ مجھے کچھ دیں۔ میں نے تو انہیں خوبصورت سی دیورانی لاکر دے دی ہے۔'' وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔

نگاہوں سے امڈتا خمار اور ہونٹوں کے نرم کونوں میں دبی مسکراہٹ فوزیہ کا تن من جلا کر خاک کر رہی تھی۔ اسے کانٹوں کا بستر سونپ کر وہ خود پھولوں کی چاہت کر رہا تھا۔

''اتنی کنجوسی اچھی نہیں ہوتی دیور جی!'' صدیقہ بھابی نے اسے چھیڑا تو وہ مسکراتے ہوئے بے جی کے ہاتھوں سے مخملیں کیسے لے کر کھولنے لگا جس میں خوبصورت سا گلوبند جگمگا رہا تھا۔ ویسا ہی ایک سیٹ فوزیہ کے لئے بھی تھا۔

''خیر اب اتنا بھی کنجوس نہیں ہوں۔ اپنی بیوی کی نظر تو اتار ہی سکتا ہوں۔'' شرارت سے کہتے ہوئے اس نے ایک کیس صدیقہ بھابی کو بھی تھمایا اور دوسرا فوزیہ کی طرف بڑھا دیا۔

''میں صدقہ خیرات نہیں لیتی۔'' وہ تڑخ کر بولی تو یکلخت ہی سب خاموش ہوگئے۔

''فوزیہ! وہ مذاق کر رہا ہے۔ بھلا اپنی بھابی کو کوئی صدقہ خیرات دیتا ہے؟ یہ تو اس کا پیار ہے۔'' بے جی نے فوراً بات سنبھالی تھی۔

''ہاں تو اور کیا، تمہیں تو میں نے پورے کا پورا اعزاز علی دے دیا ہے۔'' وقار علی اب بھی شرارت کے موڈ میں تھا۔

مگر جس آگ میں فوزیہ جل رہی تھی، اس کا وہ اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے لگا جیسے وقار اسے بھیک میں اعزاز علی دینے کی بات کر رہا ہو اور واقعی یہ بھیک ہی تو تھی۔ محض اپنے مفاد کی خاطر اعزاز علی اس سے شادی کے لئے راضی ہوا تھا۔ اس سے زیادہ ذلت و اہانت کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کسی لڑکی کے لئے۔

''میرے پاس پہلے ہی بہت سے زیورات ہیں بے جی!'' وہ نخوت بھرے انداز میں بولی تو اب کی بار وقار کھٹکا تھا۔

فیروزی کام دار سوٹ میں ملبوس جڑاؤ زیورات پہنے وہ بے حد سرد تاثرات لئے کھڑی تھی۔ اس نے بے اختیار بھابی کے ساتھ بظاہر باتوں میں مصروف اعزاز علی کی طرف دیکھا تھا۔

''کمال کرتی ہو فوزی! وہ سب زیورات تو تمہاری بری کے ہیں۔ یہ تو تحفہ ہے، اس کی بات ہی کچھ اور ہے۔ لو رکھو، تحفوں سے انکار نہیں کرتے۔''

بی جان نے آگے بڑھ کر وقار علی کے ہاتھ سے مخملیں کیس لے کر بند کرتے ہوئے زبردستی فوزیہ کے ہاتھوں میں تھمایا اور ساتھ ہی آنکھ کا خفیف سا اشارہ بھی کر دیا۔ وہ اکتا کر پلٹ گئی تھی۔

صدیقہ بھابی نے منہ دکھائی میں اسے جڑاؤ کنگن دیئے تھے اور بے جی نے نازک سا سونے کا خوبصورت سیٹ۔ فوزیہ کسی طور نہیں مانی تو اعزاز علی کو خود سے آگے بڑھ کر سونے کا نفیس سا سیٹ تابندہ کو دینا پڑا تھا۔

میراثنوں نے ڈھولک سنبھالی تو ایک پُر جوش سی محفل جم گئیں۔ وقار علی کو اس کے پہلو میں بٹھایا گیا تو حیا کے مارے اس کا سر جھک گیا۔

دل جیسے دیے کی لو پر رکھا قطرہ قطرہ پگھل رہا تھا۔

خود وقار اس سے بالمشافہ ملاقات کے لئے ترس رہا تھا۔ اس نے کنکھیوں سے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی جس کی سوئیاں سوا دو بج جانے کا اعلان کر رہی تھیں۔

وقار نے صوفے کے پیچھے کھڑی خوش گپیوں میں مصروف صدیقہ بھابی کو اشارہ کیا تو وہ ان دونوں کے درمیان جھک آئیں۔

''بھابی! کچھ تو خیال کریں، ڈھائی بج رہے ہیں۔''

اس نے مسکین سی شکل بنا کر کہا تو تابندہ کو بھی ہنسی آنے لگی مگر ساتھ ہی ساتھ وجود میں ایک عجیب سی سنسناہٹ بھی دوڑ اٹھی۔ اس ستم گر سے ملاقات کا وقت اب آیا ہی چاہتا تھا جس کی خاطر اس نے ایک زمانے سے ٹکر لی تھی۔

''بیٹا جی! ابھی چار بجے تک تو گھڑی کو بھولے ہی رہو۔'' صدیقہ بھابی شرارت پر آمادہ تھیں۔

''بھابی! میں نے ابھی تک اس کی شکل بھی ٹھیک سے نہیں دیکھی۔'' وہ بے تاب ہوا تھا۔ جواباً بھابی ہنستی ہوئی پلٹ گئیں۔

''دیکھ لو گا سب کو۔''

وہ جھنجلا رہا تھا اور اس کے پہلو میں بیٹھی تابندہ نے اپنے دل میں میٹھی سی کسک محسوس کرتے ہوئے شرمگیں مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیا تھا۔

محبت اوس کی صورت
پیاسی پنکھڑی کے ہونٹ کو سیراب کرتی ہے
گلوں کی آستینوں میں انوکھے رنگ بھرتی ہے
سحر کے جھٹپٹے میں گنگناتی، مسکراتی ہے
محبت کے دنوں میں دشت بھی محسوس ہوتا ہے
کسی فردوس کی صورت
محبت اوس کی صورت

پورے تین بجے صدیقہ بھابی اور چند کزنز اسے وقار علی کے کمرے میں بٹھا گئی تھیں جہاں ہر طرف سرخ گلاب مہک رہے تھے۔ گلاب کی پتیوں سے کارپٹ ڈھک گیا تھا۔ خود اس کے بستر کی بیڈ شیٹ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اور بیچ میں دہکتا ہوا سرخ گلاب۔

ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے سے آئینے میں خود کو دیکھ کر وہ خود ہی اس تشبیہ پر دھیرے سے ہنس دی تھی۔

اور اب ..... گھڑی کی سوئیاں دھیرے دھیرے کھسک رہی تھیں اور وہ گھٹنوں پر سر جھکائے نیند سے جلتی آنکھوں میں وقار علی کی شبیہ سجائے اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

چند کزنز کو نیگ دے دلا کر وہ بمشکل جان چھڑاتا، تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا جب کسی کی تیز آواز پر اسے ٹھٹھک جانا پڑا۔ لحظہ بھر کو ٹک کر سننے پر ہی اسے معلوم ہو گیا کہ صدیقہ بھابی اور اعزاز علی کی آوازیں تھیں۔

وہ حیران سا ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھا مگر اس کے قدموں کو دفعتہً ہی زمین نے جکڑ لیا۔ پردوں کے پار سے آنے والی آواز پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اس کے کانوں میں پڑی تھی۔

''کہہ دو کہ میں جھوٹ کہہ رہی ہوں۔ اگر سب کچھ ٹھیک ہے تو کل رات کو صبح ہونے تک تم ٹیرس پر کیوں موجود تھے؟''

''پلیز بھابی! یہ کوئی وقت ہے ان باتوں کا؟'' اعزاز کا لہجہ مدھم تھا مگر مقابل ماؤں کی طرح انہیں چاہنے والی بھابی تھیں یونہی کیسے جا کر اطمینان سے سو جاتیں؟

''میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ فوزیہ اس رشتے کو کبھی بھی قبول نہیں کرے گی۔''

''قبول کرے گی بھابی! اسے تھوڑا وقت چاہئے۔''

''اور نوشابہ؟ اسے تو ساری زندگی وہ خود بھولے گی اور نہ ہی تمہیں بھولنے دے گی۔ آج صبح جو کچھ وہ کہہ رہی تھی، میں نے سب سنا ہے۔''

بھابی غصے میں تھیں جبکہ اعزاز کا لہجہ اتنا ہی دبا دبا سا تھا۔

''اس کے لئے اتنی جلدی یہ سب قابل قبول نہیں ہے بھابی! بہت غیر متوقع ہے۔''

''اور تم؟ کیا تمہارے لئے یہ سب غیر متوقع نہیں ہے؟ چار سالوں سے تم نوشابہ سے وعدے کرتے چلے آ رہے ہو اور اب بھائی کی محبت میں جذباتی ہو کر تین زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ اگر نوشابہ سے شادی کر لی ہوتی تو آج تم سب مطمئن ہوتے۔''

بھابی مسلسل صدمے کی گرفت میں تھیں۔

اور باہر کھڑا وقار علی جیسے زمین میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔

''یہ کیا ہو گیا تھا؟''

وہ چکرا سا گیا۔

وہ تو اعزاز کو اندر تک جاننے کا دعویٰ کیا کرتا تھا۔ پھر کیسے اس کی نظر چوک گئی؟

اس کی آنکھوں میں نارسائی کا کرب کیوں نہیں دیکھ سکا؟ اس کی ہنسی میں چھپا دکھ کیوں نہیں سن سکا؟

کیا میں اپنی خوشیوں کے حصول میں اس قدر کھو گیا تھا کہ اپنے جان سے عزیز بھائی کی خوشیوں کا حساب نہیں رکھ پایا؟

کہاں پہ غلطی کر گیا میں؟

وہ بے حد بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھا تو اسے محسوس ہوا جیسے دل سے ہر اُمنگ، ہر جذبہ ختم ہو گیا ہو۔

اس پل کچھ یاد تھا تو اعزاز علی کا بے بس لہجہ، بھابی کی کھری باتیں۔ آگہی کا در وا ہوا بھی تو کس وقت جب وہ خود بے بس ہو چکا تھا۔

'ایک مرتبہ تم نے مجھ سے کہا تو ہوتا اعزاز! ایک بار کہہ کر تو دیکھتے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہاری خاطر قربانی دینے کا حوصلہ نہیں رکھتا؟ تبھی یوں چپ چاپ اپنا حوصلہ آزما ڈالا۔'

تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ وہ اپنے بیڈ روم کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔

اس دروازے کے پار اس کی عروسِ جاں موجود تھی۔ سر سے پاؤں تک سجی سنوری، خوشبوؤں میں بسا وجود لئے وہ یقیناً سراپا انتظار تھی۔

اور ابھی کچھ دیر پہلے اس کے اپنے دل میں بھی تو بے تابی و بے قراری ہزار ہا کروٹیں لے رہی تھی، اسے روبرو دیکھنے کی، اس پر اپنا استحقاق جتانے کے لئے۔ مگر اب ...... فقط ایک اضطراب تھا۔

اسے شدت سے یہ احساس ستا رہا تھا کہ وہ اعزاز علی کی محبت کو روند کر اس پر اپنی خوشیوں کا محل کھڑا کرنے جا رہا ہے۔

گہری سانس لے کر اندر کی کثافت کم کرنے کی سعی کرتے ہوئے اس نے دروازے کی ناب گھما کر دروازہ کھولا تو ایئر فریشنر، پرفیومز اور گلابوں کی مہک نے لمحوں میں اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

وہ تابندہ کی طرف جانے کی بجائے سست روی سے کوٹ کے اوپری دو بٹن کھولتا سامنے پڑے صوفے میں دھنس گیا۔

جذباتیت تو یوں بھی ہمیشہ اس کے سر چڑھ کر بولتی تھی۔ اب بھی جبکہ اس کی زیست کا سب سے انمول تحفہ اس کے سامنے تابندہ کے روپ میں موجود تھا، اس کا دل اعزاز علی کی نارسائی کے دکھ سے لبریز تھا۔

وہ بہت ضبط سے سر جھکائے نیند سے جلتی آنکھوں کو بمشکل کھولے اس کی منتظر تھی۔

مگر وہ تو جانے کن سوچوں میں ڈوبا، وہیں صوفے پر جما بیٹھا تھا۔ تابندہ کی کمر اکڑ کر تختہ ہو رہی تھی، گردن میں الگ درد کے مارے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور وہ مزے سے

سامنے بیٹھا پتہ نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ تابندہ کو غصہ آنے لگا۔ ساڑھے تین بجے وہ کمرے میں آیا تھا اور اب بھی اسے تابندہ کی تھکن کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ اس کے بے اعتنائی سے بھرپور انداز نے تابندہ کو قدرے اہانت کا احساس بھی دلایا تھا۔

وہ اس قدر سجی بنی سراپا انتظار بیٹھی تھی اور جس کی خاطر یہ روپ سنوارا تھا، وہ ایک نگاہِ غلط انداز ڈالنے کی بھی زحمت نہیں کر رہا تھا جبکہ ایک دنیا اس کی تعریف کر چکی تھی۔

غصے نے شرم وحیا کے جذبات کو کہیں دور سلا دیا، اس نے چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے ایک نظر سامنے ڈالی، بالوں میں ہاتھ پھنسائے سر جھکائے بیٹھا وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر لگ رہا تھا۔

وہ اپنے حلیے کی پرواہ کیے بغیر پھولوں بھرے بستر پر سے نیچے اتری اور اس کے سامنے جا رکی۔

پھولوں کی پتیوں میں دھنسے مہندی سے سجے گلابی پاؤں۔ وہ بری طرح چونکا تھا۔

نظر اٹھا کر اس ہوشربا کو دیکھنا ہی غضب ہو گیا۔

پریوں سا روپ لئے وہ بے حد خفا سی لگ رہی تھی۔

''بس یہی تھی تمہاری محبت۔ پا لیا تو سارا چارم ختم؟'' اس کے طنز کا وار بہت کاری تھا۔

وہ بہت مضطربانہ کیفیت میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے تابی!''

''تو پھر کیا بات ہے؟''

اس کا چوڑیوں اور مہندی سے سجا نرم و نازک ہاتھ وقار علی کے بازو پر آٹھہرا تھا۔

جن حالات میں شادی ہوئی تھی اس کی تشویش بجا تھی۔ مگر اس کے پُر لطافت لمس نے وقار علی کو سکون پہنچانے کی بجائے نئے سرے سے احساسِ زیاں کا شکار بنا دیا۔

وہاں اس کی وجہ سے کوئی عمر بھر کے لئے بے سکون ہو گیا تھا اور یہاں وہ شبِ زفاف کی خوشیاں منا رہا تھا۔

''تف ہے مجھ پر۔ محض میری جذباتیت کی وجہ سے اعزاز کی زندگی برباد ہو گئی۔''

بے بسی اور جھنجلاہٹ کا احساس پوری قوت سے دل و ذہن پر حملہ آور ہوا تو اس کا دل گھبرانے لگا۔ تابندہ کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹاتا وہ تیز قدموں سے چلتا بالکونی کا دروازہ کھول کر کھلی ہوا میں آ گیا۔

وہ بے حد بے یقینی اور اہانت کے احساس میں گھری کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ کس بے اعتنائی سے وہ اسے جھٹک کر چلا گیا تھا۔

وقار علی کو خبر نہیں تھی کہ وہ پھر سے جذباتیت کا شکار ہو کر ایک نازک سے دل کو کس بری طرح سے ٹھیس پہنچا آیا تھا۔

خود کو کافی دیر سمجھانے کے بعد، سنبھلنے کے بعد وہ واپس کمرے میں آیا تو وہ لائٹس آف کر کے شاید سو چکی تھی۔ نائٹ بلب آن کرتے ہوئے وہ بستر کی طرف پلٹا تو وہ آنکھوں پر بازو رکھے اسی حلیے میں لیٹی ہوئی تھی۔

وقار علی نے جھک کر نرمی سے اس کی کلائی تھامی تو اسے جیسے کرنٹ سا لگا۔ ایک جھٹکے سے اس نے اپنی کلائی اس کی گرفت سے آزاد کرائی اور بے حد درشت لہجے میں بولی۔

''مجھے چھونے کی کوشش بھی مت کرنا وقار علی!''

اس قدر غیر متوقع صورت حال پر وہ گنگ کھڑا رہ گیا تھا۔

✡……✡

اس کا ایک دم سے ایڈی کو دیکھ کر ٹھٹک جانا شفق کو بہت اچھی طرح محسوس ہوا تھا۔ اس نے مضبوطی سے صبیرہ کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ گویا چلتے رہنے کا اشارہ تھا۔

ان دونوں نے کھڑے ہو کر لڑکیوں کا استقبال کیا تھا، اس موقع پر بھی ثوبان کی زبان چلنے سے باز نہیں رہی تھی۔

''وہ آئے ہماری دعوت میں خدا کی قدرت
کبھی ہم ان کو اور کبھی پھر ان کو دیکھتے ہیں''

ایڈی کے سامنے اس قدر فضول بکواس پر زارا کا مارے شرم کے برا حال تھا۔ اوپر سے ان سب کی دبی دبی مسکراہٹیں۔ مگر عقل مندی کا تقاضا یہی تھا کہ وہ ناسمجھی کا تاثر دے کر پہلو بچا جاتی۔

''تو ایڈی صاحب بھی انوائیٹڈ ہیں۔'' ثمین نے بیٹھتے ہوئے خوش دلی سے کہا تو وہ خفیف سا مسکرا دیا جبکہ ثوبان نے فوراً تصحیح کر دی۔

''میٹ مائی شہ بالا۔ پہلے صرف دوست تھا۔''

زارا نے تنگ آ کر سر ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

''اسے کیا ہو گیا……؟'' وہ پوچھ رہا تھا، تب شرم وحیا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کے اندر پرانی والی زارا بیدار ہو گئی۔

''اب اگر تم مزید کچھ بولے نا تو میں یہ گلدان اٹھا کر تمہارے سر پر دے ماروں گی۔''

ثوبان ڈھٹائی سے ہنس رہا تھا، جیسے وہ زارا کا یہی روپ دیکھنا چاہ رہا ہو۔

''مائینڈ یو زارا! اس ٹیبل پر بیٹھ کر اس قدر تخریب کارانہ گفتگو کرنے کی تمہیں بالکل بھی اجازت نہیں ہے۔'' ایڈی نے فوراً اسے تنبیہ کی تھی۔ پھر یونہی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔

''آپ سراسر ایک مرد کے حقوق آزادی پامال کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔''

اس کی شرارت سمجھتے ہوئے سبھی محظوظ ہو رہے تھے مگر صبیرہ کی پیشانی تپ اٹھی۔

''اسے کیا زبردستی ساتھ لائی ہو؟'' ثوبان نے خاموشی سے میز کی سطح پر نظریں جمائے بیٹھی صبیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تو شفق نے اس کے بازو پر ہاتھ مار کر اسے چونکا دیا۔

''اس سے اندازہ کر لو کہ لڑکیاں خاموش بھی رہ سکتی ہیں۔'' ثمین نے فوراً کریڈٹ لیا تھا۔

''مگر میں اپنی دعوت کے دوران صبیرہ کی خاموشی کو بالکل بھی پسند نہیں کروں گا۔ شی از جسٹ لائک مائی لٹل سسٹر۔ اور بھائیوں کو بہنیں چہکتی، باتیں کرتی ہی اچھی لگتی ہیں۔''

یہ ثوبان کا ایک بہت انوکھا روپ تھا۔ صبیرہ بے اختیار اسے دیکھنے لگی۔ وہ مسکرا رہا تھا مگر آنکھوں اور چہرے کے تاثرات میں کہیں بھی شرارت کا عکس نہیں تھا۔

ناچار صبیرہ کو مسکرانا پڑا تھا۔

''دراصل میں تم لوگوں کو سن رہی تھی۔''

''حالانکہ جب یہ بول رہی ہوں تو لگتا نہیں کہ انہوں نے کبھی کسی کو سنا ہو گا۔'' اب پتہ نہیں ایڈی کی زبان بے ساختہ پھسلی تھی یا جان بوجھ کر اس پر جملہ کسا گیا تھا مگر صبیرہ کو تو آگ بگولہ ہی کر گیا۔

''شٹ اپ۔''

''ارے……'' ثوبان بھی بوکھلا گیا تھا۔

''کم آن صبی! یہ کیا بچپنا ہے۔'' شفق نے اسے دھیمی آواز میں گھر کا تھا۔

''ایڈی پلیز! کیوں تم دونوں ہر وقت بچوں کی طرح لڑتے رہتے ہو۔ مانا کہ تم دونوں کے نظریات میں اختلاف ہے مگر وہ تو صرف روسٹرم تک ہے۔ اس کے بعد تو کم از کم تم دونوں کو دوستوں کی طرح رہنا چاہئے۔'' زارا نے سنجیدگی سے کہا۔ صبیرہ ناگواری سے سر جھٹک کر رہ گئی۔

''میں تو ہر وقت مصالحت کے لئے تیار ہوں۔ مجھ میں نہ تو کسی قسم کا غرور ہے نہ بے وجہ انا اور نہ ہی میں ''بعض'' لوگوں کی طرح اپنی انا کے جھنڈے کو تھامے سب سے کٹا پھرتا ہوں۔'' وہ بے حد سکون سے کہہ رہا تھا۔

اور صبیرہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ ''بعض'' لوگوں کی اس لسٹ میں سب سے پہلا نام یقیناً صبیرہ علی کا ہی ہو گا اور آخری بھی۔

''بہر حال کچھ بھی ہو مگر آج اس پارٹی کا موڈ تم دونوں کی وجہ سے خراب ہوا تو میں واقعی ناراض ہو جاؤں گا۔'' ثوبان نے الٹی میٹم دیا تو ناچار صبیرہ کو اپنا موڈ ٹھیک کرنا پڑا تھا۔ کچھ شفق کی گھورتی نظروں کا بھی خیال تھا ورنہ دل ہی دل میں وہ یہاں آنے پر پچھتا رہی تھی۔

اس کے بعد تمام عرصہ خیریت ہی رہی تھی۔ ثوبان کی شوخیوں اور ایڈی کے برجستہ جملوں کے جواب میں زارا کی تلملاہٹ اور شرم وحیا کے امتزاج نے انہیں خاصا لطف دیا تھا۔

✡……✡

''تابندہ!'' وہ تحیر سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں ہوں میں تمہاری۔''

اس کی آواز میں اب بھیگا پن اترنے لگا تھا۔ سائیڈ لیمپ آن کرتا وہ اس کے پاس بیٹھ گیا تھا۔

''میں کچھ پریشان تھا تابی! آئی ایم ویری سوری۔'' وہ متاسفانہ انداز میں معذرت کر رہا تھا مگر معذرت کے یہ چند الفاظ تابندہ کے اندر دہکتی آگ کو ٹھنڈا نہیں کر پائے

تھے۔

”اور میری حیثیت تمہاری ایک پریشانی سے بھی گئی گزری ہے جسے تم اس قدر حقارت سے جھٹک کر چلے گئے۔“

دفعتہً وقار علی کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں نے ایک نئے انداز سے سامنے بیٹھی تابندہ کا جائزہ لیا تھا۔

نیند کے خمار سے بوجھل گلابی آنکھیں

نگاہوں کو خیرہ کرتا روپ

وہ اپنی تمام تر دھرتا اور کوملتا کے ساتھ اس کے سامنے تھی، پھر وہ کیسے اسے نظر انداز کر گیا؟

واقعی حُسن کو نظر انداز کرنا عشق کے لئے ناقابلِ معافی جرم ہی تو تھا۔

”آئی ایم رئیلی ویری سوری تابندہ وقار علی! ان لڑائی جھگڑوں کے لئے تو ایک عمر پڑی ہے۔ مگر آج کی رات اتنے خوبصورت روپ میں مجھ سے خفا ہو گی تو سخت گناہ ہو گا۔“

اس کی مانگ میں سجے نازک سے ٹیکے کو پیشانی کی وسط میں کرتے ہوئے وہ مدھم مگر جذبوں سے پُر لہجے میں کہتا تابندہ کو ہر بات بھلانے لگا۔

”تابندہ وقار علی۔“

اسے لگا اس کی ریاضتوں کا پھل مل گیا ہو۔ اس کی آبلہ پائی رائیگاں جانے سے بچ گئی ہو۔

جو کچھ چند لمحوں پہلے ہوا تھا، اس سے متعلق استفسار تو وہ بعد میں بھی کر سکتی تھی مگر ابھی جس انداز میں محبتیں نثار کرتا وہ اس پر پوری کائنات لٹا دینے کے درپے تھا، اس نے تابندہ کو بھی ان حسین ساعتوں کے فسوں کا قیدی بنا دیا تھا۔

بالوں میں ہونے والی سرسراہٹ اور اس کے ساتھ ہی چہرے پر محسوس ہونے والی گرم سانسوں کی تپش نے اسے کسمسا کر نیند سے بوجھل آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”نئی زندگی کی پہلی صبح مبارک۔“

وہ گیلے بالوں کے ساتھ فریش سا اس کے قریب نیم دراز تھا۔ کہنی تکیے پر ٹکائے دوسرا ہاتھ اس کے بالوں میں پھیرتا وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔

اگلے ہی لمحے تابندہ کو اپنی زندگی میں ہونے والی سب سے خوشگوار تبدیلی یاد آ گئی تھی۔

اس کی نظر بے ساختہ ہی وال کلاک کی سمت اٹھ گئی۔

”پونے دو۔“ اسے تحیر کا جھٹکا سا لگا تھا۔

”جی جناب...... رات کے نہیں بلکہ آج دوپہر کے۔“ اس کی حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے وہ بتا رہا تھا۔

”اور آپ نے مجھے جگایا بھی نہیں۔“ عجیب سی حیا نے اندازِ تخاطب میں بھی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔

”میں کیا جگاتا۔ پتہ نہیں کس نے دروازے پر دستک دے کر یہ مہربانی کی اور میں جاگ گیا۔“ وہ بتا رہا تھا اور تابندہ کو ڈھیروں شرم نے آ لیا۔ وہ زندگی میں کبھی اتنی دیر سے نہیں اٹھی تھی۔

اس کے بازو کا حصار توڑتی وہ بستر سے نیچے اتر گئی تھی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ وہ بے تاب ہوا تھا۔

رات نہ تو اس کو اچھی طرح سے دیکھنے کا موقع ملا تھا اور نہ ہی دل کی حکایتیں سنانے کا۔

”پتہ نہیں سب لوگ ہمارے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔“ وہ عجیب سی خجالت کا شکار ہو رہی تھی مگر وہ شرارت سے کہتا اٹھ بیٹھا۔

”یہاں ماشاءاللہ سے سبھی عقل مند لوگ بستے ہیں۔ سب اچھا ہی سوچ رہے ہوں گے۔“

”اُف......“ اس کے رخسار تمتما اُٹھے۔ اس سے نظر ملائے بغیر وہ باتھ روم میں گھس گئی تھی۔

وہ تکیہ اونچا کیے نیم دراز ہو گیا۔

ہونٹوں پر بے حد آسودہ سی مسکراہٹ لئے وہ اسی سراپا دلنواز سے متعلق سوچ رہا تھا جو اچانک اور بے حد غیر یقینی انداز میں اس کی زندگی کو گلستان بنانے چلی آئی تھی۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکایا تھا۔ صدیقہ بھابی کو سامنے پا کر وہ قدرے جھینپ سا گیا۔ اس کے سلام کا انہوں نے بہت جوش و خروش کے ساتھ جواب دیا تھا۔

”تابندہ کہاں ہے؟“ وہ پوچھنے لگیں۔ اس نے باتھ روم کی طرف اشارہ کر دیا۔

”میں بس یہی دیکھنے آئی تھی کہ اگر تم لوگ جاگ گئے ہو تو میں ناشتے کی تیاری شروع کروں۔“ وہ مسکرا رہی تھیں۔

”ناشتہ کہاں، اب تو لنچ ہو گا۔“ وہ بے اختیار بولا تو انہوں نے شرارت سے کہا۔

”نئے نویلے دُلہا دُلہن شروع کے دنوں میں لنچ کے ٹائم پر ہی ناشتہ کرتے ہیں۔ اور یہ بھی شکر کرو کہ ولیمے کی تقریب ایک دن کے وقفے سے ہے ورنہ تم دونوں تو بالکل بھی اس تقریب میں پہنچ نہیں پاتے۔“

”میں تو کب سے جاگ رہا ہوں، دیکھ لیں بالکل فریش ہوں۔ اپنی دیورانی سے پوچھنا، وہی پوستیوں کی طرح سو رہی تھیں۔“ وہ ڈریسنگ کے آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بالوں میں برش پھیرنے لگا۔

”آپ آئیں نا اندر......“

”جی نہیں۔ میں بھی یہاں بیٹھ گئی تو ادھر کچن کون دیکھے گا؟ تم لوگ بس جلدی سے آ جاؤ۔“ وہ بعجلت کہتی چلی گئی تھیں۔

وہ فریش ہو کر باہر نکلی تو اس نے جلدی جلدی کا شور مچا کر اس کے ہاتھ پاؤں پُھلا دیئے۔

”چہ...... کیا ہے۔ جلدی میں سارے کام ہی الٹے ہو رہے ہیں۔“ وہ کبھی شانے سے پھسلتے دوپٹے کو سنبھال رہی تھی اور کبھی ہوا کے سنگ لہراتے لمبے سیاہ بالوں کو۔ اوپر سے یہ تیاری۔ جھنجھلا کر اس نے زبردستی چوڑیوں کو کلائی میں چڑھانا چاہا تو بے ساختہ سسکاری اس کے ہونٹوں سے نکل گئی۔

”کیا ہوا......؟“ وہ تیزی سے اٹھ کر اس کی طرف آیا تھا۔ طلائی چوڑی کے کنارے نے اس کا ہاتھ چھیل دیا تھا، جس پر اب تیزی سے خون کے ننھے ننھے قطرے اُبھر رہے تھے۔

”بے وقوف لڑکی! یوں پہنتے ہیں چوڑیاں؟“ وہ ڈانٹ رہا تھا۔ ایک تو ہاتھ میں درد ہو رہا تھا، اوپر سے وقار کا انداز۔ اسے رونا آ گیا۔

”یہ آپ ہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ یوں جلدی مچا رہے ہیں جیسے ریل گاڑی چھوٹی جا رہی ہے۔“ تابندہ کی سیاہ آنکھوں میں چمکتے آنسوؤں نے اس کے دل میں ہلچل سی مچا ڈالی تھی۔ بے ساختہ ہی اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

”سو...... سوری۔ میں نے یہ تھوڑی کہا تھا کہ خود کو زخمی کر لو۔“ اس کے مشک بو نم بالوں کو ہونٹوں سے چھوا تو روح تک میں تراوٹ سی اترنے لگی۔

”چلو اب بس۔ اور کچھ بھی نہیں پہنو گی تم۔“

اسے الگ کرتے ہوئے حکم صادر کیا تو اس نے بھی تشکر کی سانس لی۔ ایک ہلکا سا نیکلس، کانوں میں چھوٹی سی جھمکیاں اور مہندی سے سجے ہاتھوں میں انگوٹھیاں اور چار طلائی چوڑیاں پہنے وہ بالکل تیار تھی۔ بالوں کو کلپ میں جکڑنے لگی تو وقار نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”یونہی رہنے دو نا۔ بندھے بالوں میں پرائی لگتی ہو۔ اب یوں احساس ہو رہا ہے کہ میں جیسے دل چاہے تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔“ اس کی وارفتہ سی خواہش پلکیں بوجھل کرنے لگی تھی۔ حالانکہ اتنے لمبے بالوں کو اس نے کبھی کھلا نہیں چھوڑا تھا کہ پھر سنبھالنا جی کا جنجال بننے لگتا تھا۔ مگر وقار علی کی فرمائش کو رد کرنا بھی تو اپنے بس میں نہیں تھا۔

”اوہ......“ اس نے یکلخت پیشانی پر ہاتھ مارا تو وہ گھبرا کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا؟“

وہ جواب دیئے بغیر تیزی سے جا کر وارڈ روب چیک کرنے لگا اور جب واپس پلٹا تو ایک نفیس سا نسبتاً لمبا مخملیں کیس اس کے ہاتھوں میں تھا۔

وہ ابھی تک استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”حالانکہ تم نے مجھے گھونگھٹ اٹھانے کا موقع نہیں دیا مگر میں پھر بھی تمہیں منہ دکھائی کا گفٹ دے رہا ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

تابندہ کو جانے کیا کچھ یاد آ گیا۔ خفیف سے طنزیہ انداز میں بولی۔

”آپ کو بھی کون سا میرا منہ دیکھنے کی ایسی خواہش ہو رہی تھی۔“ لحظہ بھر اسے دیکھنے کے بعد وہ مخملیں کیس کھولتے ہوئے تبصرہ کرنے والے انداز میں بولا۔

”ایک تو تم خواتین کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو طنز کے تیروں کی صورت سنبھالے رکھتی ہو۔ شوہر بے چارے کا چاہے جگر چھلنی ہو جائے۔“ اس کی بات گول کر جانے والے انداز کو تابندہ نے محسوس تو کیا تھا مگر فی الحال اس نے اس قصے کو اٹھایا نہیں تھا۔

اس کا ہاتھ تھام کر اسٹول سے اٹھا کر وقار علی نے اسے بستر کے کنارے لا بٹھایا تھا۔

”سب نے تمہیں بہت اچھے اچھے گفٹس دیئے ہیں اور یقیناً قیمتی بھی۔ مگر مجھے پتہ ہے کہ میرا گفٹ تمہیں سب سے زیادہ پسند آئے گا۔“ پُر یقین انداز میں کہتے ہوئے اس نے گفٹ اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ گولڈ کی بھاری نفیس سی چین میں دمکتا ڈائمنڈ کا ہارٹ شیپ پینڈنٹ اور گولڈ کی ہی خوبصورت سی دو پازیبیں۔

”کیسی لگیں؟“ وہ پازیب دو انگلیوں کی گرفت میں تھام کر اسے ہلاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے گھنگھروؤں کی چھن چھن تابندہ کو مسحور کر گئی۔

''بہت خوب صورت۔''

''میں نے جب سے تمہیں اس گھر میں اپنے آس پاس چلتے پھرتے محسوس کرنا شروع کیا تبھی سے ان پازیبوں کی گنگناہٹ محسوس کرتا آ رہا ہوں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں تمہیں یہ ضرور گفٹ کروں گا۔'' وہ اس کے پاؤں میں پازیب پہنانے کے بعد پیچ بند کرتے ہوئے بتا رہا تھا۔ اس نے لاکٹ اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہ بے ساختہ بولی۔

''یہ میں خود ہی پہن لوں گی۔''

''خبردار۔ جو میرا حق ہے وہ تم کبھی بھی غصب نہیں کر سکتیں۔'' رعب سے کہتے ہوئے اس نے لاکٹ اٹھا کر اس کا لاک کھولا تو وہ منہ بسورتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹنے لگی۔

''یہ میری محبت کی نشانی ہے۔ حُسن کے حضور حقیر سا تحفہ۔'' اس کی پیشانی پر مہر ثبت کرتے ہوئے وہ جذبے سے بھرپور لہجے میں بولا تو اس کی بھرپور توجہ تابندہ کو حد درجہ گڑبڑانے لگی۔

''اب چلیں ......سب انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''ہوں، چلو۔'' وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا تھا۔ وہ سینڈلوں میں پاؤں پھنساتی اٹھ کھڑی ہوئی تو اس کی پازیبوں کی دل پسند جلترنگ کو وقار علی نے بے حد دلچسپی سے سنا تھا۔

''دوپٹہ سر پر اوڑھو، وہاں پر ابا جی اور بھایا بھی ہوں گے۔'' دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے ٹوکا تو تابندہ نے فوراً شیفون کا ہلکے کام سے سجا دوپٹہ سر پر ڈال کر کان کے پیچھے اڑس لیا۔

''ٹھیک ہے نا؟'' وہ قدرے نروس تھی۔

شیفون کا ریشم کی شوخ رنگ کڑھائی سے مزین فیروزی رنگ کا لباس اسے دمکا رہا تھا۔ خوبصورت خم والے شنگرفی لبوں پر میرون لپ اسٹک لگائے کچھ پریشان سی وہ وقار علی کے لئے امتحان بننے لگی تھی۔

''ٹھیک نہیں بلکہ بہترین ہے۔'' وہ نگاہوں ہی نگاہوں میں اس پر قربان ہو کر رہ گیا تھا۔

اسے ساتھ لئے وہ سیڑھیاں طے کرتا ڈائننگ روم تک آیا تو وہاں بھانت بھانت کے چہرے دیکھ کر وہ بے حد جھجک کر رک گئی۔

صدیقہ بھابی فوراً آگے بڑھی تھیں۔ اسے گلے لگا کر پیار کیا اور اسے بے جی کے پاس لے آئیں۔ انہوں نے اس کی صبیح پیشانی چوم کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ وقار علی سامنے والی رو میں اعزاز کے ساتھ والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

''جاؤ صدیقہ! ان لوگوں کو بھی بلا لاؤ۔'' بے جی نے بھایا اور ابا جی وغیرہ کے متعلق کہا تو وہ فوراً اٹھ گئیں۔

''سنائیں بھابی! کیسا لگا میرا بھائی؟'' اعزاز نے بے حد شرارت سے پوچھا تو سب کے سامنے تابندہ سے پلکیں اٹھانا دوبھر ہو گیا۔

''آپ کے بھائی کے پیچھے تو یہ ایک دنیا کو ٹھوکر مار کر چلی آئی ہیں اور اب آپ بھی یہ سوال پوچھ رہے ہیں۔'' فوزیہ کی ہنسی میں چھپے تیر تابندہ کو سیدھے اپنے دل میں پیوست ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ اس کی زرد پڑتی رنگت دونوں بھائیوں ہی نے واضح طور پر محسوس کی تھی۔ یوں تو فوزیہ کے اس جملے کو مزاح کے طور پر بھی لیا جا سکتا تھا مگر فوزیہ کے انداز اس بات کی شدت سے نفی کر رہے تھے۔

''خیر، وقار علی تو نہیں مگر میری بھابی ضرور اس قابل ہیں کہ ان کے پیچھے یہ ساری دنیا کو ٹھکرا دیتا۔'' قدرے توقف کے بعد اعزاز نے بشاشت بھرے انداز میں کہہ کر گویا تابندہ کو نئی طاقت بخش دی تھی۔

فوزیہ اپنی جگہ بری طرح سلگ کر رہ گئی۔

اعزاز کا یہ جملہ براہ راست اس کی ذات پر حملہ تھا۔ اس نے تیز نظروں سے سامنے بیٹھی تابندہ کو دیکھا۔

'ہنہ......کالی چڑی۔ اداؤں اور نخروں سے پھانسا ہو گا وقار علی کو۔ ورنہ اس میں ہے ہی کیا کہ کوئی اس کے پیچھے مجھے ٹھکرانے کا حوصلہ کر سکے۔' سوچتے ہوئے اپنے سفید ہاتھوں پر نظر پڑی تو وہ بڑے ناز کے ساتھ کلائی پر پڑی چوڑیاں ٹھیک کرنے لگی۔

ابا جی اور بھایا کے ساتھ چچا جان بھی تھے۔ انہوں نے باری باری نئی بہو کے سر پر دستِ شفقت پھیرا تھا۔

ان لوگوں کے آتے ہی صدیقہ بھابی نے دونوں ملازماؤں کے ساتھ مل کر تیزی سے گرما گرم کھانا میز پر پہنچانا شروع کر دیا۔

تابندہ کی جھجک کو محسوس کرتے ہوئے بے جی نے خود اپنے ہاتھوں سے ہر شے اس کی پلیٹ میں ڈالی تھی۔

فوزیہ تنتنا کر ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ خود بھی تابندہ کی اس آؤ بھگت کو سخت ناپسند کر رہی تھیں مگر فی الحال خاموش رہنے ہی میں بہتری تھی۔ سو آنکھوں ہی آنکھوں میں بیٹی کو صبر کی تلقین کر کے رہ گئیں۔

وقار علی کے تابندہ سے شادی کے فیصلے نے رشتوں ہی نہیں بلکہ دلوں میں بھی دراڑیں ڈال دی تھیں۔ بی جان نے چاہے بے جی سے کچھ شکایت نہ کی ہو مگر بیٹی کی ناآسودگی نے انہیں بھی ایک روایتی ماں کی طرح صرف اور صرف اپنی اولاد کی خوشی اور غم کا حساب رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بھی تابندہ سے خاصی متنفر اور بدگمان تھیں۔

......

''ہیلو مس صبیرہ!''

اسے ٹھٹک کر رک جانا پڑا تھا۔ وہ بے یقینی سے سامنے کھڑے شہباز گردیزی کو دیکھ رہی تھی۔

'اسے بھلا مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے؟'

''ایکچوئیلی میں کافی دنوں سے آپ سے بات کرنا چاہ رہا تھا مگر موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔'' وہ تمہید باندھ رہا تھا۔ بلیک ٹراؤزر اور آدھی آستین کی بلیک ٹی شرٹ میں وہ کہیں سے بھی غنڈہ بدمعاش ٹائپ کا شخص نہیں لگ رہا تھا۔

''جی فرمایئے!'' اس پر اچٹتی نظر ڈال کر صبیرہ نے سنجیدگی سے پوچھا تو وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''دراصل میں آپ کا بہت بڑا فین ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کے فنِ تقریر گوئی کا۔ کافی عرصے سے میں براہ راست آپ کو ایپری شیٹ کرنا چاہ رہا تھا۔

''تھینکس۔'' وہ اپنی راہ پکڑنے کو تھی جب وہ جلدی سے بولا۔

''صبیرہ پلیز! میری مکمل بات تو سن لیں۔''

''جی۔'' وہ گومگو کی سی کیفیت میں پھر رک گئی تھی۔ تبھی اس نے شہباز گردیزی کی پشت کی طرف سے آتے ایڈی کو ٹھٹکتا محسوس کیا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اسٹوڈنٹ یونین کی صدارت کے لئے ایڈی اور شہباز ایک دوسرے کے بہت بڑے حریف تھے اور یہ بھی کہ شہباز گروپ کی بدمعاشی اور غنڈہ گردیوں کے متعلق بھی ان کے گروپ کو ایڈی ہی نے بتا رکھا تھا۔ اب بھی اس کے تاثرات میں اتری ناگواری اسے محسوس ہو گئی تھی۔ وہ پوری طرح شہباز گردیزی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''ہم لوگوں نے ''ویمن رائٹس یونین'' بنائی ہے۔ یونیورسٹی کی کافی لڑکیاں اس یونین کو جوائن کر چکی ہیں۔ آپ عورتوں کے لئے اپنے دل میں بہت درد رکھتی ہیں، مجھے ہمیشہ ہی سے آپ کے بلند خیالات نے بہت متاثر کیا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس تنظیم کو جوائن کریں تاکہ عملی طور پر عورتوں کے حقوق کے حصول کے لئے کچھ کر سکیں۔''

''آئی ایم سوری، مجھے بہت خوشی ہوتی یہ یونین جوائن کر کے مگر میرے ایگزیمز......'' وہ متاثر تو ہوئی تھی مگر پڑھائی کے دوران کسی اور عملی میدان میں قدم رکھنا تو شاید ناممکن ہی تھا۔

''دیکھیں آپ اس طرح بنا سوچے سمجھے میری آفر رجیکٹ مت کریں۔ آپ کے اندر میں نے عورتوں کے حقوق کی خاطر لڑنے کا جذبہ پایا ہے۔ ان کی کچلی ہوئی عزتِ نفس کو بقا دینے کی خواہش محسوس کی ہے۔ پلیز آپ اچھی طرح سوچیں، خود کو محض لفظوں کی کھلاڑی اور گفتار کی غازی مت بنائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب جبکہ موقع آیا ہے تو آپ ضرور اس نیک کام میں شریک ہوں گی، آپ کے تو انداز بیان ہی میں خدا نے اتنی تاثیر رکھ دی ہے کہ لوگوں کے مسائل چٹکیوں میں حل ہو جائیں گے۔''

وہ بہت شائستہ اور مہذبانہ لب و لہجے میں کہہ رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی صبیرہ اس کے لفظوں میں جکڑنے لگی۔ اور کچھ خیال تھوڑی دور کھڑے بظاہر کسی لڑکے کے ساتھ محو گفتگو ایڈی کا بھی تھا، جو یقیناً اس کو شہباز گردیزی کے ساتھ کھڑے دیکھ کر تلملا رہا ہو گا۔ اس خیال نے اسے بے حد تسکین پہنچائی تھی۔

''لیکن میں اس تنظیم کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' اس نے نیم رضامندانہ انداز میں کہا تھا۔

عورتوں کے حقوق کی جنگ لڑنا تو اس کا مشن تھا اور یہاں تو منزل کا نشان سامنے ہی دکھائی دے رہا تھا۔

شہباز گردیزی نے اپنے والٹ میں سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تھا۔

''یہ میری آنٹی ہیں، بہت اچھی وکیل ہیں، خصوصاً عورتوں کے حقوق کے حوالے سے۔ یہ اس یونین کی پریذیڈنٹ ہیں۔ انہوں نے بھی آپ کو سن رکھا ہے اور آج انہی کے فورس کرنے پر میں اتنی ہمت مجتمع کر پایا ہوں کہ آپ کے پاس چلا آیا، یہ بھی آپ کی فین ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''اوکے۔'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کارڈ اپنے بیگ میں ڈال لیا، پھر سنجیدگی سے بولی۔ ''ابھی فی الحال ایک ہفتے تک تو میں بزی ہوں۔ اس کے بعد اگر خدا نے چاہا تو میں آپ کی آنٹی سے ضرور ملوں گی۔''

''تھینک یو صبیرہ! مجھے یقین تھا کہ آپ اپنے فعل میں بھی اتنی ہی کھری ثابت ہوں گی جتنی کہ اپنے اقوال میں لگتی ہیں۔'' وہ بہت مہذبانہ انداز میں تشکرانہ جذبات سمو رہا

تھا۔ اتنی تعریف پر وہ خجل سی ہو رہی تھی۔

’’اوکے۔‘‘

وہ اس کی ہچکچاہٹ بھانپ کر اپنی راہ چل دیا تھا۔ اس کے حلق سے بے ساختہ گہری سانس خارج ہوئی تھی۔

’بندہ تو کافی مہذب ہے۔ اس کی ریپوٹیشن خراب کرنے میں بھی ایڈی کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔‘ وہ سوچتی ہوئی کوریڈور میں داخل ہوگئی۔

اگلا پورا ایک ہفتہ بہت ہنگامی حالات میں گزرنے والا تھا۔

زارا اور ثوبان کی شادی کی تقریب انہی دنوں منعقد کی جانے والی تھی اور اسی سلسلے میں زارا ان تینوں کو پورا ایک ہفتہ اپنے گھر ٹھہرانے پر بضد تھی۔ شفق اور ثمین تو گھر والوں سے اجازت لے چکی تھیں، ابھی خود صبیرہ بھی فون پر امی سے بات کر کے آ رہی تھی۔ تھوڑی پس و پیش کے بعد وہ بھی مان گئی تھیں اور اب وارڈن سے اجازت دلوانے کی ذمہ داری انہی کی تھی۔

’’کتنا مزہ آئے گا نا۔ فرینڈ کی شادی ایسے اٹینڈ کرنے کا اپنا ہی چارم ہوتا ہے۔‘‘ ثمین اس کی طرف سے اجازت نامہ پا کر پُرجوش ہو رہی تھی۔

’’اب سامان تو سمیٹ لو۔ پتہ نہیں کیا کچھ خرید ڈالا ہے تم نے۔ لگ رہا ہے زارا کی نہیں تمہاری شادی ہو رہی ہے۔‘‘

صبیرہ نے ادھر اُدھر پھیلے شاپنگ بیگز کی طرف اشارہ کیا۔ پچھلا ایک ہفتہ پوری مارکیٹ چھان کر زارا کی شادی کی تیاری کرتے ہوئے گزرا تھا۔

ہمیشہ کی سادگی پسند صبیرہ معترض تھی مگر ثمین کی چلبلی طبیعت کے آگے اس کی ایک نہیں چلی تھی۔ سو اس نے دل کھول کر صبیرہ کو بھی شاپنگ کرائی تھی، اسے روپوں کی طرف سے تو امی نے کبھی کمی نہیں آنے دی تھی۔ ابھی بھی زارا کی شادی کے سلسلے میں انہوں نے کافی رقم بھجوائی تھی۔ مگر اس قدر زرق برق لباس اور جیولری، اسے خفقان ہونے لگا تھا۔ مگر ثمین کی ’’گھوریاں‘‘ اسے مہر بہ لب رہنے پر مجبور کر رہی تھیں۔

’’آج شہباز گردیزی تم سے کیا کہہ رہا تھا؟‘‘ بیگ میں کپڑے رکھتے ہوئے ثمین نے بظاہر بہت سرسری انداز میں پوچھا تھا مگر وہ پوری کی پوری اس کی طرف گھوم گئی۔

’’اگر تم مجھے اپنا ذریعہ معلومات نہ بھی بتاؤ تو میں بتا سکتی ہوں کہ تمہیں اس بارے میں کس نے ٹپ دی ہے۔‘‘ اس کے انداز میں ہلکا سا استہزا تھا۔

’’کس نے؟‘‘

’’ایڈی نے۔‘‘ اس کا انداز یقین سے پُر تھا۔

’’ہوں۔‘‘ ثمین نے اثبات میں سر ہلایا تھا، پھر بولی۔ ’’ایڈی سخت خفا ہو رہا تھا کہ شہباز گروپ کی حقیقت جاننے کے باوجود تم اس کے ساتھ گپیں لڑا رہی تھیں۔‘‘

اس کے اعصاب تن گئے۔ ’’گپیں......؟ اور اس گھٹیا شخص کے پاس اپنی اس جاسوسی اور غلط گوئی جیسی ذلیل حرکت کا کیا جواز ہے؟‘‘

’’کول ڈاؤن......‘‘ ثمین نے اسے بہلایا تھا۔

’’وہ شخص جتنی بھی دیر میرے ساتھ محوِ گفتگو رہا میں نے اس کی آنکھوں میں احترام اور الفاظ میں شائستگی ہی پائی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا یہ دوست خود کے سوا پوری دنیا کو بے وقوف کیوں سمجھتا ہے؟‘‘

’’اس کا مطلب یہ تھا کہ یونیورسٹی میں شہباز گروپ کی ریپوٹیشن اچھی نہیں ہے۔ کتنے ہی اسٹوڈنٹس نے تمہیں اس کے ساتھ کھڑے دیکھا ہوگا۔‘‘ ثمین نے وضاحت کی تھی۔

’’اس سے کہہ دینا کہ اسے میرا گارجین بننے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنا برا بھلا خود سمجھ سکتی ہوں۔‘‘ اسے اس قدر شدید غصہ آیا کہ حد نہیں۔

’’اوکے، اب اتنا بھی طیش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کم از کم مجھے تو بتا دو کہ وجہ کیا تھی شہباز گردیزی سے گفت و شنید کی؟‘‘ ثمین نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا تو اس نے مختصر لفظوں میں ساری بات بتا دی۔

’’اٹس ویری گڈ پرپوزل۔‘‘ ثمین نے فی الفور رائے دی تھی۔ ’’میری معلومات بھی شہباز گروپ کے متعلق وہی تھیں جو کہ ایڈی نے بتا رکھا ہے۔ مگر وہ لوگ کافی اچھا کام کر رہے ہیں۔‘‘

’’محض لفظوں سے کھیل کر ٹرافی اور میڈل حاصل کرنا بہادری نہیں ہوتی ثمین! آدمی کا اصل کردار فیلڈ ورک میں سامنے آتا ہے۔‘‘ اس نے طنز کیا تھا۔

’’بیسٹ آف لک صبی! تمہیں تو یوں بھی عورتوں کے حقوق کی جنگ لڑنے کا بہت شوق تھا۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس فیلڈ میں بہت کامیابی حاصل کرو گی۔‘‘ ثمین نے بڑے خلوص سے اسے وش کیا تو وہ مسکرا دی۔

’’اب جلدی سے پیکنگ ختم کرو، پھر میں وارڈن سے بھی بات کر کے آؤں۔ اب تک تو امی نے ان سے بات کر لی ہوگی۔‘‘

✡......✡

فطری جذبات و احساسات نے چاہے اسے اعزاز علی کا استحقاق قبول کرنے پر مجبور کر دیا ہو مگر اندر سے اُبھرنے والا اہانت کا شدید احساس ہر وقت فوزیہ کے دل و دماغ میں الاؤ جلائے رکھتا تھا۔

تابندہ اور وقار علی کے ولیمے کی شاندار تقریب میں تابندہ کی نظریں تمام وقت داخلی دروازے پر لگی رہیں مگر اس کے میکے سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔

ان تین دنوں میں یہ پہلا موقع تھا جب تابندہ کو شدید ترین احساسِ زیاں اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔ اپنی حالت اور موقع کا خیال کیے بغیر چیخ چیخ کر رونے کو جی چاہنے لگا تو اس نے صدیقہ بھابی سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیا۔

’’ہاں۔ اسے کمرے میں لے جاؤ۔ بیٹھ بیٹھ کر تھکن ہوگئی ہوگی۔‘‘ بے جی نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی تو وہ اسے کمرے میں چھوڑ گئیں۔

نازک مگر دبیز خوبصورت کام سے مزین فیروزی کلر کا لہنگا اس کے نازک وجود کو تابانی بخش رہا تھا۔ ماہر بیوٹیشن نے اس کے ایک ایک نقش کو بے حد خوبصورتی سے ابھارا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں وہ خالی نظروں سے اپنا یہ دمکتا روپ دیکھ رہی تھی۔ میچنگ جڑاؤ زیورات، انگوٹھیوں سے بھری حنائی انگلیاں، طلائی چوڑیوں اور کنگنوں سے سجی کلائیاں، پیروں میں چھنکتی پازیبیں۔

اس نے اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑا محسوس کیا تھا۔ وہ لہنگا جسے دیکھ کر ہی نہیں بلکہ شہر سے بلوائی گئی بیوٹیشن بھی بہت متاثر ہوئی تھی، اس کے بدن میں آگ لگانے لگا تھا۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ ایک وقار علی کو پانے کی خاطر اس نے کن رشتوں کو ٹھوکر ماردی تھی۔ اس کی آنکھیں گرم آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ دم مزید گھٹنے لگا تھا۔ شدید وحشت کے زیرِ اثر اس نے نتھ، ٹیکا، جھومر سب نوچ پھینکا تھا اور اب وہ چوڑیوں سے نبرد آزما تھی۔

وقار علی کب اندر آیا، اسے بالکل بھی خبر نہیں ہوئی تھی۔

’’ارے......رے......‘‘ وہ سخت گھبراہٹ کے عالم میں اس کی طرف لپکا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ’’کیا ہوا تابی؟‘‘

اس کے بے دریغ بہتے آنسوؤں نے اسے مزید پریشان کر دیا تھا۔

ابھی بھابی نے اسے دوستوں اور کزنز کی محفل سے کھینچ کھانچ کر نکالا اور تابندہ کی طبیعت کی خرابی کا کہہ کر کمرے میں بھیجا تھا۔

یہاں تو عجیب ہی صورت حال تھی۔

وہ اس کے شانے سے لگ کر رونے لگی۔

’’تابی! جان! بتاؤ گی تو پتہ چلے گا نا مجھے کہ کیا بات ہے۔‘‘ وہ اسے بانہوں کے حصار میں لیے حد درجہ متفکر تھا۔

’’وقار! گھر والوں میں سے کوئی بھی نہیں آیا۔‘‘ وہ سسک رہی تھی۔ اس کی پشت تھپکتا وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔ پھر آہستگی سے بولا۔

’’ابا جی نے فون کیا تھا انہیں۔‘‘

وہ کرنٹ کھا کر اس سے الگ ہوئی تھی۔

’’بلکہ بھایا اور اعزاز خود گئے تھے، ولیمے کا انویٹیشن دینے۔‘‘ وہ اس سے نظریں ملائے بغیر بتا رہا تھا۔

’’پھر کیوں نہیں آئے وہ؟‘‘ اس نے ازحد بے تابی سے پوچھا تو آنسو پھر سے رخساروں تک چلے آئے۔

’’یہ تو ان کی مرضی ہے تابی! شاید وہ ہم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے۔‘‘ وہ مدھم لہجے میں بولا تو وہ بے اختیار رونے لگی اور پھر یونہی روتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔

وہ دروازہ لاک کر کے اس کے پاس آیا تھا۔

اس قدر خوبصورت روپ میں اس کی خاطر پور پور سنوارے وہ کسی اور کے غم میں روتی وقار علی کو عجیب سے احساسات کا شکار کرنے لگی۔

’’میں نے ان سب کو کھو دیا وقار! اپنی ماں، اپنے باپ، اپنی بہن، سب کو۔‘‘ وہ بے بسی سے کہہ رہی تھی۔

ایک جھٹکے سے وقار علی کی سوچ سیدھی راہ پر آئی تھی۔

سامنے بیٹھی سر پر ہاتھ رکھے اپنوں کی جدائی کا ماتم کرتی یہ لڑکی تو دل میں رکھنے کے قابل تھی جو اس کی خاطر اپنے چاہنے والوں کی چاہت ٹھکرا آئی تھی۔

’’کم آن تابی! میں تو سمجھتا تھا کہ تم بہت بہادر ہو۔ بھئی اب اتنی جلدی وہ لوگ تھوڑی مان جائیں گے۔ ہم دونوں کو انہیں راضی کرنے جانا پڑے گا۔ مانا کہ یہ ان کی وقتی ناراضگی ہے مگر تھوڑی شدید ہے۔ لیکن ہم دونوں کو خوش دیکھ کر یہ ناراضگی منٹوں میں بھاگ جائے گی۔‘‘

اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے وہ بہت ملائمت سے کہہ رہا تھا۔ تابندہ کا دل ٹھہرنے لگا۔

’’وہ مان جائیں گے نا وقار؟‘‘ وہ آنسوؤں بھری آنکھوں میں آس لیے پوچھ رہی تھی۔

وقار کو اس کے ابو کے الفاظ یاد آنے لگے جو انہوں نے بھایا اور اعزاز سے کہے تھے۔

''اب میری ایک ہی بیٹی ہے جناب! جس کی بات آپ کر رہے ہیں اس کی دو دن پہلے ہم ڈولی نہیں جنازہ بھجوا چکے ہیں۔ اور مرے ہوئے کے ساتھ جتنا رشتہ باقی رہ جاتا ہے، ہمارا بھی اس کے ساتھ اتنا ہی رشتہ ہے۔'' اس کی دل شکنی کے خیال سے وقار اسے بتا نہیں پایا تھا ورنہ اس کی منتظر نگاہوں کی بے چینی تو وہ آج سارا دن ہی دیکھتا رہا تھا۔

''کیوں نہیں مانیں گے؟ تم ان کی اتنی پیاری بیٹی ہو۔ بھلا وہ زیادہ دنوں تک تم سے کس طرح خفا رہ سکتے ہیں؟'' وہ اسے بہلا رہا تھا اور تا بندہ کے پاس بھی فقط ان طفل تسلیوں سے بہلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

''ساری تیاری کا تم نے ستیاناس کر دیا ہے اور الزام خوامخواہ مجھ غریب پر آئے گا۔ ابھی فوٹو سیشن باقی ہے۔'' اس کو دکھ کی کیفیت سے نکالنے کے لئے انگلی کی پور سے اس کے رخسار پر ٹکا آنسو صاف کرتے ہوئے وہ شرارت سے پُر انداز میں بولا تو وہ دہک اٹھی۔ بھیگی پلکیں رخساروں پر لرز کر رہ گئیں۔

وقار علی کی وارفتگی اور پُرجوش انداز محبت اسے بہت جلد احساسِ زیاں اور خود ترسی کی کیفیت سے نکال لایا تھا۔

اس کے بعد تمام وقت وہ اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ وہ جانتا تھا کہ تنہائی پاتے ہی وہ گزشتہ یادوں میں گھرنے لگے گی۔ سو وہ اسے اپنے سوا اور کچھ سوچنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ خاندان میں ایک آدھ دعوت بھگتا کر وہ اسے اپنے ساتھ شمالی علاقہ جات کی طرف نکل گیا تو اس کا رہا سہا احساسِ ندامت بھی جاتا رہا۔ وقار علی کے سنگ خوبصورت وادیوں میں تتلیوں کی طرح اُڑتی وہ زندگی کی تمام خوشیاں کشید کر رہی تھی اور اس کی دن بدن بڑھتی شادابی وقار علی کے والہانہ پن میں اضافہ کرتی جا رہی تھی۔

……

زارا نے بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا تھا۔ پھر فوراً ہی انہیں کھینچتی کوریڈور کے دروازے تک لے آئی۔

''کمبخت، بازو میں ناخن چبھو دیئے۔'' ثمین نے سسکاری بھرتے ہوئے اس کو، کوسا تھا۔

''پاگل تو نہیں ہو گئیں؟'' صبیرہ نے بھی اسے گھورا تو وہ ہنستی ہوئی بولی۔

''ساتھ ہی دلہا صاحب کا پورشن ہے۔ سارا وقت اپنی بالکونی ہی میں لٹکے پائے جاتے ہیں محترم۔''

''شرم کرو، کسی کے جذبات کا مذاق اُڑانا بہت بری بات ہے۔'' شفق نے اسے گھر کا تھا۔

وہ ان تینوں کو ساتھ لئے کوریڈور کا دروازہ کھولتی اندر چل دی۔

چار دن کی چاندنی ہے بس۔ پھر دیکھنا دس فون کیا کروں گی تب آفس سے اٹھا کرے گا۔''

اس کی بات پر وہ تینوں خوب ہنسی تھیں۔

ملازمہ ان تینوں کے بیگ کمرے میں پہنچا چکی تھی۔ زارا نے فوراً بیگ کھلوا کر ان کی شاپنگ چیک کرنا شروع کر دی۔

''مہندی کے سوٹ خاص طور پر ممی نے تمہارے لئے بنوائے ہیں۔'' اس نے بتایا تو ثمین سکھ کا سانس لیتی اس کے بستر پر گر پڑی۔

''تھینک گاڈ.... ابھی مجھے مہندی کے سوٹ کے لئے بھی ہلکان ہونا تھا۔ آنٹی گریٹ ہیں۔''

''اس تکلف کی کیا ضرورت تھی زارا! ہماری تیاری تو بالکل مکمل تھی۔'' صبیرہ نے اسے ٹوکا تو وہ متاثر ہوئے بغیر بولی۔

''چونکہ تم تینوں کی سیٹ میری بہنوں والی ہے، سو نیگ بھی تمہی کو وصول کرنا ہے وہ بھی بھاری بھرکم سا۔''

''یہ کام صبیرہ بہترین طریقے سے کرے گی۔ اسے عورتوں کے حقوق حاصل کرنے آتے ہیں۔'' شفق نے بے ساختہ کہا تو وہ زور سے ہنس دی۔

''یہ کام میں نے کبھی نہیں کیا، مانگنے والا''

''ایسے موقعوں پر مانگا نہیں بلکہ وصول کیا جاتا ہے۔'' ثمین کو خاصا تجربہ تھا، سو ان لوگوں کو بھی تسلی ہو گئی کہ ایک تجربہ کار بندہ بھی ان میں موجود ہے۔

''اب سب سے پہلے تم ہمیں آغا جان کے پاس لے چلو تاکہ ان سے ملنے کا شوق پورا ہو سکے۔'' صبیرہ نے کہا۔

''چلو، ابھی میں انہی کے پاس بیٹھی تھی۔ ممی اور پھپھو مارکیٹ گئی ہوئی ہیں، ہر تیاری مکمل ہے سوائے درزیوں کے چکروں کے۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ بارات کا سوٹ ولیمے والے روز ملے گا۔''

وہ کہتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی تو ان تینوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ راستے میں رک کر ملازمہ کو کولڈ ڈرنکس اور آئس کریم کا کہتی وہ انہیں ساتھ لئے آغا جان کے کمرے میں آ گئی تھی۔

گرے بالوں والے آغا جان سوبر سے تھے۔ ان تینوں کو دیکھ کر بے حد خوشی کا اظہار کیا۔ شگفتہ مزاج اور مشفق آغا جان ان لوگوں کو بہت اچھے لگے تھے۔ کولڈ ڈرنکس اور اس کے بعد آئس کریم کھانے کے دوران وہ ان سے کافی بے تکلفی سے بات چیت کر رہی تھیں۔

شام تک زارا کی کزنز اور فیملی کے کچھ لوگ بھی آ چکے تھے۔ اس وجہ سے ایک دم رونق ہو گئی تھی۔ زارا کے پاپا بھی شارجہ سے پاکستان پہنچ چکے تھے۔

مگر صبیرہ سخت جھجک رہی تھی۔

''میں کبھی اتنے لوگوں کے درمیان رہی نہیں ہوں نا۔''

''اچھا ہے۔ اب انسانوں میں اٹھو بیٹھو گی تو ساری جھجک خود بخود دور ہو جائے گی۔'' ثمین نے لاپروائی سے کہا تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

غیر نصابی سرگرمیوں میں جو دو بہترین کام شفق کو کرنے آتے تھے وہ مہندی لگانا اور ڈھولک بجانا تھے۔ سو فی الحال ڈھولک بجانے کا اہم فریضہ اسے سونپا گیا تھا۔

ڈیک بند ہوا۔ ڈھولک کی خوبصورت تھاپ گونجی تو آہستہ آہستہ سبھی سٹنگ روم میں جمع ہو گئے۔

''شرم کرو صبی! اتنی پیاری دوست کی شادی میں بھی نہیں گاؤ گی.....'' زارا کو افسوس ہوا تو ثمین کو بلا جھجک گاتے دیکھ کر اسے بھی جوش آ گیا تھا۔

''میرے نیہر سے آج مجھے آیا
یہ پیلا جوڑا، یہ پیلا جوڑا
یہ ہری ہری چوڑیاں
یہ ہری ہری چوڑیاں''

وہ بے اختیار دروازے ہی میں ٹھٹک گیا تھا۔

خوشی اور جوش سے تمتماتا چہرہ، دلکش آواز، پرنٹڈ لان کے میرون اینڈ آف وائٹ امتزاج کے لباس میں ملبوس اس کا یہ ایک بے حد انوکھا اور چونکا دینے والا روپ تھا مگر یہ لحظہ بھر ہی کی بات تھی۔ ثوبان نے اس کو ٹہوکا دیا تو وہ بہ سرعت سنبھلا۔

''جام ہو گئے ہو کیا، اندر چلو۔''

انہیں یوں غول درغول آتے دیکھ کر زارا دوپٹے میں منہ چھپائے سب سے پہلے اندر بھاگی تھی۔ صبیرہ بھی خفیف سی ہو کر یونہی بلاوجہ گانوں والی کتاب کے صفحات اُلٹنے لگی۔

''دیکھو بھئی۔ میں تو ہوں اپنے گھر والوں کا اکلوتا بیٹا۔ اب وہاں تو کوئی ڈھولک بجانے والا نہیں، سبھی مہمان ادھر براجمان ہیں۔ میں اکیلا وہاں کیا کرتا؟''

ان کے سخت احتجاج کے جواب میں ثوبان نے مسکین انداز اپنایا تھا۔ کاٹن کے سفید شلوار سوٹ میں ملبوس وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ عام دنوں میں تو وہ ہمیشہ جینز شرٹ ہی میں دکھائی دیتا تھا مگر آج بہت بدلا ہوا لگ رہا تھا۔

''پھر بھی یہ لڑکی والوں کا گھر ہے۔ تم شادی سے پہلے یہاں کیسے دندنا سکتے ہو۔'' ثمین نے اسے گھورا تھا۔

''وعدہ رہا۔ بالکل بھی نہیں دندناتا پھروں گا، آرام سے بیٹھا رہوں گا۔'' وہ فوراً بولا پھر ان کی ہمدردیاں بٹورنے لگا۔

''اب دیکھو نا، کمبائن فنکشنز ہیں، دونوں گھروں کے مہمان بھی ایک ہی ہیں۔ اوپر سے میری مما اور ابو بھی یہیں موجود ہیں۔ اور میں جو اس تقریب کا ایک اہم کردار ہوں، مجھے وہاں گھر بٹھا رکھا ہے۔''

''بیٹھنے دو نا ثمین!'' شفق کو ترس آ گیا تھا۔

اور وہ سب کورس میں شکریہ ادا کرتے ثمین کے اجازت مرحمت فرمانے سے پہلے ہی صوفوں پر براجمان ہو گئے۔

''اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم لوگ یہاں صرف انجوائے کرنے کے لئے بیٹھے رہو گے بلکہ یہاں مقابلہ ہوگا۔ ایک گانا ہم گائیں گی اور ایک گانا تم لوگ۔''

ثمین نے شروطِ حل پیش کیا تھا جسے فوراً بلکہ جوش و خروش کے ساتھ قبول کر لیا گیا۔

''یہ کیا بے وقوفی ہے؟'' صبیرہ نے دبے لفظوں میں اسے سرزنش کی مگر وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ابھی دیکھنا کیسے میدان چھوڑ کر بھاگتے ہیں سب۔''

''میں نہیں گا رہی۔'' وہ اٹھنے کی تیاری میں تھی۔ ثمین نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر کچا چبا جانے والے انداز میں کہا۔

''تمہارے تو اچھے بھی گائیں گے۔''

''کم آن صبی! اپنی زندگی کو اپنے طریقے اور اپنی خوشی سے گزارو۔ کسی کو خود پر حاوی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' شفق نے بھی دھیمی آواز میں اسے سرزنش کی تو ناچار اسے وہیں بیٹھنا پڑا تھا۔

اور پھر ثمین اور شفق کی آواز میں آواز ملاتے وہ کئی بار بے ربط ہوئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اسے بار بار شک ہو رہا تھا کہ سامنے بیٹھے بظاہر ثوبان سے باتوں میں مصروف ایڈی

کی پوری توجہ اسی کی طرف ہے۔

''چلو بھئی۔اب بے سُرے گروپ کی باری ہے۔'' گانا ختم کرتے ہی ثمین نے شور مچایا تھا۔

''حد ادب گستاخ لڑکی! تمہیں خبر نہیں ہے کہ ہمارے گروپ میں سُر اور تال کی کوئی کمی نہیں۔'' ثوبان نے رعب سے کہا تھا۔

''بالکل جی۔تان سین بھی انہی کے گروپ میں سے تھا۔'' ان کی کسی کزن نے سر دُھنا تھا۔

''چل بھئی میرے شیر......'' ثوبان نے اپنے متوقع ''شہ بالے'' کے کندھے پر ہاتھ مارا تو وہ جیسے تیار ہی بیٹھا تھا۔

''تیرے گھر آیا میں آیا تجھ کو لینے
دل کے بدلے میں دل کا نذرانہ دینے
ماتھے کی بندیا کیا کہتی ہے سُن سُن سُن
ساجن جی گھر آئے، ساجن جی گھر آئے
دُلہن کیوں شرمائے، ساجن جی گھر آئے''

غیر متوقع طور پر اس کی آواز کافی اچھی تھی۔اوپر سے گانا بھی چن کر گا رہا تھا۔ثمین اور شفق کے ساتھ دوسری لڑکیوں نے بھی اس کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔

''اے دل چلے گا نہ اب کوئی بہانہ
گوری کو ہو گا اب ساجن کے گھر جانا
میری ہر دھڑکن کیا بولے ہے سُن سُن سُن
ساجن جی گھر آئے، ساجن جی گھر آئے
دُلہن کیوں شرمائے، ساجن جی گھر آئے''

سب نے تالیاں بجا کر اسے داد دی تھی۔

''ثابت ہوا کہ میں زندگی کے کسی بھی شعبے میں گولڈ میڈل پا سکتا ہوں۔'' وہ مسکراہٹ دبا تا صبیرہ کو زہر لگا تھا۔

''میں زارا کے پاس جا رہی ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

'ہارتو اس لڑکی سے برداشت ہی نہیں ہوتی۔' ایڈی نے بے ساختہ سوچا تھا۔

''شکر ہے، کسی کو تو میرا خیال آیا۔'' زارا بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔اسے دیکھ کر طمانیت کی سانس لی۔

''وہاں ایڈی محترم جو اپنے گروپ سمیت براجمان ہو چکے ہیں۔'' وہ جلے کٹے انداز میں کہتی کرسی میں دھنس گئی۔

''صبی پلیز، ان چند دنوں میں تو یہ اختلافات بھول جاؤ۔اس فنکشن کو دل سے انجوائے کرو۔'' زارا نے منت کی تھی۔

''میں کب کچھ کہہ رہی ہوں؟ وہی خوامخواہ طنزیہ جملے کستا رہتا ہے۔'' اس نے ناگواری سے کہا تھا۔

''وہ طنزیہ جملے نہیں کستا بلکہ تم اس کی ہر بات کو نگیٹو لیتی ہو۔وہ اتنا برا نہیں ہے صبی! جتنا تم اسے سمجھتی ہو۔'' زارا نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تھا۔اسے گلہ ہونے لگا۔

''یہ اچھی رہی۔دوست تم میری ہو اور فیور میں ایڈی کی ہو۔''

''یہ بات نہیں ہے اسٹوپڈ!'' زارا کو اس کی خفگی پر پیار آ گیا تھا۔''میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اپنی بے حد جذباتیت چھوڑ کر پریکٹیکل ہو جاؤ۔اس کے ساتھ تمہارا مقابلہ صرف تقریری میدان میں ہونا چاہئے نہ کہ ہر وقت آستینیں چڑھا کر جنگ کے لئے تیار۔''

''مگر مجھے وہ شخص سخت ناپسند ہے۔'' اس نے پُر زور انداز میں کہا تو زارا نے بہت تحمل سے پوچھا۔

''اگر پرسنیلٹی کے لحاظ سے بات کی جائے تو ایڈی کو پورے سو میں سے سو ہی ملتے ہیں۔تم کس لحاظ سے ناپسند کرتی ہو اسے؟''

''اس کے فضول اور فرسودہ خیالات کی وجہ سے۔''

''وہ خیالات جو تقریری مقابلوں کے دوران تمہارے سامنے آئے ہیں، عام زندگی میں تو اس کا رویہ بالکل ہم لوگوں جیسا ہی ہے۔پھر یہ خوامخواہ کی اٹھا پٹخ کیوں......؟'' زارا نے اس کی بات کاٹ کر کہا تو وہ بیزار ہونے لگی۔

''بس مجھے اس کی باتیں غصہ دلا دیتی ہیں۔''

''اپنی اس عادت کو بدلو صبیرہ! ایگزیمز میں تھوڑے ہی دن باقی ہیں، بعد میں فقط یادیں ہی رہ جائیں گی۔انسان کو ہمیشہ دوستوں کی طرح بچھڑنا چاہئے تاکہ بعد میں اپنی غلطیوں پر پشیمانی نہ ہو۔'' زارا نے ناصحانہ انداز میں اسے سمجھایا تھا۔

''اس شخص کے متعلق میں جو سوچتی سمجھتی ہوں وہ بالکل ٹھیک ہے۔میں کبھی چہروں سے دھوکا نہیں کھاتی زارا! میں جانتی ہوں کہ میں اپنی اس سوچ پر کبھی نہیں پچھتاؤں گی۔وہ شخص کبھی میرا دوست یا خیر خواہ ہو ہی نہیں سکتا۔'' اس نے سختی سے کہا تو زارا اس کا چہرہ دیکھے گئی۔پھر آہستگی سے بولی۔

''کبھی کبھار ہم چہروں سے دھوکا بھی تو کھا جاتے ہیں صبی! ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے بارے میں بہتر ہی سوچتا ہو۔''

''ہنہ......دنیا میں وہ میرا واحد دشمن ہے۔'' استہزائیہ انداز میں اس پر واضح کیا تھا۔

''تم شہباز گردیزی سے ملی تھیں......'' زارا کے انداز میں تجسس نہیں بلکہ یقین تھا کہ اس کی معلومات بالکل سچی ہیں۔

وہ چڑ گئی۔

''ابھی بھی تم کہتی ہو کہ وہ بہت ''معصوم بچہ'' ہے۔صرف ایڈی ہی نے مجھے اس کے ساتھ بات کرتے دیکھا تھا۔مجھے پتہ تھا کہ وہ اس خبر کو گزشتہ بار کی طرح پوسٹرز کی طرح ہر جگہ استعمال کرے گا۔''

''فضول مت بولو۔تمہیں پتہ تو ہے شہباز گروپ کی ریپوٹیشن کا۔پھر کیا ضرورت تھی اس کے ساتھ گفتگو کرنے کی؟'' زارا نے اسے ڈپٹ دیا تھا۔وہ تلخی سے بولی۔

''اگر میں ایڈی کے ساتھ بات کرتی تو وہ بہت خوش ہوتا کیونکہ اس کے ساتھ گفتگو کرنے سے ایمان کو کوئی خطرہ نہیں۔مگر کسی اور سے دوستانہ گفتگو کر لو تو اسے تکلیف ہونے لگتی ہے۔''

''وہ اس لئے کہہ رہا تھا کیونکہ اسے تمہاری فکر ہے۔'' زارا بے ساختہ بولی تو اسے کرنٹ سا لگا۔

''اسے میری فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔میں کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہوں جو وہ باڈی گارڈ بننے کی فکر میں رہتا ہے۔اس وقت بھی یوں سر پر کھڑا تھا جیسے شہباز گردیزی مجھے اغوا کرنے والا ہو۔''

''تمہیں تو ایڈی ہی سمجھا سکتا ہے۔میرا دماغ اتنا کام نہیں کرتا۔'' زارا نے تنگ آ کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔وہ غصے سے بولی۔

''وہ مجھ سے بات تو کرے، میں اس کا سر پھاڑنے سے بھی دریغ نہیں کروں گی۔ایک آدھ بار مدد کیا کر دی موصوف نے، خود کو خدائی فوجدار ہی تصور کر بیٹھے ہیں۔''

ثمین اور شفق نے واپس آ کر اس کی خوب کھنچائی کی تھی۔

''ایڈی نے تمہارے یوں اُٹھ جانے کا اتنا مذاق بنایا۔وہ تو خوش ہو رہا تھا کہ مخالف پارٹی میدان چھوڑ کر بھاگ گئی، مقابلہ جیت گئے لڑکے۔'' شفق نے اسے چڑایا تو اسے غصہ تو بہت آیا مگر وہ بولی کچھ بھی نہیں تھی۔مگر دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ آئندہ دنوں میں ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گی جس سے ایڈی کو کوئی کمینی سی خوشی ملے۔

زارا نے اسے اپنے ساتھ جیولر شاپ تک چلنے کو کہا تو وہ فوراً تیار ہو گئی۔

''ویسے تمہیں تو آنٹی نے باہر جانے سے منع کر رکھا ہے نا۔'' اسے یاد آیا تھا۔

''نہیں۔بتا کون رہا ہے؟'' اس نے صبیرہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہمراہ گھسیٹا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر ڈرائیور کی بجائے ایڈی کو براجمان پا کر وہ کوفت سے زارا کو دیکھنے لگی مگر اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔وہ بھی اپنے ناگوار تاثرات دباتی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

'مجھے بھی خوامخواہ غصہ دکھا کر اس شخص کو اہمیت دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔' سوچتے ہوئے اس نے خود کو پُرسکون محسوس کیا تھا۔چوکیدار نے گیٹ وا کیا تبھی جانے زارا کو اچانک کیا یاد آ گیا۔

''میں بس ابھی دو منٹ میں آئی۔''

وہ گاڑی سے نیچے اتر گئی۔صبیرہ کے مزید کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وہ کوریڈور کا دروازہ کھولتی اندر چلی گئی تھی۔

حیرت اور بے یقینی کا دوسرا جھٹکا تو تب لگا جب ایڈی گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل آیا تھا۔

وہ یکلخت حواس میں لوٹ آئی۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم......؟'' اس نے بے حد درشت لہجے میں پوچھا تھا۔

......

گل ترا رنگ چرا لائے ہیں گلزاروں میں
جل رہا ہوں بھری برسات کی پھواروں میں

مجھ سے کترا کے نکل جا مگر اے جانِ حیا
دل کی لو دیکھ رہا ہوں تیرے رخساروں میں
مجھ کو نفرت سے نہیں، پیار سے مصلوب کرو
میں تو شامل ہوں محبت کے گناہ گاروں میں

اس کے بے حد فریش موڈ کے برعکس تابندہ سخت جھنجھلاہٹ کا شکار تھی۔ اس کی گنگناہٹ پر ترچھی نظروں سے اسے دیکھا اور چڑ کر بولی۔

''آپ تو یوں خوش ہو رہے ہیں جیسے قید خانے سے رہائی کا اذن مل گیا ہو۔''

اس کی بات پر چند ثانیے اسے گہری نظروں سے دیکھنے کے بعد وقار علی نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے مقابل بٹھا لیا۔

''کس کافر کا جی چاہ رہا ہے تمہیں چھوڑ کر جانے کو۔ مگر میری جان! حالات ہی ایسے ہیں کہ فی الحال بے جی کی مزید ناراضگی افورڈ نہیں کر سکتا۔''

''تو لعنت بھیجیں اس نوکری پر۔ اتنی زمینیں، اتنی جائیداد آخر کس کے لئے ہے؟'' وہ بے حد مضطرب تھی۔

زرد لباس میں صحت و شادابی کا مرقع لگ رہی تھی۔ بے فکری کے دنوں اور محبتوں کی فراوانی نے اس کے حُسن کو مزید جلا بخش دی تھی۔ مگر شمالی علاقہ جات سے لوٹتے ہی اگلے دن وقار علی نے شہر روانگی کی تیاری شروع کر دی وہ بھی تنہا تو وہ یکلخت مرجھا سی گئی تھی۔

''یوں تو مت کہو۔ اگر یہ نوکری نہ کر رہا ہوتا تو تم سے ملاقات کیسے ہو پاتی؟'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر مضبوط گرفت میں لئے اسے بہلا رہا تھا۔

''تو پھر مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔ میں یہاں اکیلی رہ کر کیا کروں گی؟''

''بات سمجھنے کی کوشش کرو تابی! سب ہم سے کتنے بھی خوش کیوں نہیں مگر دلوں میں جو ایک بات رہ گئی ہے اس سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اعزاز کی قربانی رائیگاں جائے۔''

وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ تابندہ چونکی۔

''کون سی قربانی؟''

''اپنی محبت کی قربانی۔'' وقار علی کی آنکھوں میں درد آمیز اضطراب کروٹیں لینے لگا تھا۔

''اُس نے میری خاطر اپنی محبت چھوڑ کر فوزیہ کو اپنایا ہے۔ اس گھر کو دولخت ہونے سے بچایا ہے۔ اب میری باری آئی ہے تو میں کیسے پیچھے ہٹ جاؤں تابی!''

''مگر میرے یہاں رکنے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟''

''بہت بڑا فرق پڑے گا تابی! تمہیں یہاں اس گھر میں رہ کر سب کے دلوں میں اپنی حقیقی جگہ بنانی ہے تا کہ سب کو احساس ہو سکے کہ میرا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ اعزاز علی کی ناشاد زندگی کا بوجھ مستقلاً میرے سینے پر دھرا ہے۔ ہم دونوں سرخرو ہوں گے تو اس کی قربانی بھی رائیگاں ہونے سے بچ جائے گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے وقار! لیکن میں یہاں آپ کے بغیر......''

''میں بھی تو دل پر جبر کروں گا۔ میرے لئے بھی یہ جدائی سوہانِ روح ہوگی۔ مگر فقط ایک ہفتے ہی کی تو بات ہے۔ ہر ویک اینڈ پر یہاں موجود ہوں گا۔ اور یوں بھی تم نے سنا نہیں کہ

دُور جاؤں تو اور بھی یاد آؤ گی
فاصلے قرب کی بنیاد ہوا کرتے ہیں

اس نے شعر میں اپنی مرضی کی ترمیم کرتے ہوئے مسکرا کر کہا مگر وہ مسکرا بھی نہیں پائی تھی۔

اتنے سارے اجنبی لوگوں اور نامانوس ماحول میں وقار علی کے بغیر رہنا اسے ایک امتحان ہی لگ رہا تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ اب تک کسی نے اسے اجنبیت کا احساس نہیں دلایا تھا۔ سبھی اسے ایک نئی نویلی بہو کے طور پر ٹریٹ کر رہے تھے۔ مگر اس کے لئے تو وقار علی سے بڑھ کر کوئی بھی نہیں تھا جس کے لئے وہ اپنی محبتوں بھری ٹھنڈی چھاؤں ٹھکرا آئی تھی۔ اس کی ذہنی رو بھٹکی تو یکلخت ہی اسے دھیان آیا۔

''اتنے دن ہو گئے وقار! آپ نے وعدہ کیا تھا امی ابو کو منانے کا۔ اور ہم نے انہیں ایک فون تک نہیں کیا۔ یوں کرتے ہیں کہ ان کی طرف چلتے ہیں۔'' وہ پھول کی طرح کھل اٹھی تھی۔ اور یہی وہ مشکل لمحہ تھا جسے وقار علی ٹالتا آ رہا تھا۔ سنبھلتے ہوئے سرسری انداز میں بولا۔

''چلے چلیں گے کسی روز۔ تم فی الحال فون پر ان سے بات کر لو۔''

تابندہ نے خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے کھینچ لیا۔

''آپ اپنی بات سے مکر رہے ہیں۔''

''میں مکر نہیں رہا تابی! اچھا یوں کرتے ہیں کہ ابھی تو کل میں آفس جا کر چارج سنبھالوں گا۔ ویک اینڈ پر ہم دونوں جا کر امی ابو کو منا لیں گے۔''

اس نے فوراً مصالحانہ انداز اپنا لیا تو تابندہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی جو وقار علی کی روح تک کو سرشار کر گئی تھی۔ اسے خود سے قریب کرتے ہوئے وہ بھی کھلے دل سے مسکرا دیا تھا۔

''تیری آنکھوں نے میرے گرد اک دیوار کھینچی ہے
میں اس سے بھاگ کر جانا بھی چاہوں تو کہیں اب جا نہیں سکتا
کہ پیروں سے کوئی زنجیر بے آواز لپٹی ہے
یہ وہ دیوار ہے جس میں کوئی روزن نہیں کھلتا
میں اس میں در بناتا ہوں تو ہر ایک خشت میرا راستہ رو کے
میرے کانوں میں ایک پُر کیف سی آواز آتی ہے
یہاں سے بھاگ کر جانا کوئی آسان نہیں ہے
محبت اس قدر کمزور میری جاں نہیں ہے''

وہ اس کے دلکش لہجے کی سچائیوں میں جکڑتی جا رہی تھی۔ جیسے صرف اس کی محبت ہی دنیا کی واحد سچائی ہو۔ اس کا روم روم مشک بُو ہو اٹھا تھا۔ ایسے لمحوں میں جب وقار علی کی خود سے محبت پر ناز اں ہوتی تو دنیا کا ہر زیاں اسے ہیچ لگنے لگتا تھا۔

اس کے شانے پر سر ٹکائے وہ اس پل بھی انہی لمحوں کے حصار میں تھی۔

شام کو وہ لاہور جانے کو تیار تھا۔

اور کتنی ہی بار تابندہ کی آنکھیں بھر بھر آئی تھیں۔ سب گھر والوں سے مل کر وہ پھر اس کے پاس آیا تو اس کی روئی صورت اور بھیگی پلکیں دیکھ کر ہنس دیا۔

''میں خواہ مخواہ پریشان ہو رہا تھا۔ اچھا ہے، چند دنوں کی جدائی آئے گی تو ہم محبت کی قدر کرنا سیکھیں گے۔''

وہ جس قدر شگفتگی کا مظاہرہ کر رہا تھا، اسی قدر بے چین و بے قرار تابندہ تھی۔

''میں یہاں کیا کروں گی وقار! آپ کے بغیر۔''

''تم صرف اتنی مہربانی کرنا کہ رونا مت۔ ورنہ میں وہاں بہت بے چین رہوں گا۔'' پھر بہت نرمی سے اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کی آنکھوں کی نمی خشک کرنے لگا۔ وہ بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی تھی۔ پھر وہ چلا گیا۔

☆......☆

''میں کہتی ہوں گاڑی روکو ایڈی!''

وہ دفعتہً چلا اٹھی تو وہ گاڑی کی اسپیڈ کم کرتے ہوئے ناگواری سے اسے چہرہ موڑ کر دیکھنے لگا۔

''کبھی تو سکون سے بھی بات کر لیا کرو۔''

''مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔ آخر اس بیہودہ حرکت کا مطلب کیا ہے؟'' اس کا پارہ ہائی ہو رہا تھا۔ ایڈی کی جرأت پر اسے حیرت ہو رہی تھی۔

''تمہیں نہ سہی مگر مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' اس کی نسبت وہ بے حد پُرسکون تھا۔ بہت آرام سے گاڑی ڈرائیو کرتا وہ ذرا بھی گھبراہٹ یا پشیمانی کا شکار نہیں لگ رہا تھا۔

''تمہاری بات سب کی موجودگی میں بھی ہو سکتی تھی۔ اس کے لئے یہ سب...... زارا کیا سوچ رہی ہوگی، اس کا اندازہ ہے تمہیں؟'' اس کو خود پر قابو پانا مشکل ہو رہا ہوتا۔

''وہ سب کچھ جانتی ہے۔''

اس کے طمانیت بھرے انداز نے صبیرہ کو شدید جھٹکا پہنچایا تھا۔

''کیا؟''

''ہر کوئی تمہاری طرح بہادری کا جھنڈا اٹھائے چوٹیاں سر کرنے کو تیار کھڑا نہیں ہوتا صبیرہ علی! بعض لوگ عقل کو بہر طور حاضر و ناظر رکھتے ہیں۔''

وہ کہہ رہا تھا۔ وہی اس کا مخصوص طنزیہ لب و لہجہ۔ مگر فی الوقت تو وہ پہلے ہی جھٹکے سے نہیں سنبھل پائی تھی۔

''کیا تم زارا کو بتا کر مجھے یوں ساتھ لائے ہو؟''

''یقیناً'' وہ فوراً بولا تھا۔ پھر جتانے والے انداز میں بولا۔ ''دھوکا دہی میری سرشت میں شامل نہیں ہے۔''

''اور جو تم میرے ساتھ کر رہے ہو اسے کیا نام دو گے؟'' وہ تلخی سے بولی تھی۔

''کسی کو گڑھے میں گرنے سے بچانے کے لئے چھوٹا موٹا دھوکا تو شاید نیکی ہی کہلائے گا۔'' اس نے لاپروائی سے کہا تو وہ لب بھینچے بمشکل خود پر قابو پانے لگی۔ وہ خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔

''اگر اب بھی تم اپنی فضول گفتگو ترک کر کے سیدھی بات کی طرف نہیں آئے تو میں یہیں گاڑی سے اتر جاؤں گی۔'' اس نے اٹل لہجے میں کہا تو لحظہ بھر کے توقف کے بعد اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''شہباز گردیزی تم سے کس بارے میں بات کر رہا تھا؟''

وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ پھر سلگانے والے انداز میں بولی۔

''وہ کچھ بھی کہہ رہا تھا، اس میں تمہارا نام کہیں بھی نہیں تھا۔ سو تم سے مطلب......؟''

''اس کی ریپوٹیشن تم بھی جانتی ہو صبیرہ!'' وہ بہت ضبط سے بولا تھا۔

''میں نہیں جانتی۔ بلکہ ہم سب کو وہی کچھ معلوم ہے جو تم نے بتا رکھا ہے۔'' اس نے تصحیح کی۔ گویا اس پر واضح کیا کہ اس کے الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

ایڈی نے بے اختیار ایک سائیڈ پر گاڑی روک دی تھی۔ پھر پلٹ کر تیز نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''تمہارا کیا خیال ہے۔ میں نے اس سے متعلق غلط انفارمیشنز تمہارے گروپ تک پہنچائی ہیں؟''

''ہو سکتا ہے۔'' وہ کمال بے نیازی سے بولی۔ ایک مقصد اس کو غصہ دلانا بھی تھا۔ پھر جتلانے والے انداز میں کہا۔ ''تم دونوں کی آپس میں کبھی بنی ہی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اسی دشمنی میں تم نے اس کی ریپوٹیشن بگاڑ دی ہو۔''

چند لمحے تیز نظروں سے اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ تلخی سے بولا۔

''بنی تو کبھی میری تمہارے ساتھ بھی نہیں صبیرہ علی! پھر میں کیوں تمہارے پیچھے خوار ہوتا پھر رہا ہوں۔ کبھی اس پر بھی غور کیا ہے تم نے؟''

وہ گڑبڑا کر اسے دیکھنے لگی۔

کچھ تھا اس کے لب و لہجے میں، اس کے انداز و الفاظ میں اور اب اس کی آنکھوں میں سلگتی عجیب سی کیفیت میں۔

صبیرہ کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا تھا۔ پھر اس عجیب سے احساس پر ناگواری غالب آنے لگی۔

''میرے پیچھے خوار ہونا تمہاری مجبوری ہے۔ ورنہ تم مجھے نیچا کیسے دکھا پاؤ گے؟ تم ہر وقت مجھے نیچا دکھانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہو۔''

ایڈی کا جی چاہا بدگمانی کی دھول میں لپٹی اس چھٹانک بھر کی لڑکی کا دماغ ٹھکانے لگا دے۔ کس قدر غلط انداز فکر رکھتی تھی وہ۔

''میں...... میں تمہیں نیچا دکھانے کی کوشش کرتا ہوں؟'' وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ صبیرہ کی بیوقوفی بھری گفتگو پر اسے شدید غصہ آیا تھا۔

''میں ایسی گھٹیا سوچ کا مالک ہوتا تو کبھی بھی آگے بڑھ کر تمہاری مدد نہ کرتا۔ اس روز کنسرٹ میں بھی تم نے یہی فضول بات کہی تھی اور اس سے پہلے بھی۔ میں بھی کہہ سکتا ہوں صبیرہ علی! کہ میں نے وہ قصہ یونیورسٹی میں نہیں پھیلایا تھا۔ میرے بعد تو تمہی رہ جاتی ہو اس واقعے کی عینی شاہد۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ میں؟'' وہ تلملا اٹھی تھی۔ ''میں نے خود کو اسکینڈلائزڈ کیا تھا؟''

''اگر تم مجھے مورد الزام ٹھہرا سکتی ہو تو پھر مجھے اپنا خیال ظاہر کرنے سے کون روک سکتا ہے؟'' وہ بے نیازی سے کہہ رہا تھا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ تمہیں اس سے بھی گھٹیا سوچنے کی آزادی حاصل ہے۔'' وہ سرتاپا جل رہی تھی۔ پھر دروازہ کھول کر گاڑی سے اترنے کی کوشش کی مگر لاک نہیں کھلا تھا۔

''لاک کھولو......'' وہ درشتگی سے بولی مگر وہ اب اطمینان سے سیدھا بیٹھا اسٹیئرنگ پر انگلیاں بجا رہا تھا۔

''شہباز گردیزی تم سے کس این جی او کو جوائن کرنے کی بات کر رہا تھا؟''

بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ دفعتہً کیا جانے والا سوال اسے تڑخا گیا۔

''جب اتنی سولڈ انفارمیشن حاصل کر لی تو اس روز ذرا سی بات کا بھی پتہ چلا لیتے۔''

''یہ انفارمیشن مجھے زارا نے دی ہے۔'' اس نے وضاحت کی تھی۔

''میں نے ثمین کو سب بتا دیا تھا۔ باقی ہر ایرے غیرے کو میں اپنے معاملات میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دے سکتی۔'' وہ غصے سے بولی تو وہ حیران سا اس کی طرف پلٹا۔

''میں نے ثمین سے پوچھا تھا مگر وہ تو مکمل لاعلمی کا اظہار کر رہی تھی۔''

صبیرہ کو یک گونہ سکون کا احساس ہوا تھا۔

''وہ مجھے اچھی طرح سمجھتی ہے۔ اسی لئے اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا ہوگا۔'' وہ جتلانے والے انداز میں بولی تھی۔ ایڈی کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔

''مگر وہ مجھ سے کچھ بھی چھپا نہیں سکتی۔ پھر یہ سب کیوں؟''

''کبھی اپنی بنائی ہوئی جنت میں سے نکل بھی آیا کرو ایڈی! ہر کوئی تمہارے حکم کا غلام نہیں ہے کہ ہر وقت جی حضوری میں لگا رہے۔'' اس نے تلخی سے کہا تھا۔

''بہر حال میں صرف اس پرپوزل سے متعلق جاننا چاہتا ہوں جو شہباز گردیزی نے تمہارے سامنے رکھا تھا۔''

اس کا لب و لہجہ نظر انداز کرتے ہوئے وہ اٹل انداز میں بولا تو بمشکل غصہ ضبط کرتے ہوئے مجبوراً اسے بتانا ہی پڑا۔

''ویمن رائٹس یونین...... ہاہ......'' اس کی آنکھوں اور لہجے میں اترنے والا تمسخر صبیرہ کی روح کو جھلسانے لگا۔

''کس دنیا میں رہ رہی ہو صبیرہ علی؟ وہ شخص جو عورت کی عزت کرنا بھی نہیں جانتا کجا عورت کے حقوق کی بات کرے۔ کیا حماقت ہے؟'' وہ جیسے اس کی بے وقوفی کا مذاق اڑا رہا تھا۔

''وہ چاہے جیسا بھی ہے مگر اس نے ایک اچھا قدم اٹھایا ہے تو میں ضرور اس کا ساتھ دوں گی۔'' صبیرہ کو اپنی پیشانی سلگتی محسوس ہو رہی تھی۔

''اس سے برا تو شاید تم اپنی پوری لائف میں نہیں کرو گی۔'' اس نے پُریقین لہجے میں کہا تو وہ گہری سانس اندر کھینچتی اسے دیکھتے ہوئے کڑوے لہجے میں بولی۔

''تمہیں یہ کام اچھا بھی کیسے لگ سکتا ہے؟ تمہارا بس چلے تو تم ساری دنیا کی عورتوں کو ریت میں دبا دو۔ اگر تم اپنے گھر کی عورتوں کو ان کے حقوق نہیں دے سکتے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم پوری دنیا کی عورتوں کے حقوق غصب کرنے کی بات کرو۔''

''میرے گھر کی عورتیں جس مقام پر ہیں وہاں بہت خوش اور مطمئن ہیں۔ انہیں نہ تو پردے کا کمپلیکس ہے اور نہ ہی آزادی کی کمی کا۔ یہ تو فارغ لوگوں کے دماغ کا کیڑا ہے۔ جب تم ویمن رائٹس کی بات کرتی ہو تو میرے ذہن میں ایک عورت کے ساتھ عزت و احترام، اچھی تعلیم و تربیت اور چادر اور چار دیواری میں رہ کر اپنی اولاد کی تربیت کرنا ہی نقش ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر ایک عورت کیا آزادی چاہ سکتی ہے؟'' وہ ناگواری سے کہہ رہا تھا۔

''ہنہ......'' وہ تنک کر سر جھٹکتی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

''اچھا تو اس ''ویمن رائٹس یونین'' کا آفس کہاں واقع ہے؟'' قدرے توقف کے بعد اس نے معتدل لہجے میں پوچھا تھا۔

ایک تو اس بندے کو اپنے جذبات پر اس قدر کنٹرول حاصل تھا کہ حد نہیں۔ پل میں تولہ، پل میں ماشہ والا محاورہ اس پر بالکل فٹ بیٹھتا تھا۔ ابھی غصہ دکھا رہا ہوتا تھا کہ ساتھ ہی بے حد پُرسکون ہو جاتا تھا۔

عجیب دھوپ چھاؤں کا سا امتزاج تھا اس کی فطرت میں۔ ہر انداز اس قدر اٹل کہ سامنے والا بے بس ہو کر رہ جائے۔

اس وقت یہی حال صبیرہ کا بھی تھا۔

اس کا خون رگوں میں جوش کھانے لگا۔ مگر فی الحال وہ اس سے مزید الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ سو خاموشی سے بیگ میں سے شہباز گردیزی کا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

کارڈ پر نظر دوڑا کر وہ الجھن بھرے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

''یہ وہی وزیٹنگ کارڈ ہے جو اس نے تمہیں دیا تھا؟''

''یہ اس کی آنٹی کا وزیٹنگ کارڈ ہے۔ وہ وکیل بھی ہیں اور ساتھ میں اس یونین کی صدر بھی۔'' وہ بہت چڑ کر بولی تھی۔

وہ سیدھا ہوتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ پھر اونچی آواز میں بولا۔

''چلو ذرا چل کے تمہاری ''یونین'' کا آفس دیکھ آتے ہیں۔''

''مجھے اب گھر جانا ہے۔ جب مجھے آنا ہوگا، میں خود آ جاؤں گی۔'' وہ تیز لہجے میں بولی مگر وہ اس کی بات پر کان دھرے بغیر اسے لئے ایک پوش ایریا میں نکل آیا۔ خوبصورت کوٹھیوں اور سبزے سے سجا ایریا بے حد خوبصورت لگ رہا تھا۔

ایڈی نے ایک وسیع و عریض کوٹھی کے سامنے گاڑی روک دی تھی۔ مضبوط سیاہ گیٹ کے باہر کرسی پر باوردی گن مین اپنی گن پر ہاتھ رکھے الرٹ بیٹھا تھا۔

''یہ ہے خواتین کے حقوق کی خاطر لڑنے والی صدر صاحب کا غریب خانہ۔''
اس کے طنزیہ انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے صبیرہ نے لاپروائی سے کہا۔
''ظاہر ہے، کوئی حسب نسب والی عورت ہی یہ کام کرسکتی ہے۔ جن کے پاس وسائل کی کمی نہ ہو، جو صرف لفظوں ہی سے نہیں بلکہ روپے پیسے سے بھی عورتوں کے مسائل حل کرسکیں۔ خوب صورت گھر ہے ان کا۔''
''خوب صورت گھر نہیں، عیاشی کا اڈہ ہے۔'' وہ بے حد تلخی و ترشی سے کہتا اس کی طرف پلٹا تو صبیرہ کو لگا جیسے ہفت آسمان اس کے سر پر آن گرے ہوں۔

......

بہت بے دردی سے دروازہ دھڑ دھڑائے جانے پر تابندہ کی آنکھ بمشکل کھلی تھی۔
رات پہلی بار وقار علی سے جدائی کے باعث نیند تا دیر اسکی آنکھوں سے روٹھی رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جلدی اٹھ نہیں سکی تھی۔ مگر جس طرح دروازہ بجایا جا رہا تھا اس کی آواز تو مُردوں کو جگانے کے لئے بھی موثر تھی۔ اس نے تیزی سے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے فوزیہ اپنے پورے طمطراق کے ساتھ کھڑی تھی۔
''آدھے گھنٹے سے میں دروازہ کھٹکھٹا رہی ہوں۔ لگ رہا ہے کوئی نشہ کر کے سوئی تھیں۔''
تابندہ کو اندازہ نہیں ہوسکا کہ وہ طنزاً بات کر رہی ہے یا مذاقاً۔
''رات دیر سے سوئی تھی نا اس لئے آنکھ نہیں کھلی۔'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی وضاحت دے گئی تھی۔
''خیر تو ہے...... اب تو وقار علی بھی یہاں نہیں۔'' اس کا معنی خیز انداز تابندہ کو پسند نہیں آیا تھا۔ اوپر سے اس کی چبھتی نظریں۔
''یہ ثریا ہے۔ یہاں کی جھاڑ پونچھ کا کام اسی کی ذمہ داری ہے۔ آج تو میں اسے لے آئی مگر آئندہ سے تم خود اس کے سر پر کھڑی ہو کر اپنا کمرہ صاف کرایا کروگی۔ اور ذرا ٹائم پر سونے، اٹھنے کی عادت ڈالو۔ اس گھر کے مردان باتوں کو پسند نہیں کرتے کہ عورتیں دن چڑھے تک سوتی رہیں۔ ویسے مجھے تو تمہیں یہ سب بتانے کا کوئی شوق نہیں مگر شاید بے جی کہتیں تو تمہیں زیادہ برا لگتا۔ بھئی شہری لوگوں کے تو نخرے ہی اور ہوتے ہیں۔''
وہ عجیب تحکمانہ سے انداز میں کہہ رہی تھی۔
اس کے انداز میں جو بات تابندہ کو سب سے زیادہ محسوس ہو رہی تھی وہ اس کے لب و لہجے سے جھلکتا تمسخر تھا۔
''ایسی کوئی بات نہیں۔ بے جی میری ماں جیسی ہیں۔ وہ جیسے چاہیں مجھے سمجھا سکتی ہیں۔''
نوکرانی کے سامنے اس طرح کی ''جھاڑ پونچھ'' نے اسے الرٹ کر دیا تھا۔ سنبھل کر بولی تو وہ ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھ کر بولی۔
''ماں جیسی ہیں، ماں تو نہیں ہیں نا۔''
''یہ تو اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔ ورنہ میں انہیں اتنی ہی عزت دیتی ہوں جتنی کہ وقار دیتے ہیں۔''
''خیر، ابھی تو تمہیں بڑا وقت لگے گا اس گھر میں رچنے بسنے میں۔ خیر سے اپنی پسند کی شادی کر کے جو آئی ہو۔ ایسی غلطیاں تو سگے ماں باپ برداشت نہیں کرتے کجا سسرال والے...''
وہ بڑی چالاکی سے کہتی کانوں کو ہاتھ لگاتی چلی گئی۔
تابندہ اہانت کے شدید احساس میں گھری سرخ چہرہ لئے کچھ کہنے کو منہ کھولے کھڑی رہ گئی۔
''بس زبان ہی کی کڑوی ہیں فوزیہ بی بی! پر دل کی چنگی ہیں۔ آپ اپنا دل میلا مت کرو۔'' ثریا کی آواز اسے یکلخت حواس میں لے آئی تھی۔
''ہوں...... نہیں تو۔ تم اپنا کام کرو۔'' وہ اسے ٹالتی اپنے آپ کو سنبھالتی کپڑے نکال کر باتھ روم میں گھس گئی۔
صدیقہ بھابی نے بڑی خوش دلی سے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔
''لگتا ہے بہت اثر لے لیا ہے میرے دیور کی جدائی کا؟'' انہوں نے اس کی آنکھوں میں اتری خفیف سی سرخی دیکھ کر چھیڑا تو وہ جھینپ سی گئی۔
''بس یونہی۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔''
''ہاں چند روز تو نیند بھی تنگ کرے گی۔ اور جب عادت پڑنے لگے گی، تب وہ پھر آ جائے گا۔''
وہ شرارت سے کہہ رہی تھیں۔ تابندہ کو بھی ہنسی آ گئی۔ اسے صدیقہ بھابی اور فوزیہ کے لب و لہجے اور انداز میں بے حد فرق محسوس ہوا تھا۔ یہی باتیں فوزیہ کے ہونٹوں سے تیر کی طرح نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اور اب جبکہ وہی باتیں صدیقہ بھابی کر رہی تھیں تو ایک گدگداہٹ کا احساس ہو رہا تھا۔
''یہ رہا تمہارا ناشتہ۔'' انہوں نے اپنا مشہور زمانہ گرما گرم ورقی پراٹھا اس کے سامنے رکھا تو وہ خفیف سی ہو گئی۔
''صرف آج کے لئے۔ کل سے سب کے ساتھ ناشتہ ملے گا۔ ورنہ خود تیار کرنا پڑے گا۔'' اس کی شرمندگی سمجھ کر وہ آرام سے بولیں تو تابندہ نے خوش دلی سے کہا۔
''بالکل ٹھیک۔''
''جلدی سے ناشتہ کرو، پھر بے جی کے پاس چل کے بیٹھنا۔ جتنا ان سے نزدیک رہوگی، اتنی ہی جلدی تمام فاصلے سمٹیں گے۔'' انہوں نے ناصحانہ انداز میں کہا تو وہ بے ساختہ بولی۔
''صحیح کہہ رہے تھے وقار۔ آپ اس گھر میں میری سب سے اچھی دوست ثابت ہوں گی۔''
''ہاں بھئی۔ وقار نے کہہ دیا تو صحیح ہے۔''
ان کے انداز پر وہ جھینپی تھی۔
''بالکل نہیں۔ بلکہ میرا بھی یہی اندازہ ہے۔''
ناشتے کے بعد کتنی ہی دیر تک وہ بے جی کے پاس بیٹھی رہی۔ انہوں نے ہی چھوٹی موٹی باتیں کیں تو کیں ورنہ وہ تو حد ادب کی تفسیر بنی بیٹھی تھی۔ ایک عجیب سا رعب اسے اپنے حصار میں لئے ہوئے تھا۔
وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی بے دلی سے میگزین کے صفحات الٹ رہی تھی جب اعزاز علی چلا آیا۔
''السلام علیکم، کیا حال ہیں بھابی جان؟''
''بالکل ٹھیک۔ آپ سنائیں؟'' اس کے خوشگوار سے انداز پر مسکرا کر سلام کا جواب دیتے ہوئے اس نے پوچھا تو وہ بھی مسکرا دیا۔
''ہم کیا سنائیں گے۔ آپ سنائیں اس مجنوں کا کیا حال ہے۔ کوئی فون وون بھی کیا ہے اس نے کہ نہیں؟''
''ابھی تک تو نہیں کیا۔ آفس میں ہوں گے۔''
وہ بے ساختہ ہنس دیا۔
''بہت اچھے۔ یوں شوہر کی پردہ پوشی کرنا اچھی بیویوں کی نشانی ہوتی ہے۔''
وہ جھینپ سی گئی۔
''آپ تو اعزاز علی! جیسے اچھی بیویوں پر ریسرچ کئے بیٹھے ہیں۔ کبھی ہمیں تو بریف نہ کیا اس بارے میں۔'' فوزیہ یقیناً ان کی بات سن کر ہی اندر آئی تھی۔
جہاں تابندہ نے اپنا خون سرد پڑتا محسوس کیا وہیں اعزاز علی بھی لب بھینچ گیا تھا۔ پھر قدرے مسکرا کر بولا۔
''تم تو خود اس معاملے میں بہت سمجھدار ہو، اپنی خوبیوں، خامیوں سے اچھی طرح آشنا۔''
فوزیہ نے ایک نگاہ غلط انداز، شانوں پر دوپٹہ ڈالے صوفے پر پیر موڑے دھنسی قدرے لاپروائی سے بیٹھی تابندہ پر نظر ڈالی اور استہزائیہ انداز میں بولی۔
''خدا کا شکر ہے کہ شہر میں نہ رہتے ہوئے بھی شرم و حیا کی پاسداری کرسکتے ہیں۔ اپنی خوبیوں پر اسی لئے تو نازاں ہیں۔ ورنہ ابھی ابا جی یا تایا جی میں سے کوئی ہوتا تو یوں جیٹھ کے سامنے ننگے سر بیٹھنے پر دیورانی جی کو لائن حاضر کر دیتا۔''
تابندہ کے دل میں جیسے کسی نے تپتی سلاخ گھسیڑ دی تھی۔
خود اعزاز علی اس کی اس قدر گری ہوئی حرکت پر اہانت کا شکار ہو گیا تھا۔
''اس میں ایسی کوئی بڑی بات نہیں۔ آہستہ آہستہ یہ حویلی کے ماحول سے آگاہ ہو جائیں گی۔'' وہ تیز نظروں سے فوزیہ کو دیکھتے ہوئے بولا تھا۔
''خیر، وہ تو یہ کر ہی لیں گی۔ دل میں اترنے کا فن تو انہیں خوب اچھی طرح آتا ہے۔ جہاں وقار علی کے دل کو قابو میں کر لیا وہاں حویلی کے باقی لوگوں کا دل لوٹنا کہاں مشکل ہوگا ان کے لئے۔'' وہ بڑے بھولپن سے کہہ رہی تھی۔
اعزاز علی کے سامنے تابندہ کو یہ سب شرمندگی و ذلالت کی انتہا لگ رہا تھا۔
''تم اس معاملے میں اپنا دماغ خرچ نہ ہی کرو تو بہتر ہوگا۔'' اعزاز علی کا لہجہ سلگ رہا تھا۔
اسے درحقیقت فوزیہ کی بدزبانی پسند نہیں آئی تھی۔
''ارے آپ کیوں اپنا موڈ خراب کر رہے ہیں؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو اچھے بھلے تھے۔ اگر میرا آنا ہی ناگوار گزرا ہے تو صاف کہہ دیتے۔''
''حد ہو گئی بیہودہ گوئی کی۔'' اعزاز علی جھلاہٹ کے مارے اٹھ کر چلا گیا۔
تابندہ فق چہرہ لئے فوزیہ کو دیکھ رہی تھی جیسے اس کے ارادے کھوجنا چاہ رہی ہو مگر وہ مزید کچھ کہے بغیر مسکراتے ہوئے اعزاز علی کے پیچھے چلی گئی تھی۔ مگر تابندہ کے لئے

خوف وسراسیمگی کے بہت سے در وا کرگئی۔ وہ چاہے جتنی بھی بولڈ اور کانفیڈنٹ کیوں نہ سہی مگر گھریلو سیاست کے اس رخ سے قطعی نابلد تھی۔ اس لئے فوزیہ کا یہ رویہ اس کو تازیانے کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

۞……۞

‘‘بھابی! میں گھر فون کرلوں۔ آئی مین، امی ابو کو؟’’

اس کی جھجک کو محسوس کرتے ہوئے وہ اپنے دو سالہ بیٹے مون کو بستر پر لٹا کر اے سی کو ونگ کم کر کے اس کی طرف پلٹی تھیں۔

‘‘بالکل کرو۔ بلکہ میں تو تمہیں ڈانٹوں گی کہ اب تک تمہیں خیال کیوں نہیں آیا انہیں فون کرنے کا۔ اگر کوئی ناراضگی تھی بھی تو دور ہو جاتی۔’’

‘‘تھینک یو بھابی!’’ اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔

‘‘کس بات کا شکریہ پگلی۔ اب یہ تمہارا بھی گھر ہے۔ اور یہاں کسی بھی بات کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ بلا جھجک تم ہر چیز استعمال کرو۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔’’

وہ فون اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئی۔

اتنے دنوں بعد گھر والوں کی آواز سننے کا خیال ہی اس کے اندر کرنٹ دوڑا رہا تھا۔ اسے خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ اتنے دنوں تک وہ کیسے ان سب کو بھولی رہی تھی۔

دوسری طرف بیل کی آواز سنتے ہی اس کا دل بے ترتیبی سے دھڑک رہا تھا۔

‘‘ہیلو۔’’ امی کی آواز وہ فوراً پہچان گئی تھی۔

‘‘السلام علیکم امی! میں تابندہ بول رہی ہوں۔’’ اس کی آواز میں خود بخود دبھیگا پن اتر آیا تھا۔

فون پر یکلخت چھا جانے والی خاموشی اسے بہت محسوس ہوئی تھی۔

‘‘ہیلو……ہیلو……’’

‘‘کیوں فون کیا ہے؟’’ امی کا سرد سا لہجہ اسے الفاظ بھلانے لگا۔

‘‘یہ کیا کہہ رہی ہیں امی آپ؟ بیٹی ہوں میں آپ کی۔’’ وہ بے اختیار رو دی تھی۔ ان لوگوں نے تو پلٹ کر سر پر ہاتھ بھی نہیں رکھا تھا۔

‘‘ہماری بیٹی ہوتیں تو یوں ہماری عزت کا جنازہ نہ نکالتیں۔ ہم تو تمہیں مرا ہوا سمجھ کر صبر کر ہی چکے ہیں۔ تم بھی ہمیں مردہ سمجھ کر اپنی خوشیوں اور ارمانوں بھری زندگی گزارو۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔’’ ان کا لہجہ کہیں بھی نہیں لڑکھڑایا تھا۔ سرد وسپاٹ، بے تاثر۔

انہوں نے آج تک کبھی تابندہ سے اس لب ولہجے میں بات نہیں کی تھی۔

‘‘ہیلو، امی جی! پلیز میری بات تو سنیں۔’’ وہ تڑپ اٹھی تھی مگر ریسیور میں سے صرف ڈائل ٹون سنائی دے رہی تھی۔ وہ فون رکھ چکی تھیں۔

اس نے ری ڈائل پش کیا۔ دوسری طرف متواتر بیل جا رہی تھی مگر کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ بے اختیار روتے ہوئے وہ بار بار ری ڈائل کر رہی تھی مگر ہر بار چند گھنٹیوں کے بعد خود بخود لائن ڈس کنکٹ ہو جاتی تھی۔

‘‘یا اللہ! میں کیا کروں۔’’

اس کے دل کو اضطراب و بے چینی کے آکٹوپس نے جکڑ لیا تھا۔ یکلخت ہی احساس ہوا تھا کہ وہ پیچھے کیا کچھ کھو آئی ہے۔

صدیقہ بھابی اسے بلانے کی غرض سے آئیں تو اسے رو رو کر بے حال ہوتے دیکھ کر بے حد گھبرا گئیں۔ فوراً آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

‘‘کیا ہوا تابندہ؟ خیریت تو ہے نا؟’’ اس کی سرخ ہوتی آنکھیں ان کا دل ہولا گئی تھیں۔

‘‘امی نے مجھ سے بات تک نہیں کی بھابی!’’ دکھ کے مارے اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

‘‘توبہ ہے تابندہ! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔’’ انہوں نے بے ساختہ گہری سانس لی تھی۔ پھر اس کی پیشانی پر آئے بال سمیٹتے ہوئے پیار سے بولیں۔ ‘‘تم خوامخواہ اتنی سی بات کو دل پر لے رہی ہو۔ والدین چاہے بچوں سے کتنا ہی ناراض کیوں نہ ہوں، مگر ان کی یہ ناراضگی اوپری ہوتی ہے۔ ویک اینڈ پر وقار آئے گا تو اس کے ساتھ اپنے ابو، امی سے ملنے چلی جانا۔ دیکھنا منٹوں میں ان کی ناراضگی ختم ہو جائے گی۔’’

اس نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے آنسوؤں میں مزید روانی آگئی تھی۔

‘‘وہ بہت سخت ناراض ہیں۔ ورنہ امی نے کبھی بھی مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی۔’’

‘‘سب ٹھیک ہو جائے گا تابندہ! مانا کہ ابھی وہ لوگ غصے میں ہیں، تم تھوڑا صبر کرلو۔ کچھ دنوں تک دیکھنا، سب پہلے جیسا ہی ہو جائے گا۔’’ وہ اسے بہلا رہی تھیں۔ مگر تابندہ کا وجدان پلٹ پلٹ کر اسے کہہ رہا تھا کہ یہ سب اب بہت مشکل ہے۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

۞……۞

‘‘یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟’’ وہ بے حد بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ متاسفانہ انداز میں سر ہلا کر بولا۔

‘‘اب اس سے زیادہ کھلے الفاظ میں تمہیں کیا بتاؤں۔’’

‘‘میں کیسے مان لوں کہ تم غلط نہیں کہہ رہے؟’’ اس نے دفعتاً خود کو سنبھالتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا تو وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

‘‘اس کے لئے تو بس تمہیں میرے لفظوں پر ہی اعتماد کرنا پڑے گا۔’’

‘‘ہنہ۔’’ صبیرہ نے تنفر سے سر جھٹکا تھا۔ پھر غصے سے بھرے لہجے میں بولی۔ ‘‘تم اپنے یہ ڈرامے یونیورسٹی کے اسٹیج پر ہی کیا کرو۔ میرے سامنے ان کا کچھ فائدہ نہیں۔’’

ایڈی نے ویو مرر میں اس کے عکس پر تیز نظر ڈالی اور درشتی سے بولا۔

‘‘مجھے تمہارے سامنے کوئی ڈرامہ پلے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر میں یہ سب کہہ رہا ہوں تو اس کا ایک ایک لفظ حقیقت پر مبنی ہے ورنہ تم کوئی ایسی حسینۂ عالم نہیں ہو کہ میں تمہاری فکر میں مرتا رہوں۔ اور اگر اب بھی تم میرا یقین نہیں کروگی تو اس سے آگے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔ جو بھی پرابلم ہوئی، تمہیں خود فیس کرنا پڑے گی۔’’

‘‘مجھے تمہاری مدد کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ تم آپسی دشمنی میں اس حد تک بھی جا سکتے ہو۔’’ وہ سلگ رہی تھی۔ کتنے آرام سے وہ عورتوں کی آزادی کو ‘‘عیاشی’’ کا نام دے گیا تھا۔

ایڈی نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھائی تھی۔ اس کے بھنچے ہوئے لبوں اور پیشانی پر ابھری رگ سے اس کے شدید غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ جبکہ صبیرہ اس کے لفظوں کو سوچ کر مسلسل تلملا رہی تھی۔

اسے گیٹ کے سامنے اتار کر وہ زن سے گاڑی لے اڑا تھا۔

وہ اندر آئی تو کمرے میں فقط زارا موجود تھی جو اپنی وارڈ روب ٹھیک کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی تیزی سے اس کی طرف آئی۔

صبیرہ نے اپنے اندر ایک سرد سی کیفیت اُمڈتی محسوس کی تھی۔ زارا کا ہاتھ جھٹکتی وہ کرسی میں دھنس گئی۔ زارا کا چہرہ زرد پڑنے لگا، گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے زارا نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے تھے۔

‘‘آئی ایم رئیلی سوری صبی! میرا مقصد تمہارا دل دکھانا ہرگز نہیں تھا۔ ثوبان بھی بتا رہا تھا کہ شہباز گردیزی کی آنٹی کی ریپوٹیشن اچھی نہیں ہے۔ ایڈی نے بھی کہا تو میں نے سوچا کہ……’’

‘‘تم کب تک ثوبان اور ایڈی کی آنکھوں سے دیکھتی رہوگی زارا؟’’ وہ تلخی سے بولی تھی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں خفیف سی سرخی اتر آئی تھی۔ ‘‘جانتی ہو میں نے کس قدر توہین محسوس کی ہے تمہاری اس حرکت سے؟ وہ شخص خود کو سب کا ناخدا سمجھتا پھر رہا ہے۔ ہر وقت اپنے اصولوں اور نظریات کا جھنڈا اٹھائے پھرتا ہے جیسے اس کے سوا خدا نے کسی اور کو عقل مند بنایا ہی نہیں۔’’

‘‘سوری صبی! میرا مقصد ہرگز بھی تمہارا دل دکھانا نہیں تھا۔ وہ تمہیں سمجھانا چاہتا تھا اور بس……’’

زارا بے چاری اس سچویشن پر بوکھلا سی گئی تھی۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیسے سنبھالے۔

‘‘اٹس اینف زارا……’’ اپنی آنکھوں میں اترتی نمی کے برعکس وہ بے حد غصے سے بولی تھی۔ ‘‘میں ہر ایرے غیرے کو اپنی زندگی میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دے سکتی اور نہ ہی میں اس قدر بے وقوف ہوں کہ ہر کوئی مجھے سمجھانے کو تیار کھڑا رہے۔ سمجھا دینا تم یہ بات اپنے دوست کو بھی۔’’

وہ بے حد غصے میں تھی۔ زارا کو رونا آگیا۔

‘‘صبی! میں نے تو تمہاری بہتری کے لئے یہ سب کیا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ……’’

اور کچھ بھی ہو، زارا کا رونا تو اس سے برداشت نہیں ہو سکتا تھا۔ گہری سانس لے کر اندر کی کثافت کو باہر دھکیلتے ہوئے اس نے بمشکل اپنا لہجہ نرم کیا تھا۔

‘‘شفق اور ثمین کہاں ہیں؟’’

‘‘آغا جان کے پاس۔’’

‘‘ان سے کیا کہا تھا تم نے؟’’

''میں نے کہا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لئے ڈرائیور کے ساتھ ڈاکٹر کے کلینک تک گئی ہو۔''
زارا نے ڈرتے ڈرتے بتایا تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر جھک کر جوتے کا اسٹریپ کھولنے لگی۔
''تم ناراض ہو مجھ سے؟''
صبیرہ نے ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔
''کیا مجھے نہیں ہونا چاہئے؟''
''آئی ایم سوری صبیرہ!'' وہ واقعی سخت پشیمان تھی۔
''اٹس اوکے ناؤ'' وہ عام سے انداز میں کہتی دوسرے جوتے کا اسٹریپ کھول کر تیتے پاؤں آزاد کرنے لگی۔ زارا بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

✡......✡

ویک اینڈ پر وقار علی آیا تو اس نے سب کے بیچ تابندہ کی خاموشی اور بجھے بجھے انداز کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا۔ اس کی وارفتہ نگاہوں سے بے نیاز وہ مون کو کھانا کھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کمرے میں آتے ہی وہ شکوہ کناں ہوا تھا۔
''میں تو سوچ رہا تھا کہ اس پہلی پہلی جدائی کے بعد ملن کا منظر ہی کچھ اور ہوگا۔ کچھ اچھوتا اور کچھ حسین سا''
اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس بٹھایا تو وہ جیسے اسی سہارے کی منتظر تھی۔ اس کے شانے میں منہ چھپائے رو دی۔ وقار علی کی حیرت پر پریشانی غالب آنے لگی۔ اسے شانوں سے تھام کر اپنے مقابل کیا تو اس کی آنکھوں میں اترتی سرخی دیکھ کر لب بھینچ گیا۔ وہ ہنوز آنسو بہا رہی تھی۔
''کیا ہوا تابی؟'' اس کی آواز میں بے حد خدشات سمٹے ہوئے تھے۔
''میں نے امی کو فون کیا تھا وقار! مگر انہوں نے مجھ سے بات تک نہیں کی۔'' اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ وہ بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گیا۔ واہموں کی دھند چھٹی تو وہ پھر سے فریش دکھائی دینے لگا۔
''کم آن تابی! اتنی سی بات کو ذہن پر سوار کر لیا اور میں سوچ رہا تھا کہ میرے لئے اتنی افسردہ ہو رہی ہو۔'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں بات بدلنی چاہی مگر اس کی آنکھوں سے تو جیسے گرم پانی کے چشمے پھوٹ پڑے تھے۔
''یہ ذرا سی بات نہیں ہے وقار! وہ میرے ساتھ کوئی بھی تعلق رکھنے کو تیار نہیں ہیں۔''
اور یہ سب وقار علی سے چھپا ہوا تو نہیں تھا۔ وہ تو اول روز سے یہ تلخ حقیقت جانتا تھا کہ تابندہ کے گھر والے اب اس سے کوئی بھی تعلق رکھنے کے روادار نہیں ہیں مگر تابندہ کو بتانے کا حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا۔
اس کا نرم و گداز ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں جکڑتے ہوئے وقار نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔
''ابھی سے گھبرا گئیں۔ یہ سب تو طے شدہ بات تھی۔ تمہارے گھر والوں نے روز اول سے ہی اس رشتے کو قبول نہیں کیا تھا۔ تمہیں تو ذہنی طور پر اس سب کے لئے تیار ہونا چاہئے تھا۔''
''میں یہاں بالکل اکیلی تھی وقار! اور ایسے میں امی کا رویہ، مجھے لگا جیسے میں بھری دنیا میں تنہا رہ گئی ہوں۔'' وہ آنکھوں میں آنسو لئے دل سوزی سے کہہ رہی تھی۔ اس کے الفاظ نے وقار علی کے چہرے پر سنجیدگی پھیلا دی۔
''تم اکیلی اس لئے تھیں کیونکہ تم نے مجھے ہر پل اپنے ساتھ محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں، میری محبت، کیا اس کے باوجود تم خود کو تنہا محسوس کرتی ہو؟''
''میرا یہ مطلب نہیں ہے وقار!'' تابندہ نے احتجاج کرتے ہوئے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا تھا۔ ''آپ کی خاطر تو اتنے محبت کرنے والوں کو چھوڑ کے آئی ہوں۔ پھر آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں۔ مگر ان آفاقی رشتوں کی اہمیت سے تو انکار ممکن نہیں ہے۔''
اس کی بے چارگی اور بے بسی وقار علی کو بہت محسوس ہوئی تھی، سو اس نے پل بھر بھی نہیں لگایا تھا اس کی دلداری میں۔
''آئی ایم سوری تابی! شاید یہ میری ہی غلطی ہے۔ مگر میں اپنے وعدے پر قائم ہوں تم جب کہو گی ہم دونوں تمہارے امی ابو سے ملنے جائیں گے۔''
''وہ مجھ سے ناراض ہیں وقار! بہت ناراض۔''
جانے دل کو کیسے خدشوں نے گھیر لیا تھا کہ وہ جو ایک ہی ٹھوکر میں محبتوں کی سلطنت ٹھکرا آئی تھی مسلسل بے چینی اور اضطراب میں گھری ہوئی تھی۔
''پاگل ہو تم تابی! بھلا کوئی اپنی اولاد سے ناراض کیسے رہ سکتا ہے؟ اور پھر تمہارے گھر والے تو تم سے بہت محبت بھی کرتے ہیں۔ میں بھی ان سے معافی مانگ لوں گا۔ تمہارا کیا قصور ہے۔ تمہیں اس راہ پر لایا تو میں ہی تھا نا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ تابندہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''میں نے آپ سے محبت کی ہے وقار! اس راہ پر میں اپنے دل کی مرضی سے آپ کی ہم سفر ہوئی ہوں۔ اور مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی تو وہ کھل اٹھا۔ ساری پژمردگی اور سنجیدگی اڑن چھو ہو گئی۔
''تھینک گاڈ، میں تو سوچ رہا تھا شاید دل ہی دل میں مجھے کوس رہی ہو۔''
''میں کیوں بھلا ایسا کرنے لگی؟'' تابندہ نے اسے خفگی سے دیکھا تھا۔
''بھئی بندہ ایسا سوچنے کا حق رکھتا ہے۔ جب سے آیا ہوں تم نے نظر بھر کے مجھے دیکھا بھی نہیں۔'' وہ شکوہ کر رہا تھا۔ تابندہ کو اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ واقعی وہ اپنے اندر کے احساسِ ندامت سے لڑنے میں اس قدر لگی ہوئی تھی کہ نہ تو وہ پچھلے دنوں فون پر وقار کے ساتھ ٹھیک سے بات کر پائی تھی اور نہ اب اس کی پہلی جدائی کے بعد ڈھنگ سے اس کا استقبال کر سکی تھی۔ اس نے فی الفور سرخ لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیلائی تھی۔
''جو دل میں رہتا ہے اسے ایسے شکوے زیب نہیں دیتے۔''
''شکوے نہیں بلکہ میں شکووں کا دفتر کھول دوں گا۔ پتہ ہے وہاں ایک رات بھی ڈھنگ سے سو نہیں پایا ہوں۔ اور آفس میں ہر دوسرے بندے بلکہ چپراسی تک میں تمہاری شکل دکھائی دینے لگی تھی۔'' وہ بڑی معصومیت سے کہہ رہا تھا۔ تابندہ احتجاجاً چلا اٹھی۔
''کیا میری شکل تمہارے چپراسی جیسی ہے؟''
''بالکل بھی نہیں۔'' اس کو بے حد سہولت سے اپنے نزدیک کرتے ہوئے وقار علی نے انداز دلربائی اپنایا تھا۔
''تمہارے ہونٹوں کا خم اس سے کہیں زیادہ خوب صورت ہے۔ اور اس کی ادائیں تمہاری طرح قاتلانہ نہیں ہیں۔''
اس کی شوخی پر قلقل کرتی ہنسی تابندہ کے لبوں سے آزاد ہو کر بند کمرے کی فضا میں پھیل گئی تھی۔

✡......✡

مہندی سے ایک روز پہلے وہ سب گاڑی بھر کر آخری شاپنگ کے لئے مارکیٹ کھنگال رہی تھیں۔ ایڈی کو ڈرائیونگ سیٹ پر پا کر صبیرہ نے اپنے اندر بے حد کڑواہٹ اترتی محسوس کی تھی مگر زارا کی کزنز کی موجودگی میں وہ ایک لفظ بھی نہیں کہہ پائی تھی۔
''اب میں کہیں نہیں جا رہی ہوں۔''
صبیرہ نے حقیقتاً اپنے پاؤں دکھتے محسوس کئے تھے۔ ان سب نے تو جیسے آج ہی کے دن اپنے پرس اور مارکیٹ دونوں ہی خالی کرنے کا ارادہ کر لیا تھا اور ایڈی غیر متوقع طور پر ماتھے پر ایک بھی بل ڈالے بغیر بہت خوش اسلوبی کے ساتھ ان کو ہر شاپ پر لے جا رہا تھا۔
''بھئی ان کی بیوی بہت خوش قسمت ہوگی۔'' زارا کی کزن نے بلا جھجک کہا تھا۔
''واقعی یار! جتنے شاندار خود ہیں، اتنے ہی با اخلاق بھی ہیں۔''
''ہنہ......'' صبیرہ سر جھٹک کر رہ گئی۔
وہ ان سب کو لئے سامنے مارکیٹ کی طرف چلا گیا تو صبیرہ نے اطمینان کی سانس لی تھی۔
'اس سے تو اچھا تھا کہ میں زارا ہی کے ساتھ رہ جاتی۔' اس نے بددلی سے سوچا۔ حقیقتاً وہ شدید بوریت محسوس کر رہی تھی۔ اسے تو شفق اور ثمین نے خوامخواہ ہی ساتھ گھسیٹ لیا تھا۔ یونہی جیولری، مہندی، چوڑیوں اور کچھ کے کپڑوں کی خریداری نے اتنا ٹائم ضائع کر دیا تھا۔
کھڑکی کا شیشہ کھٹکھٹائے جانے پر وہ بری طرح چونکی تھی۔ شہباز گردیزی کو موٹر بائیک پر موجود ایک پاؤں زمین پر ٹکائے کھڑا دیکھ کر وہ ٹھٹک سی گئی۔ پھر شیشہ نیچے کر کے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
''آپ کہاں ہیں مس صبیرہ! پچھلے تین روز سے یونیورسٹی بھی نہیں آ رہیں؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ صبیرہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔
''آپ کو مجھ سے کیا کام تھا؟''
''میں نے آپ سے بات کی تھی عورتوں کے حقوق کی ایک تنظیم میں شامل ہونے کی۔ میری آنٹی بہت شدت سے آپ کا ویٹ کر رہی ہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ صبیرہ نے گہری سانس اندر کھینچی تھی۔
''میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ میں ان دنوں فارغ نہیں ہوں۔ میری فرینڈ کی شادی ہے۔ بس اسی وجہ سے میں آپ کی آنٹی سے مل نہیں پائی۔ مگر جونہی میں اس طرف سے فارغ ہوں گی، ضرور ان سے ملوں گی۔ ورنہ فون پر بات کر لوں گی۔'' وہ مسکرا کر کہہ رہی تھی۔
اسی وقت ایڈی ان سب کو اندر شاپ پر چھوڑ کر آیا تو اسے شہباز گردیزی کے ساتھ محوِ گفتگو پا کر اس کا دماغ سلگ اٹھا۔ لب بھینچتے ہوئے وہ انہی قدموں پر واپس پلٹا۔ ثمین

اور شفق کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا اور انہیں سب کچھ سمجھا کر باہر آ گیا۔ تب وہاں شہباز گردیزی موجود نہیں تھا۔

وہ غیر متوقع طور پر ایڈی کی واپسی سے سنبھل کر بیٹھنے پر مجبور ہو گئی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے زور سے دروازہ بند کیا تو وہ ناگواری سے اسے دیکھنے لگی۔ اسی وقت وہ پلٹا تھا۔ چہرے پر غصے کی سرخی اور پتھریلے تاثرات اس کے اشتعال کے گواہ تھے۔

''میں نے تمہیں صاف لفظوں میں منع کیا تھا کہ تم شہباز گردیزی سے کسی بھی قسم کا کوئی رابطہ نہیں رکھو گی۔ پھر بھی تم پر اثر نہیں ہوا؟''

لحظہ بھر کو وہ گڑبڑا گئی مگر پھر اسے بھی غصے نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

''تمہیں ہر وقت میری جاسوسی کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے کیا؟'' وہ چیخ کر بولی تو اسے شعلہ بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ایڈی نے گاڑی اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی تھی۔

''گاڑی روکو ایڈی!'' وہ چلائی تھی مگر وہ جیسے کان بند کیے بیٹھا تھا۔ نہایت تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتا اگلے پانچ منٹ کی ڈرائیو میں اس کی تمام چیخ و پکار اور دھمکیوں کے جواب میں ایک لفظ بھی بولے بغیر ایک بلڈنگ کے پارکنگ لاٹ میں گاڑی پارک کرنے لگا۔

''اس سب کا کیا مطلب ہے ایڈی؟'' وہ اپنی طبیعت کے برخلاف بہت تحمل سے پوچھ رہی تھی۔

''میں نے یہی سوچا تھا کہ شاید تم میرے لفظوں کو قابل اعتبار جان کر شہباز گردیزی کے لفظی چنگل سے نکل آئی ہو گی۔ مگر تم اس قدر بے وقوف لڑکی ہو کہ جب تک کوئی نقصان نہ اٹھا لو تب تک کسی بات کو مانتی نہیں ہو۔'' وہ تلخی سے گویا ہوا تو اس کے تحمل کو بھی اُڑتے دیر نہیں لگی تھی۔

''تمہیں میرے فائدے یا نقصان سے کیا تکلیف ہے؟ تم اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ اور آئندہ اگر تم نے کبھی ایسی حرکت کی تو میں پولیس میں تمہارے خلاف رپورٹ کرا دوں گی۔''

''شٹ اپ۔'' وہ پہلی بار اس قدر شدید غصے میں لگ رہا تھا۔ ''میری نرمی کا تم ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔''

''تم..... تم کون ہوتے ہو مجھ پر یوں رعب جمانے والے؟'' وہ تلملا اٹھی تھی۔

''نیچے اترو۔'' وہ گاڑی بند کر کے سختی سے بولا مگر وہ ڈھیٹ بنی اندر بیٹھی رہی۔

''صبیرہ! جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ ورنہ میں دوسرا راستہ بھی اختیار کر سکتا ہوں۔''

وہ بے حد سرد لہجے میں بولا تو اس کی غراہٹ صبیرہ کو سنسنا گئی۔ آس پاس موجود لوگوں اور ورجنگ ایریے کے خیال نے اسے خاصی تقویت دی تو وہ خاموشی سے نیچے اتر آئی۔ اسے ساتھ لئے وہ بلڈنگ کی تیسری منزل پر بذریعہ لفٹ چلا آیا۔ جانے کیوں اسے لحظہ بھر کو بھی یہ خوف محسوس نہیں ہوا تھا کہ ایڈی اسے کوئی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ مگر اس وقت اس نے اس بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اسے لئے ایک بے حد مشہور اور کثیر الاشاعت اخبار کے دفتر میں پہنچا تو وہاں کا پُرشور ماحول اور بھانت بھانت کے لوگوں کو بھاگتے دوڑتے اپنے کام نمٹاتے دیکھ کر وہ گھبرا ہی گئی۔

ایڈی سب سے ہائے ہیلو کرتا آگے بڑھ رہا تھا اور وہ اپنی تلملاہٹ اور گھبراہٹ دباتی اس کے تیز قدموں کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ سب ایڈی کی جس طرح پذیرائی کر رہے تھے، اس سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ یہاں آتا جاتا رہتا ہو۔

ایک کمرے کے دروازے پر وہ رکا۔ چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ بھی رک گئی تھی۔ مارے غصے اور اہانت کے احساس کے اس کی رنگت تمتما رہی تھی۔

''اندر آ جاؤ۔'' وہ سنجیدگی سے کہتا ہوا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ مجبوراً صبیرہ کو بھی اس کی تقلید کرنا پڑی تھی۔

سامنے موجود ٹیبل پر ایک طرف کمپیوٹر دھرا تھا۔ باقی کی ٹیبل اخبارات، مختلف جرائد اور پیپرز سے بھری پڑی تھی۔ ٹیبل کے پار کرسی پر براجمان مانیٹر اسکرین پر نگاہیں جمائے نوجوان ان دونوں کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے اٹھا تھا۔ ایڈی سے مصافحے کے بعد وہ بے تکلفی سے اس کا حال احوال پوچھ رہا تھا۔

''اس قدر بے ہودہ شخص ہو تم کہ حد نہیں۔ پاپا سخت ناراض ہو رہے تھے۔ دو ہفتوں سے تم نے ایک بھی کالم نہیں لکھا ہے۔ اور گزشتہ ماہ والا فیچر بھی ابھی ان کمپلیٹ پڑا ہے۔''

''کبھی کبھی زبان کے ساتھ ساتھ دماغ کا استعمال بھی کر لینا چاہئے۔'' ایڈی نے گویا صبیرہ کی طرف اس کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ پھر وہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرانے لگا۔

''یہ میرا بہت اچھا دوست ہے بابر احمد قریشی۔ اور اس اخبار کی اشاعت بلکہ کامیاب اشاعت کا سہرا اس کے والد محترم محمود احمد قریشی صاحب کے سر ہے۔ اور بابر! یہ میری یونیورسٹی فیلو ہیں صبیرہ علی۔ میں نے تم سے جو کام کہا تھا یہ اسی سلسلے میں کچھ معلومات چاہتی ہیں۔''

''اوکے..... میں ابھی وہ فائل لے کر آتا ہوں۔ تم اتنی دیر میں کولڈ ڈرنکس آرڈر کرو۔''

وہ فوراً اندرونی کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ایڈی نے پلٹ کر صبیرہ کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر وہ یونہی تنے تنے تاثرات لئے کھڑی اسے کسی پرانے دشمن کی طرح گھورتی رہی۔

''اس سارے ڈرامے کا کیا مطلب ہے؟'' وہ دانتوں پر دانت جمائے بھنچے ہوئے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

وہ متاسفانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے تمسخرانہ لہجے میں بولا۔

''ابھی جب اس سارے ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گا تب تمہیں پتہ چلے گا کہ حقیقت کیا ہے۔''

''تم میرے ہی پیچھے کیوں پڑ گئے ہو ایڈی؟'' وہ بھڑک کر مدھم مگر شدت بھرے لہجے میں چلا اٹھی تھی کہ وہ انگشت شہادت اٹھا کر اسے روک گیا۔

''تم سراسر غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہو۔''

''میں تم جیسے لڑکوں کے ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ مگر میں ان لڑکیوں میں سے قطعی نہیں ہوں جن سے ابھی تک تمہارا واسطہ پڑتا رہا ہے۔ تمہاری نظر کے اشاروں پر چلنے والی، جو تمہاری ہر بات کو حرف آخر مان کر تمہارے قدموں پر قدم رکھتی رہیں۔''

اس کے تمتماتے چہرے کو ایڈی نے نظر بھر کر دیکھا اور متاسفانہ انداز میں بولا۔

''واقعی تم بالکل صحیح کہہ رہی ہو۔ میرا واسطہ اب تک جتنی بھی لڑکیوں سے پڑا ہے تم ان سب سے زیادہ بے وقوف اور احمق ہو۔''

اس قدر پُر اطمینان تجزیے نے صبیرہ کو سرتاپا جھلسا دیا۔ اہانت کے شدید احساس نے اس کی رگوں میں خون کی جگہ گویا لاوا دوڑا دیا تھا۔ مگر اس کے کچھ جواب دینے سے پہلے ہی بابر ہاتھ میں فائل لئے نمودار ہو گیا تھا۔

''ارے..... آپ لوگ ابھی تک یونہی کھڑے ہیں۔ مس صبیرہ! آپ تو بیٹھیں پلیز۔''

وہ کرسی پر ڈھے سی گئی۔ ایڈی کے الفاظ نے اس کے ذہن کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ کتنے آرام سے وہ اس کی انسلٹ کر گیا تھا۔

''یہ لیں مس صبیرہ!'' بابر نے فائل اس کے سامنے ٹیبل پر رکھی اور ایڈی کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے انٹر کام پر کولڈ ڈرنکس کا آرڈر دینے لگا۔ پھر معذرت خواہانہ انداز میں ان سے بولا۔

''میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں فائل کھول کر دیکھنے لگی۔ دو سال پرانی اس فائل میں اخبارات کی خبروں کے تراشے ترتیب کے ساتھ پن اپ کیے گئے تھے۔

پہلے ہی تراشے کی خبر نے اس کے ذہن میں کھلبلی سی مچا دی۔

''مظلوم خواتین کے حقوق کی آڑ میں فحاشی کا اڈہ چلانے والی مشہور وکیل سطوت رانا گرفتار۔''

تمام تفصیلات ایک نئی کہانی سنا رہی تھیں۔

سطوت رانا نامی خاتون وکیل نے بظاہر ظلم کی چکی میں پسی مظلوم خواتین کے لئے ''پناہ گاہ'' نامی ادارہ قائم کر کے ان کو وہاں پناہ دے کر ان کے حقوق دلانے کا تہیہ کیا تھا مگر کچھ عرصے کے بعد وہ جبراً ان عورتوں کو فحاشی کی راہ پر چلنے پر مجبور کر دیتی تھی اور اس طرح وہ شہر کے ایک پوش علاقے میں بڑی کامیابی سے اپنا کاروبار چلائے ہوئے تھی۔ مگر کسی بلند حوصلہ لڑکی نے اس کے چنگل میں قید ہو جانے کے باوجود اس کا راز فاش کر دیا تھا۔ وہ جانے کس طرح اخبار کے دفتر میں آ پہنچی اور سطوت رانا کا پردہ فاش کر دیا۔ معاملہ پہلے پولیس اور پھر عدالت میں جا پہنچا تو سطوت رانا کا نام خوب اچھالا گیا مگر اس کی پہنچ بہت اوپر تک تھی سو اسے سزا نہیں ہو پائی۔ دو ماہ میں ہی اس کا مقدمہ خارج کر دیا گیا۔ مگر یہ بات طے تھی کہ ''پناہ گاہ'' کی آڑ میں وہ غلط کاریوں میں ملوث تھی۔ سطوت رانا کے ساتھ اور بھی معتبر نام اس واقعے میں سامنے آئے تھے۔

صبیرہ کے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑ اٹھی۔ اس کی صبیح پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔

لرزتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے فائل پرے کھسکا دی اور بے ساختہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ وہ سامنے راکنگ چیئر پر جھولتا استہزائیہ نظروں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

وہ کچھ بھی نہیں بولا تھا۔ اس کے باوجود صبیرہ ندامت کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتی جا رہی تھی۔ سطوت رانا کا نام اس کے لئے اجنبی تو نہیں تھا۔ شہباز گردیزی کے دیے ہوئے وزیٹنگ کارڈ کی پیشانی پر اس کی ''آنٹی'' کے طور پر سطوت رانا ہی کا نام درج تھا۔

✿ ..... ✿

''وقار! امی ابو مجھے معاف تو کر دیں گے نا؟''

دورانِ سفر وہ جانے کتنی بار اس سے یہ سوال پوچھ چکی تھی اور ہر بار وقار علی کی تسلی اس کی آنکھوں کی چمک کوئی گنا بڑھا دیتی تھی۔

''پتہ ہے وقار! میرے ابو مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے آج تک میری چھوٹی سے چھوٹی خواہش کو بھی کبھی نہیں ٹالا تھا.....''

وہ اس کی بات کاٹ گیا۔

''تو پھر میرے معاملے میں کیوں ڈنڈی مار گئے؟''

''کیونکہ اس وجہ سے خالہ کے ساتھ تعلقات خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ اور پھر آپ سے کون سا ان کی پرانی واقفیت تھی جو اپنی اتنی لاڈلی بیٹی کو اتنی آسانی سے آپ کے حوالے کر دیتے۔''

''ان سے نہ سہی ان کی لاڈلی بیٹی سے تو واقفیت تھی۔ انہوں نے تو اس بات کا بھی لحاظ نہیں کیا تھا۔'' وہ چھیڑنے والے انداز میں بولا تو اس کی ساری توجہ ونڈ اسکرین کے پار تھی۔ اس کا مذاق سمجھ کر تابندہ مسکرا دی، پھر بولی۔

''فکر مت کریں۔ آج آپ سے بھی اچھی طرح واقفیت ہو جائے گی ان کی۔''

وقار علی نے گاڑی کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا جو بہت خوش بلکہ خوش فہم دکھائی دے رہی تھی۔

''اس قدر خوش فہمیاں مت پالو تابی! کبھی کبھار تصویر کے دونوں رخ مدنظر رکھنا پڑتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ اس گھر میں کھلی آنکھوں اور کھلے دل کے ساتھ ہی تمہارا استقبال کیا جائے۔ اگر فون پر وہ لوگ اتنی ناراضگی دکھا سکتے ہیں تو شاید سامنے پا کر زیادہ خفا ہوں۔''

وقار علی کے ذہن میں اس کے ابو کے کہے الفاظ گونج اٹھے تھے۔ مگر اس کی سنجیدگی کے برعکس تابندہ بہت کھنک دار لہجے میں بولی۔

''جی نہیں۔ میں جانتی ہوں ان لوگوں کی یہ سب ناراضگی مصنوعی ہے۔ مجھے سامنے پاتے ہی وہ لوگ اپنی تمام خفگی پل بھر میں ہی بھول جائیں گے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہتے ہوئے گیئر بدلا تھا۔

''میرے ابو مجھ سے زیادہ دیر تک ناراض نہیں رہ سکتے۔ پتہ ہے وقار! جب کبھی اپنی کوئی فضول سی کوشش پوری نہ ہونے پر میں ان سے خفا ہو جاتی تو جب تک وہ مجھے منا نہیں لیتے تھے، رات کو سو نہیں پاتے تھے۔ اور رخشی، میری پیاری بہن، میں نے ہمیشہ اس کے حصے کی محبت بھی سمیٹی ہے۔ مگر وہ کبھی بھی مجھ سے جیلس نہیں ہوئی۔''

وہ تفاخرانہ انداز میں بتا رہی تھی اور وہ مسکراتے ہوئے اس کے لب و لہجے کے جوش اور خوشی کو محسوس کر رہا تھا۔

وہ لوگ لاہور کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ وقار علی نے ایک اچھے سے ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی روکی تو وہ متذبذب ہوئی۔

''اب تو گھر پہنچنے والے ہیں وقار! وہیں چل کر کھانا کھائیں گے۔''

''تمہارا کیا بھروسہ مسز! تم تو وہاں جاتے ہی جذباتی سین پارٹ میں مصروف ہو جاؤ گی اور میں بے چارہ بھوکا دعوت کی تیاری کے انتظار میں بیٹھا رہوں گا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ یہیں سے پیٹ پوجا کا سامان کر لیا جائے تاکہ سسرال والوں سے مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا ہو جائے۔'' اس کے انداز و الفاظ پر تابندہ کو ہنسی آ گئی تھی۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ جاتے ہی آپ کی دعوت کا بندوبست ہو جائے گا۔ آخر کو اس گھر کے اکلوتے داماد ہیں۔''

''اکلوتا ہوں مگر لاڈلا نہیں۔'' وقار علی نے لقمہ دیا تھا، پھر بولا۔ ''نازنخرے تو لاڈلوں ہی کے اٹھائے جاتے ہیں۔''

''اچھا اب تنگ مت کریں وقار! میں راستے میں کہیں نہیں رکوں گی۔ اس شہر میں آئے ہیں تو سب سے پہلے میں اپنے گھر میں پاؤں رکھوں گی۔'' وہ مضطرب ہونے لگی تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔

''خدا کا خوف کرو یار! پچھلے تین گھنٹوں کی ڈرائیو نے خوار کر دیا ہے مجھے۔ ذرا ٹانگیں تو سیدھی کرنے دو باہر نکل کر۔''

''صرف دس منٹ کی ڈرائیو باقی ہے وقار! پلیز۔'' اس نے ملتجیانہ انداز میں کہا تو لحظہ بھر اسے دیکھنے کے بعد گہری سانس کھینچتے ہوئے وہ گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

''ایک تو یہ دل کے معاملات بھی نا انسان کو بڑا ذلیل کراتے ہیں۔'' اس کی بڑبڑاہٹ تابندہ کی سماعت سے محفوظ نہیں رہ سکی تھی۔

''کیا مطلب ہے آپ کا.....؟'' اس کی طرف گھوم کر اسے گھورا تو وہ جیسے بے چارگی سے بولا۔

''صبح کا ناشتہ کر کے چلے ہیں اور اب دوپہر سر پر کھڑی ہے مگر بیگم صاحب کے آرڈر کے بغیر ایک نوالہ بھی منہ تک جانا حرام ہے۔''

تابندہ نے بے ساختہ امڈتی مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

''فکر مت کریں۔ گھر پہنچتے ہی اپنے ہاتھوں سے نوالے آپ کے منہ میں ڈالوں گی۔''

''اُف..... کیا رومینٹک سوچ ہے۔'' اس نے سر دھنا۔ پھر گویا مذاق اُڑانے والے انداز میں بولا۔ ''اور وہ میرے رقیب روسیاہ..... ان کا کیا؟''

''کون؟'' وہ استعجاب بھرے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

''بھئی تمہارے والد صاحب اور کون۔'' وہ لب دبا کر بولا تو تابندہ نے بے ساختہ ہنسی کے ساتھ اس کے شانے پر ہاتھ مارا تھا۔

''بہت فضول بات ہے وقار!''

''بھئی اتنا تم میرے لئے نہیں روئی ہو گی جتنا ان کی یاد میں روئی ہو۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''دکھ اسی محبت کے لئے لگتا ہے جو بچھڑ رہی ہو وقار! اور محبت کی قدر بھی انہی لمحات میں ہوتی ہے۔ کبھی آپ سے جدائی موت لگتی تھی مگر اب جب کہ آپ پاس ہیں تو دل کے اس حصے کو بہت سکون ہے۔ ابو سے تو محبت کے معنی ہی اور ہیں۔ ان کی ناراضگی تو دل کو مسلسل اضطراب و بے چینی کے شکنجے میں کستی جا رہی ہے۔ پتہ نہیں اتنے مہینے کیسے گزر گئے ان کے محبت بھرے لہجے کے بغیر۔''

''خیر، اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ میری محبت میں کسی کو دنیا بھلا دینے والا اثر تو موجود ہی ہے۔'' وہ دفعتاً بولا تھا۔ تابندہ اس کی طرف دیکھ کر بے ساختہ ہنس دی۔ اور پھر اس کے میکے کا راستہ آ گیا۔

وہی سڑکیں، وہی گلیاں، وہی ہریالی آج بھی تھی۔ مگر یہ سب تابندہ کو آج سے پہلے کبھی اتنا خوب صورت نہیں لگا تھا۔ ہر شے جیسے نئے سرے سے اسے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

اس کا دل گھبراہٹ اور خوشی کے امتزاج میں دھڑکا تو آنکھوں میں خفیف سی نمی اتر آئی۔

''میں ابو کو ضرور بتاؤں گی کہ امی نے فون پر کس قدر ناراضگی سے بات کی تھی۔'' وہ چشم تصور میں خود کو ابو کی پُرشفقت بانہوں کے گھیرے میں دیکھ رہی تھی۔ ایک دم گاڑی رکنے پر وہ بری طرح چونکی تھی۔

''پہنچ گئے؟'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ الفاظ نکلے تھے۔

''جی جناب!'' وہ گاڑی کا انجن آف کرتے ہوئے بولا۔ پھر اسے نیچے اترنے کا اشارہ کیا تو وہ بے ترتیب دھڑکنوں کے ساتھ گاڑی سے اتر گئی۔ پہلی نظر میں اسے اپنے ہی گھر کا گیٹ اجنبی سا لگا تھا۔ پہلے اس پر سفید اور سیاہ پینٹ تھا لیکن اب چاکلیٹ براؤن کلر ہو چکا تھا۔

دیواروں سے باہر جھانکتی سفید اور جامنی پھولوں سے لدی بوگن ویلیا بھی غائب تھی۔ مجموعی طور پر بہت ویران سا تاثر بندھا ہوا تھا۔ اس کے دل کو عجیب سی اضطرابی کیفیت نے گھیر لیا۔ اب وہ صرف جلد سے جلد اندر جا کر گھر والوں سے ملنا چاہتی تھی۔

وقار علی ڈور بیل بجانے لگا تھا مگر پھر وہ اس کی طرف پلٹ آیا۔

''کیا ہوا؟'' اس کی گھبراہٹ مزید بڑھی تھی۔

''پتہ نہیں یار، نیم پلیٹ پر کسی ریٹائرڈ آرمی آفیسر کا نام لکھا ہے۔'' وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا۔ تابندہ کی آنکھوں میں بے یقینی کا تاثر سمٹ آیا۔ وہ خود تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھی۔ نیم پلیٹ پر اُبھرے انگریزی کے حروف نے اس کے قدموں کو جیسے زمین میں گاڑ دیا تھا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' کانسی کی نیم پلیٹ میں نمایاں حروف پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بے یقینی سے بولی تو وقار علی نے اس کے شانے پر تسلی آمیز ہاتھ رکھا۔

''ہو سکتا ہے انہوں نے کہیں اور گھر لے لیا ہو۔''

''نہیں وقار! ابو کبھی اس گھر کو نہیں بیچ سکتے۔'' وہ ایک دم سے رو دی تھی۔ دل کس کس خدشے اور وہم کو نہیں چھو آیا تھا۔

''یہ گھر تو ان کا خواب تھا جو انہوں نے ہماری خاطر دیکھا تھا۔ وہ اسے کبھی نہیں بیچ سکتے۔'' وہ اس کی بات رد کر گئی۔ ''بھلا خواب بھی کبھی بیچے جاتے ہیں؟''

''اچھا اب یوں رو تو مت۔ کہیں سے پتہ کر لیتے ہیں۔ بلکہ اندر ہی سے۔'' وہ اسے سرزنش کرتے ہوئے ڈور بیل بجانے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک ملازم نے آ کر چھوٹا گیٹ کھول کر باہر جھانکا۔

''ضیاء احمد صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے کیا؟'' وقار علی نے سنجیدگی سے استفسار کیا تو وہ شخص اُلجھن آمیز لہجے میں بولا۔

''یہاں تو کرنل گل زمان صاحب رہتے ہیں۔''

تابندہ کے سر پر جیسے کسی نے پہاڑ توڑ دیا ہو۔ اس نے لڑکھڑا کر گاڑی کے بونٹ کا سہارا لیا تھا۔ خود وقار علی بھی چند لمحوں کے لئے بات کرنا بھول گیا تھا۔

''آپ شاید اس گھر کے پہلے مالک کا پوچھ رہے ہیں۔'' ملازم نے ان کا مسئلہ سمجھ لیا تھا۔

''آپ نے..... میرا مطلب ہے کہ کرنل صاحب نے یہ گھر کب خریدا؟'' وقار علی نے پوچھا تو وہ فی الفور بولا۔

''دو ہفتے پہلے۔ میں صاحب کے ساتھ ہی ادھر آیا ہوں۔''

''اور اس گھر کے پہلے مالک، ان کا کوئی اتہ پتہ؟''

تابندہ کی رنگت سرخی کھو چکی تھی۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔

''جی نہیں ..... کرنل صاحب تو ان سے ایک مرتبہ بھی نہیں ملے۔ پراپرٹی ڈیلر کے توسط سے انہوں نے سارا سودا طے کیا تھا۔''

وہ تابندہ کی طرف پلٹا جو بے آواز آنسو بہانے میں مصروف تھی۔

''اور کہاں سے ان کا پتہ معلوم ہو سکتا ہے؟''

اسے ایک دم سے خیال گزرا تو آنسو تھم سے گئے۔

''احسن۔''

''ویری رائٹ، تم احسن سے پوچھ سکتی ہو۔''

وہ ملازم کا شکریہ ادا کرتا تابندہ کو ساتھ لئے گاڑی میں آبیٹھا۔ موبائل اس کی طرف بڑھایا تو وہ اسے دیکھنے لگی۔

''ہم خالہ کے گھر جائیں گے۔''

''اوکے۔'' وہ بنا ہچکچاہٹ کے گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ ہلکا سا تفکر اسے بھی اپنے حصار میں لے رہا تھا۔ ضیاء احمد کا اس قدر اچانک گھر بیچ جانا، دل کو نہیں لگ رہا تھا۔ اس قدر غیر متوقع طور پر اسے سامنے دیکھ کر خالہ سکتے میں آگئیں۔ پھر اسے بانہوں میں بھینچ کر اتنی شدت سے روئیں کہ تابندہ کا دل پگھل کر پانی ہونے لگا۔

''آپ آئیں، اندر بیٹھتے ہیں۔'' چہرے پر ضبط کی سرخی لئے احسن نے وقار علی کو ہمراہ لیا اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

''یہ سب مجھ کرموں جلی کا کیا دھرا ہے۔ میری ہی خواہش پر بھائی صاحب تمہارے اور احسن کے رشتے پر راضی ہوئے تھے۔ ارے مجھے کیا خبر تھی کہ یہ یوں انکار کر کے ان کا دل دکھائے گا۔ انہیں اتنا بڑا صدمہ دے گا۔''

وہ دوپٹہ آنکھوں پر رکھے روئے چلی جا رہی تھیں۔ تابندہ اپنی جگہ چور سی بن گئی۔

تو ابھی تک احسن اس الزام سے بری نہیں ہوا تھا۔

''کچھ تو بتائیں خالہ! ابو نے وہ مکان کیوں بیچ دیا؟ اور اب وہ لوگ کہاں ہیں؟'' وہ بے تابی سے بولی تو وہ کرنٹ کھا کر اسے دیکھنے لگیں۔

''میں گھر گئی تھی۔ وہاں سے پتہ چلا کہ ابو نے وہ گھر بیچ دیا ہے اور کہیں اور شفٹ ہو گئے ہیں۔''

''ہائے تجھے اب بھی کسی نے نہیں بتایا میری بچی! میں تو سمجھی کہ تو سات سمندر پار سے اپنے باپ کے مرنے کی خبر سن کر یہاں پہنچی ہے۔''

''خالہ ......'' وہ زور سے چیخ اٹھی تھی۔ ''کیا کہہ رہی ہیں آپ؟''

''ہاں میری بچی! تمہاری شادی کے ڈیڑھ ہفتے بعد ہی بھائی صاحب، پتہ نہیں دل کو کون سا روگ لگا لیا تھا انہوں نے۔ کسی سے کچھ بھی نہیں کہا اور چپکے سے رخصت ہو گئے۔ نسرین بتا رہی تھی کہ تم اپنے شوہر کے ساتھ کینیڈا گئی ہو۔ واپسی ابھی مشکل ہے، میں نے تو بڑا زور لگایا کہ رخشی اور تمہاری ماں کو یہاں لے آؤں مگر وہ نہیں مانی۔ گھر بیچ کر گرین ٹاؤن والے فلیٹ میں شفٹ ہو گئی ہیں۔ میں نے سوچا تھوڑا بہت کفارہ تو ادا کر دوں۔ احسن سے رخشی کے لئے بات کی تو فوراً مان گیا۔ دو ماہ کے بعد رخصتی کرا لوں گی۔ پھر نسرین کو بھی یہیں لے آؤں گی۔'' خالہ اس کی بگڑتی حالت سے بے نیاز آنسو بہاتی اسے سارے حالات بتا رہی تھیں۔

'یا خدا! یہ زمین پھٹ کیوں نہیں رہی، آسمان گر کیوں نہیں رہا۔ یہ میری سانس، یہ کم بخت سانس رک کیوں نہیں جاتی؟'

اس قدر شدید صدمہ کہ ہفت آسمان بھی سر پر آ گرتے تو اس کی شدت کم نہ ہوتی۔ اس کے آنسو کہیں اندر ہی جم گئے تھے۔ اس کی خاموشی سے گھبرا کر خالہ نے اس کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا تو وہ بت کی مانند ایک طرف کو لڑھک گئی۔

ان کے واویلے پر احسن اور وقار علی دوڑے چلے آئے تھے۔ انہوں نے اس کی بے ہوشی کا سبب نہیں پوچھا تھا، وقار علی کو بھی احسن کی زبانی اس پر ٹوٹنے والی قیامت کا علم ہو چکا تھا۔

''اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالو، ہاسپٹل لے چلیں۔ اس قدر شدید صدمے سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' احسن نے کہا تو وقار علی نے فی الفور اس کے کہنے پر عمل کیا۔

''آپ گھر پر ہی رکیں، خالی گھر ہے۔ میں آپ کو فون کر دوں گا۔'' خالہ کو ساتھ چلنے پر آمادہ دیکھ کر احسن نے انہیں روک دیا تھا۔ وہ بے بسی سے روتے ہوئے گاڑی کو باہر جاتا دیکھتی رہ گئیں۔ پھر کوئی خیال گزرا تو تیزی سے فون اسٹینڈ کی جانب بڑھیں اور گرین ٹاؤن کے فلیٹ کا نمبر پش کرنے لگیں۔

......

وہ ایڈی کے ساتھ واپس لوٹی تو اس کی خاموشی اور پژمردگی سبھی نے محسوس کی تھی۔

''ثمین! مجھے تم سے کوئی بات کرنی ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا تو صبیرہ کے تاثرات نوٹ کرتی ثمین گڑبڑا کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''مجھ سے کیا؟''

''تم باہر آؤ ذرا۔'' وہ کہتا ہوا چلا گیا تو مجبوراً ثمین کو اس کی تقلید میں جانا پڑا۔

صبیرہ کچھ بولے بغیر منہ سر لپیٹ کر پڑ رہی تھی۔ شفق نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر زارا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور وہ دونوں باہر نکل آئیں۔

''ابھی وہ غصے میں ہوگی، کچھ نہ پوچھنا ہی بہتر ہے۔'' شفق نے کہا۔

''میری تو سمجھ نہیں آ رہا، یہ ایڈی کا بچہ کیا کرتا پھر رہا ہے۔'' زارا ناگواری سے بولی۔ اتنے خوشی کے موقع پر ایسی بدمزگی اسے سخت بری لگ رہی تھی۔ کوئی بھی صحیح طرح سے انجوائے نہیں کر پا رہا تھا۔

''ویسے تو میں اسے صبیرہ کو نہ لے جانے دیتی مگر وہ کہہ رہا تھا کہ شہباز گردیزی غلط پلاننگ کے ذریعے صبیرہ کو ٹریپ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ اسی کا پول کھولنے والا تھا۔ اور یہ تو ہم بھی جانتی ہیں کہ واقعی شہباز گردیزی کچھ عرصے سے صبیرہ کی راہ میں آنے لگا ہے۔ بڑے باپ کا بیٹا ہے، اس لئے اس کی ہر بات دبی رہتی ہے۔ مگر اس کی ریپوٹیشن واقعی اچھی نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ ہماری بات تو وہ سنتی نہیں، ایڈی ثبوت کے ساتھ بات کرے گا تو شاید مان جائے۔''

شفق نے اپنا مطمع نظر بتایا تو وہ غائب دماغی سے سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ اسے لئے گیسٹ روم میں چلا آیا تھا۔

''بات کیا ہے ایڈی؟ کیوں اتنے پراسرار ہو رہے ہو؟'' ثمین جھنجلا اٹھی تھی۔

وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تو بے حد سنجیدہ تھا۔

''تمہیں شہباز گردیزی کے متعلق ہر بات کا علم تھا اس کے باوجود تم نے صبیرہ کو اس سے ملنے سے نہیں روکا، کیوں؟''

''کک ..... کیا مطلب؟'' اس کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی۔

''مطلب بالکل واضح ہے ثمین! میں نے تم سے صبیرہ کو شہباز گردیزی سے محتاط رہنے کو کہا تھا مگر وہ اس ساری انفارمیشن سے لاتعلقی ظاہر کر رہی ہے۔ تم نے اسے یہ سب کیوں نہیں بتایا؟'' وہ بے حد سرد دکھائی دے رہا تھا۔

''مم ..... میں نے اسے سب کچھ بتایا تھا۔ وہ جانتی ہے کہ شہباز گردیزی کے گروپ کی ریپوٹیشن کیسی ہے۔'' وہ مکر گئی تھی۔

چند لمحوں تک وہ تو لنے والی نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''وہ تو جانتی ہی تھی۔ مگر میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے بھی دوستی کا حق نبھایا یا نہیں؟''

''ایڈی! تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' ثمین نے جلدی سے خود کو سنبھالا تھا۔ ناگواری سے بولی۔

''وہ اپنی مرضی کی مالک ہے۔ ہر فیصلہ اپنے دماغ سے کرتی ہے، مجھے اس کو ڈکٹیشن دینے کی کیا ضرورت تھی۔''

''اگر تم صحیح معنوں میں اس کی دوست ہوتیں تو اسے ڈکٹیٹ ضرور کرتیں۔''

''تم ..... تم اچھی طرح جانتے ہو ایڈی! کہ وہ کسی کی بات نہیں سنتی، میں نے اسے کئی بار ....'' اس کے تیز لہجے کے جواب میں وہ مدھم پڑ گئی تھی مگر اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ اسی تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ گیا۔

''جھوٹ مت بولو ثمین! تم نے کبھی بھی اسے کچھ نہیں کہا۔ میں نے اس سے پوچھا ہے۔''

''بہت خوب۔'' وہ اسے چبھتی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی طنزیہ انداز میں بولی۔ ''تو آج تمہیں مجھ سے زیادہ اس کی باتوں پر اعتبار آنے لگا ہے۔''

''جو اعتبار میں نے تم پر کیا تھا، افسوس اس کا رزلٹ بھی اچھا نہیں نکلا۔'' وہ متاسفانہ انداز میں کہتا اسے تلملانے پر مجبور کر گیا۔

''تم حد سے بڑھ رہے ہو ایڈی! اور وہ بھی ایک ایسی لڑکی کی حمایت میں جو تمہیں جوتے کی نوک پر رکھتی ہے۔''

''شٹ اپ ثمین، جسٹ شٹ اپ۔'' وہ تنبیہی انداز میں انگشت شہادت اٹھا کر غصے سے اسے روک گیا تھا۔ ''میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم صبیرہ کو مس گائیڈ کیوں کرتی رہی ہو، خاص طور پر میرے متعلق؟'' وہ اپنے لفظوں پر زور دے کر بولا۔ اس کے چہرے پر چھائی سرخی اس کے غصے کی شدت کی گواہ تھی۔ مگر وہ ڈرے بغیر یونہی ڈھٹائی سے بولی۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ وہ تم سے نفرت کرتی ہے۔ کیوں کرتی ہے اس کا جواب تم اس سے خود لے سکتے ہو۔ اور تمہارے متعلق اس کے تمام خیالات اس کے اپنے پیدا کردہ ہیں نہ کہ میں نے اس کے بھیجے میں بھرے ہیں۔ ہم دونوں تو دوست تھے ایڈی! پھر آج یہ ناروا سلوک کیوں اس خوب صورت رشتے کے ساتھ؟'' وہ آخر میں بہت جذباتی انداز میں بولی مگر وہ قطعی متاثر نہیں ہوا تھا۔ سرد لہجے میں بولا۔

''ہم کبھی دوست تھے ثمین! مگر اب نہیں رہے۔ اگر تم نے صبیرہ کو شہباز گردیزی کے متعلق کلیئر انفارمیشن دی ہوتی تو وہ کبھی بھی اس کی چال سے ٹریپ نہیں ہوتی۔ میں

اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے کہ جانتے بوجھتے بدنامی کے گڑھے میں جا گرے۔ گزرے دو سالوں میں اس کی کسی بھی لڑکے سے علیک سلیک نہیں رہی۔ اب اگر وہ شہباز گردیزی سے نرمی برت رہی تھی تو اس کی وجہ اسے میرے خلاف بھڑکا کر اس میں پیدا کی جانے والی ضد تھی اور کچھ نہیں۔ اور یہ سب کس نے کیا ہے، یہ تم بھی بہت اچھی طرح سے جانتی ہو۔‘‘

‘‘اوکے، تو آج یہ بات بھی کلیئر ہو گئی کہ ہم دونوں اب دوست نہیں رہے۔ وہ بھی اس لڑکی کی وجہ سے جسے تم تو اپنے دل میں بسائے بیٹھے ہو مگر وہ تمہیں منہ لگانے کی روادار نہیں اور ہر وقت......‘‘

‘‘شٹ اپ ثمین! اب جب کہ ہم دونوں میں دوستی کا رشتہ بھی نہیں رہا تو پھر تمہیں میرے معاملات میں دخل اندازی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ وہ اونچی آواز میں اسے ٹوک گیا تھا تبھی دروازہ ناک کر کے زارا پریشان سی اندر چلی آئی۔

‘‘کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو؟ ساری آواز باہر جا رہی ہے، لڑ رہے ہو تم دونوں؟‘‘ وہ حیرت کے ساتھ ساتھ بے یقینی کا بھی شکار تھی۔ مگر ایڈی کچھ کہے بنا سر جھٹکتا تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

‘‘یہ سب کیا ہے ثمین؟ ابھی جو کچھ ایڈی کہہ رہا تھا وہ......‘‘ زارا کے انداز سے لگ رہا تھا وہ اندر آنے سے پہلے کافی کچھ سن چکی تھی۔ ثمین نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

‘‘بکواس کر رہا تھا وہ۔ شروع ہی سے وہ صبیرہ کو اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش میں تھا مگر میں نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا اور اب جبکہ وہ ناکام ہو گیا ہے تو گھٹیا الزامات پر اتر آیا ہے۔‘‘

‘‘مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔‘‘ زارا گومگو کی سی کیفیت میں کھڑی تھی۔

‘‘مگر مجھے سارا گیم سمجھ میں آچکا ہے۔‘‘ شفق نے اندر داخل ہوتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا تو ثمین نے بری طرح گڑبڑا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

‘‘کون سا گیم؟‘‘ زارا نے حیرانی سے پوچھا تو وہ اپنی عادت کے برعکس تلخی سے بولی۔

‘‘وہ جو ایک دوست اپنی دوسری دوست کے خلاف کھیلتی رہی ہے۔‘‘

‘‘میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے شفق!‘‘ ثمین نے اپنی صفائی پیش کرنے کی ناکام سی کوشش کی تھی۔

‘‘جھوٹ مت بولو ثمین! تم نے ایسا ہی کیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کیا ہے۔ صبیرہ کو ایڈی کے خلاف بھڑکانے والی بھی تم ہی ہو۔‘‘

‘‘صبیرہ تب سے اس کے خلاف ہے جب سے وہ تقریری مقابلے جیتتا چلا آرہا ہے۔‘‘ ثمین نے تیز لہجے میں کہا تھا۔

‘‘وہ صرف اس کے خیالات کے خلاف تھی ثمین! اسے ایڈی کے خلاف کرنے والی تم ہو۔ اب سے نہیں شروع سے ہی تم اس کوشش میں مصروف ہو۔ ایڈی کے متعلق غلط انفارمیشنز صبیرہ تک پہنچانا تمہارا مشغلہ رہا ہے۔ اس روز جب ہم چاروں کو ایڈی کے ساتھ آنا جان کو دیکھنے ہاسپٹل جانا تھا، تب بھی تم نے صبیرہ کو بطور خاص ایڈی کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ ایڈی نے اپنا ارادہ صبیرہ کو دیکھ کر نہیں بلکہ شہباز گردیزی اور اس کے گروپ کی وجہ سے بدلا تھا۔ اور تم یہ بات اچھی طرح جانتی تھیں مگر تم نے صبیرہ کو مس گائیڈ کرنے کی کوشش کی۔ اور اس سے پہلے جب ان دو لڑکوں نے صبیرہ کو تنگ کیا تھا اور ایڈی نے اس کی مدد کی تو ایڈی نے یہ بات صرف تمہیں بتائی تھی۔ ایڈی اور صبیرہ کے بعد صرف تم ہی ہو جو پورے ڈیپارٹمنٹ میں یہ بات پھیلا سکتی تھیں اور تم نے ایسا ہی کیا اور الزام آیا ایڈی پر تا کہ صبیرہ اس سے متنفر ہو جائے۔ ہر پل، ہر جگہ تم نے صبیرہ کی جذباتی طبیعت کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ کیوں ثمین؟‘‘ شفق نے بے حد تلخی سے اس کا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا۔ زارا دم بخود تھی۔ اور ثمین سپید پڑتی رنگت لئے کھڑی تھی۔

‘‘اور اس سوال کا جواب تم مجھے نہ بھی دو تو اب میں اچھی طرح جان گئی ہوں ثمین! ایڈی کی خاطر۔ تم یہ سب صرف اور صرف ایڈی کو پانے کے لئے کر رہی تھیں۔ اور صبیرہ کو شہباز گردیزی کے متعلق بھی تمہی نے لاپرواہ کیا تھا۔ تم صبیرہ سے نفرت کرتی ہو کیونکہ ایڈی اس سے محبت کرتا ہے۔‘‘ وہ اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے بولی تو ثمین جیسے پھٹ پڑی۔

‘‘ہاں، یہ سب کچھ میں نے کیا ہے۔ اور ایڈی کے لئے کیا ہے۔‘‘

‘‘شہباز گردیزی کی شہرت کا پتہ ہوتے ہوئے بھی تم نے صبیرہ کو اس سے ملنے سے نہیں روکا۔‘‘ زارا صدمے کی گرفت میں تھی۔

‘‘اس دنیا میں ہر شخص کو سب سے پہلے اپنے مفادات عزیز ہوتے ہیں۔ دوستوں، رشتے داروں کے حقوق کی باری تو بہت بعد میں آتی ہے۔ میرے دل کی دنیا ویران رہے، میرے ارمان سلگتے رہیں، ایسے میں دوستی کو میں کیا چولہے میں جھونکوں؟‘‘ وہ مکمل طور پر خود غرضی کے چولہے میں لپٹی دکھائی دے رہی تھی۔ خوش دلی اور خوش مزاجی سے کوسوں دور تھی، جیسے یہ کوئی اور ہی ثمین ہو۔

‘‘شرم آنی چاہئے تمہیں ثمین! ایسے خیالات رکھتی ہو تم ہم سب کے متعلق؟‘‘ زارا سے دکھ کے مارے بولنا محال ہو رہا تھا۔

‘‘تم بھی میرے متعلق اچھے خیالات نہیں رکھو گی اگر آج سے میں ثوبان کے متعلق سوچنا شروع کر دوں۔‘‘ وہ بہت ڈھٹائی سے کہہ رہی تھی۔ شفق تاسف سے اسے دیکھنے لگی۔

‘‘زندگی میں رشتوں کی بہت بڑی اور خاص اہمیت ہوتی ہے ثمین! اگر ثوبان بھی تمہارے متعلق تمہاری طرح سوچنا شروع کر دے تو میں اس کی زندگی سے نکلنے میں ذرا بھی دیر نہ کرتی۔ مگر تم تو ون وے ٹریک پر تھیں۔ پھر بھی اتنی سنگ دلی سے رانگ سائیڈ پر سفر کرتی رہیں۔‘‘ زارا کے چہرے پر سرخی چھلک آئی تھی۔

‘‘میں نے جو کچھ کیا نہ تو مجھے اس پر کوئی شرمندگی ہے اور نہ ہی پچھتاوا اور نہ ہی میں تم لوگوں کے سامنے اپنے کسی عمل کی جواب دہ ہوں۔‘‘ وہ تنفر سے پُر لہجے میں کہتی چلی گئی تو زارا نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے شفق کی طرف دیکھا۔

‘‘مجھے کافی دنوں سے اس پر شک ہو رہا تھا مگر صبیرہ کا دوستی پر کچھ اس قدر مان ہے کہ اس نے مجھے بھی کبھی غلط نہیں سوچنے دیا۔‘‘ شفق تاسف بھرے لہجے میں بولی تو زارا نے بھی رنجیدگی سے کہا۔

‘‘مگر جو کچھ صبیرہ کے ساتھ آج بیتا ہے اس کے بعد تو اس کا شاید ہر رشتے پر سے اعتبار اٹھ جائے۔‘‘

ابھی شفق کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ صبیرہ سے تمام روداد سن کر آئی تھی اور یہاں آکر ایڈی اور ثمین کی تلخ کلامی کے سارے لفظوں کو جوڑ کر بالکل کلیئر تصویر ان کے سامنے لا رکھی تھی۔

صبیرہ کو بدنامی کے گڑھے کے بالکل کنارے پر لا کھڑا کرنے والا اور کوئی نہیں بلکہ خود ثمین تھی جس نے آج دوستی جیسے شفاف رشتے کو داغ دار کر دیا تھا جو صبیرہ کا کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے بھی فقط ایڈی کی خاطر اس کی دشمن ہو رہی تھی۔ یہ سمجھے بغیر کہ محبت زور زبردستی سے حاصل ہونے والا رشتہ نہیں ہے۔ یہ تو دلوں میں یوں پنپتا ہے کہ کبھی کبھار تو اسے موافق حالات کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ جیسے خود ثمین کے لئے ایڈی کی محبت اور ایڈی کے لئے صبیرہ کی۔

‘‘اور ایڈی کا کیا......؟‘‘ زارا نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا تو شفق نے اسے فوراً ٹوک دیا۔

‘‘اس کے متعلق صبیرہ کو کچھ مت کہنا۔ بلکہ اب صرف یہ دیکھو کہ اونٹ بیٹھتا کس کروٹ ہے۔ اگر ایڈی نے صبیرہ کی اتنی ہیلپ کی ہے تو ظاہری بات ہے کہ صبیرہ کے دل و دماغ پر نقش ایڈی کے امیج میں بھی تبدیلی آئی ہو گی۔ اگر ایڈی چاہتا تو اسے اپنے احساسات سے آگاہ کر سکتا تھا مگر وہ اس کی جذباتیت سے بخوبی واقف ہے اس لئے خاموش تھا۔‘‘

‘‘بات تو صحیح ہے۔‘‘ زارا نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی تھی۔ پھر ہلکی سی سانس اندر کھینچتے ہوئے بولی۔ ‘‘اچھا اب ذرا صبی کی بھی خبر لیں۔ ہمیں کمرے سے نکال کر اب یقیناً رو رہی ہو گی۔‘‘

‘‘واقعی۔ اور ثمین کا بھی کچھ پتہ نہیں کہ جا کر اسے اُلٹی سیدھی سنانا شروع کر دے۔‘‘ شفق چونکی تھی۔

وہ دونوں اندر آئیں تو ثمین اپنا بیگ تیار کئے تنے تنے تاثرات لئے جانے کو تیار تھی۔ صبیرہ اپنا رونا بھول بھال کر اس سے الجھی ہوئی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی پریشانی سے بولی۔

‘‘اسے کیا ہوا ہے زارا؟ یہ گھر جا رہی ہے۔‘‘

‘‘اسے جانے دو صبیرہ! اسے اب ہماری ضرورت نہیں رہی۔‘‘ وہ تلخی سے بولی تو ثمین کی رنگت سرخ پڑ گئی۔ ایک جھٹکے سے کھڑے ہوتے ہوئے اس نے اپنا بیگ اٹھایا تھا۔

‘‘مجھے ‘‘اب’’ نہیں بلکہ کبھی بھی تم لوگوں کی ضرورت نہیں رہی۔‘‘

‘‘تم نے نہ سہی ہم نے تو تمہیں دل سے اپنی دوست سمجھا تھا۔ ہماری فطرت میں کم از کم تمہاری جیسی دغا بازی نہیں ہے۔‘‘ زارا تپی تھی۔

‘‘دغا بازی سے زیادہ دوغلا پن ذلالت بھرا ہوتا ہے۔ اور مجھ میں یہ دوغلا پن نہیں ہے۔ ہاں میں کہتی ہوں کہ میں ایڈی سے محبت کرتی ہوں۔ یوں نہیں کہ اوپر سے بیگانگی کی ادائیں دکھا کر اندر ہی اندر دل مٹھی میں کرنے کے گر آزماتی رہوں۔‘‘ وہ نخوت سے بولی تو شفق کو خود پر قابو نہیں رہا تھا۔

‘‘دوغلا پن تو تم میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ثمین! تبھی تو ہم میں سے کوئی بھی تمہیں پہچان نہیں پایا۔ ہمیشہ تم نے دل میں زہر رکھ کر ہونٹوں پر میٹھی سی مسکراہٹ سجائے رکھی۔ دوستی کا لبادہ اتر جانے کے بعد تم کس قدر ناقابل قبول لگ رہی ہو، یہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔‘‘

‘‘شٹ اپ شفق! میری خاموشی کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔‘‘ وہ غصے میں لال بھبوکا ہو گئی تھی۔ ہکا بکا کھڑی صبیرہ کو یکلخت ہوش آیا تھا۔

‘‘یہ......یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیسی فضول گفتگو کر رہی ہو تم لوگ؟‘‘

"تم اتنی بے خبر نہیں ہو جتنا کہ خود کو پوز کرتی ہو۔ نہ تم شہباز گردیزی کو اپنے پیچھے لگاتیں اور نہ وہ تمہارا دوسرا عاشق میری اَسلٹ کرنے کی جرأت کرتا۔"

ثمین اب کی بار صبیرہ پر چڑھ دوڑی تھی۔ اس کا انداز اس قدر پُرتحقیر تھا کہ صبیرہ کے تو جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہ تھا۔

"اب تم اپنی حد بھول رہی ہو ثمین! اسے شہباز گردیزی کی اصلیت نہ بتا کر تم نے کمینہ پن دکھایا ہے نہ کہ ایڈی نے۔ وہ بے چارہ تو ہمیشہ ہی سے اس دوستی کے بھی اصول نبھاتا رہا ہے جو کبھی ہمارے درمیان رہی ہی نہیں۔" زارا نے تیز لہجے میں کہا تو وہ مزید کچھ کہے بنا اپنا بیگ اٹھائے کمرے سے باہر نکل گئی۔

"یا خدا......" شفق دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھ گئی۔

اور صبیرہ، وہ تو ابھی تک بے یقینی کے تھپیڑوں کی زد میں تھی۔ ثمین کا یہ روپ کس قدر بے یقین کر دینے والا تھا۔ کس قدر گرے ہوئے الفاظ استعمال کر گئی تھی وہ۔ مگر کوئی دوستی کا مان یونہی تو نہیں ٹوٹتا۔ ہر ردعمل کا کوئی نہ کوئی محرک ہوتا ہے۔ کچھ تو ہوا ہوگا جو وہ......"

تو کیا پھر سے ایڈی نے کچھ......

اس کی رنگت خطرناک حد تک سپید پڑ گئی تو زارا نے اسے زبردستی بستر پر بٹھا دیا تھا اور شفق کے لاکھ اشارے کرنے کے باوجود آہستہ آہستہ تمام تفصیل اسے بتا دی۔

وہ خاموش و ساکت بیٹھی تھی مگر آنسوؤں نے اس کا چہرہ بھگو دیا تھا۔

"کبھی کبھی زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے صبی! جن لوگوں کو ہم بہت اپنا اور رگِ جاں سے بھی قریب سمجھتے ہیں، وہ فقط سراب نکلتے ہیں۔ ان کے تمام دعوے کھوکھلے اور الفاظ بے معنی ہوتے ہیں۔ حقیقت میں وہ اتنے قریب رہ کر فقط ہماری جڑیں کاٹنے اور ہمارے پیر زمین سے اکھاڑنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ ثمین کی اصلیت بہت موقع پر کھل گئی۔ ایڈی سے تم جتنا بھی چڑتی ہو، خار کھاتی ہو مگر اس نے واقعی ہر برے موقع پر تمہاری مدد کی ہے۔ تمہارا ہر برا سلوک اور تلخ نوائی بھول کر۔ اصل دشمنی تو ثمین نبھا رہی تھی تمہارے ساتھ۔ جو جانے کب اور کیسے یہ راز پا گئی کہ ایڈی تم سے محبت کرتا ہے۔"

صبیرہ کے آس پاس کہیں بہت زوردار دھماکہ ہوا تھا۔ وہ بے حد بے یقینی سے زارا کو دیکھنے لگی۔

✡......✡

"ابو کیسے چلے گئے وقار؟ وہ تو مجھ سے ناراضگی دور کیے بغیر، مجھے منائے بغیر سوتے بھی نہیں تھے۔ پھر وہ اتنی گہری نیند کیسے سو گئے کہ میرا کوئی بلاوا بھی ان کی سماعت تک نہیں پہنچتا۔ وہ اتنے ظالم نہیں تھے وقار! اور مجھ سے تو بہت محبت کرتے تھے۔ بہت......" وہ مسلسل رو رہی تھی۔ وقار علی لب بھینچے اس کی دل گرفتہ باتیں سن رہا تھا۔

ملگجے سے کپڑوں میں ملبوس، کنگھی سے بے نیاز بالوں کو لپیٹ کر جوڑے کی شکل دیئے وہ بالکل ٹوٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا تمام تر اعتماد اور شگفتگی دُکھ اور سوگ کے لبادے میں چھپ گئی تھی۔

آج کتنے ہی دن ہو گئے تھے اس جاں گسل واقعہ کو، مگر تابندہ کا ذہن تو جیسے انہی لمحات میں منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ جب اسے ضیاء احمد کے مرنے کی خبر ملی۔ اس کی ماں نے اسے دھتکار دیا۔ اس کے لئے اپنے گھر کے دروازے وا نہیں کئے مگر وہ سر پر ہاتھ رکھے صرف اپنے باپ کو رو رہی تھی۔

"کتنا بڑا نقصان کر رہی تھی میں اپنا وقار! میں اس وقت جانتی تو ابو کے ایک اشارے پر اپنی جان وار دیتی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں کتنا گھاٹے کا سودا کر رہی ہوں۔ ایک محبت کو پانے کی خاطر اتنی انمول محبت کھو رہی ہوں۔ وہ نہ مرتے وقار! وہ ابھی نہ مرتے وقار! مگر میں نے انہیں مار دیا۔ میری خودسری نے ان سے جینے کی امنگ چھین لی۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ میں تو ان محبتوں کا بدلہ بھی نہیں چکا پائی جو انہوں نے مجھ پر لٹائی تھیں۔ کیوں نہ میں نے ان کی لاج رکھ لی۔ ایک ذرا سی قربانی ہی تو مانگ رہے تھے۔ کیوں نہ میں نے اپنے دل کو مار لیا۔"

وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

اس کا نقصان بہت بڑا تھا اور دکھ اس سے بھی عظیم۔ مگر اس کے لبوں سے ادا ہونے والے الفاظ وقار علی کو پسند نہیں آئے تھے۔

"ان کی موت حکمِ ربی تھی۔ اس میں تمہارے کسی عمل کا دخل نہیں ہے۔ تم ان کی بات مان بھی لیتیں تو وہ اتنی ہی سانسیں لے پاتے جتنی کہ خدا نے ان کے نصیب میں لکھ رکھی تھیں۔"

اس کے آنسوؤں میں مزید روانی آ گئی۔

"کچھ بھی ہو وقار! پھر وہ مجھ سے خفا تو نہ جاتے۔ ساری عمر کی کسک اور ضمیر کی ملامت تو میرے حوالے نہ کر جاتے۔"

چند لمحے اس کی صورت دیکھنے کے بعد اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے انگلیوں کی پوروں سے اس کے رخسار خشک کیے اور ملائمت سے بولا۔

"تم جتنا اس بات کو ذہن پر سوار کرو گی اتنا ہی احساسِ جرم بڑھے گا۔"

وہ اس کی بات کاٹ کر تھکن زدہ لہجے میں بولی۔

"جرم ہے تبھی تو احساس بھی ہوتا ہے وقار!" اس کی بات پر وہ ثانیہ بھر کو چپ رہ گیا تھا، پھر چبھتے ہوئے انداز میں بولا۔

"یہ سب تو شادی سے پہلے سوچنے والی باتیں تھیں۔ تب تمہیں احساس نہیں ہوا کہ یہ "جرم" ہے۔ مان لیتیں ان کی بات۔ برا تو احسن ملک بھی نہیں تھا۔"

تابندہ نے کرنٹ کھا کر اسے دیکھا تھا۔

"ساری بات دل کی تھی وقار! میرے دل نے کبھی بھی احسن کو وہ مقام نہیں دیا تھا جو آپ کو ان چند دنوں میں مل گیا تھا اور آپ ایسی باتیں کر رہے ہیں؟"

"یہ سب میں نہیں کہہ رہا۔ بلکہ تمہارے اس احساسِ جرم کا حاصل جمع ہی یہ نکلتا ہے۔" وہ یقیناً ناراض تھا۔ تابندہ کی آنکھیں پھر سے بھر آئیں۔

"آپ سے شادی کر کے تو نہیں پچھتا رہی۔ دکھ تو صرف ابو کا دل دُکھانے کا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں، امی نے مجھ سے بات کرنا تو ایک طرف میری صورت بھی نہیں دیکھی۔ رخشی کو بھی ملنے نہیں دیا۔ کتنی دیر تک میں دروازہ کھٹکھٹاتی رہی، ان کی منتیں کرتی رہی مگر ان کا دل نہیں پگھلا۔ کبھی میرا دل بھی تو ایسا ہی پتھر ہو گیا تھا، میں نے بھی کسی کی منت نہیں مانی، کسی کی عزت نہیں رکھی۔ کتنی جلدی خدا نے مجھے بدلہ دے دیا۔"

"اچھا اب بس کرو۔ یہ سارے دُکھ سکھ تو زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ اب دیکھو پہلے ہم دونوں کی شادی ہوئی تھی تو لگا جیسے دنیا مٹھی میں سما گئی ہو۔ ساری خوشیاں قدموں تلے بچھی محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر تمہارے ابو کی ڈیتھ کا سانحہ ہو گیا مگر زندگی یہیں تو ختم نہیں ہو جاتی نا۔ خدا نے اتنی بڑی ایک اور خوش خبری دے ڈالی۔ ایک نئی زندگی کو تخلیق کرنے کی خوب صورت سی ذمہ داری سونپ ڈالی ہے تمہیں۔ اور تم اتنی کیئر لیس ہو رہی ہو۔ پتہ ہے ڈاکٹر نے تمہیں مکمل بیڈ ریسٹ کو کہا ہے اور خوش رہنے کی ہدایت تو خاص طور پر کی ہے۔ جتنی بری صورت بنا کر تم اس وقت بیٹھی ہو اگر ہمارا بے بی بھی ایسا ہی ہوا تو میں اسے بالکل بھی نہیں گود میں لوں گا۔"

سنجیدگی سے اسے سمجھاتے ہوئے وہ دفعتاً ہی شرارت پر اتر آیا تھا۔ اس قدر سوگوار احساسات تلے دبے ہونے کے باوجود تابندہ کو عجیب سی شرم نے گھیر لیا۔ اس کی لرز کر جھکنے والی پلکوں اور بے ساختہ مسکراہٹ نے وقار علی کو بہت لطف دیا تھا۔

"اب اٹھ جاؤ۔ جلدی سے کپڑے تبدیل کرو اور اپنی پیاری سی سابقہ شکل لے کر سامنے آؤ جس پر ترس کی بجائے بے ساختہ پیار آئے۔" اس کا رخسار تھپتھپاتے ہوئے کہا تو وہ منہ بسورنے لگی۔

"ابھی میرا بالکل بھی دل نہیں کر رہا۔"

"اور جو میرا دل کر رہا ہے وہ؟"

اس کا ہاتھ تھام کر اٹھا دیا تو وہ دل نہ چاہنے کے باوجود صرف اس کی خاطر الماری سے کپڑے نکال کر واش روم میں چلی گئی۔ دکھ کا احساس اپنی جگہ مگر جو کچھ ہاتھ میں تھا اسے بھی گنوانا ہوش مندی نہیں تھی۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے آئی تب بھی اس کے چہرے کی ویرانی میں کمی نہیں آئی تھی۔

"اب جلدی سے بال بھی بناؤ۔" وہ آرڈر دے رہا تھا۔

"کہیں جانا تو نہیں ہے۔ پھر اس سارے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ بیزار ہو رہی تھی۔ ان گزرے دنوں نے صحیح معنوں میں اس کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے تھے۔ اس قدر ناطاقتی کا احساس ہو رہا تھا کہ یہ سب چونچلے بھی اچھے نہیں لگ رہے تھے۔

"اس سارے کی ضرورت یہ ہے کہ مابدولت اپنی ملکۂ زیست کو پائیں باغ کی سیر کے لئے لے جانا چاہتے ہیں۔" وہ خود اٹھ کر اس کے بالوں کا جوڑا کھولنے لگا تھا۔ تابندہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

بال برش کر کے اس نے چٹیا گوندھی تو وہ اس کا ہاتھ تھامے باہر لے آیا۔ دالان میں بیٹھی صدیقہ بھابی کو دیکھ کر دور ہی سے آواز لگا دی۔

"دو کپ گرما گرم چائے، پائیں باغ میں بادشاہ اور ملکہ کی خدمت میں پیش کی جائے۔"

وہ ہنس دیں۔ جبکہ تابندہ خفت کا شکار ہونے لگی۔

"حد کرتے ہیں آپ بھی۔ بھابی کیا سوچیں گی، میں خود چائے نہیں بنا سکتی کیا؟"

"ہر ایک کا دماغ تمہارے جیسا نہیں ہوتا ہے۔" وہ لاپروائی سے کہتا اسے ساتھ لئے فوارے کی طرف چلا آیا۔

آسمان پر ہلکی ہلکی بدلیاں چھائی ہوئی تھیں، سو ہوا میں گزشتہ دنوں جیسی تپش کی بجائے دلفریب سی ٹھنڈک موجود تھی۔ کچے آم اور لیموں کی خوشبو سرخ و سفید گلابوں کی دھیمی خوشبوؤں پر حاوی ہو رہی تھی۔ ڈوبتے سورج کی سرخی اُفق پر بادلوں کی چادر کے پیچھے سے بھی دکھائی دے رہی تھی۔

موسم کی اس دلفریبی اور پرندوں کی چہچہاہٹ نے تابندہ کے موڈ پر خاصا اچھا اثر ڈالا تھا۔

"کس قدر رومانوی موسم ہے نا۔" نازک سا سرخ گلاب اس کی مُشک بُو زلفوں میں سجاتے ہوئے وہ اس کی طرف جھکا تو وہ ہنس دی۔

''جناب کو کون سا موسم رومانوی نہیں لگتا؟''

''وہ موسم جس میں صنم پاس نہ ہو۔'' وہ اس کے رخسار کو چومتی لٹ کو انگلی اور انگوٹھے کی گرفت میں لے کر ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے مسکرایا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''ویسے اس وقت میں اس لٹ سے کافی جیلس ہو رہا ہوں۔'' تابندہ نے ہنستے ہوئے اس کی گرفت سے بالوں کی لٹ آزاد کرائی تھی۔

''آپ کو تو فری ہونے کا بہانہ چاہئے ہوتا ہے۔''

''ارے، یہ کیا بات ہوئی؟ حق رکھتے ہیں، ہمیں بہانے کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ مزید بے تکلف ہوا تھا۔ اس کے انتہائی قریب ہوا تو اس کی ہنسی کی جھنکار ہر خوش کن آواز پر حاوی آنے لگی۔

کھڑکی کے پردے برابر کرتی فوزیہ کے اندر اس منظر نے جیسے آگ سی دہکا دی۔ آنکھوں سے پیار کے ساغر لٹاتا وہ من وتُو کا فاصلہ مٹائے ہوئے اس کے کس قدر قریب تھا۔ وہ جس کو ہمیشہ ہی سے وہ اپنے خوابوں میں دیکھتی چلی آئی تھی۔ جسے شروع ہی سے اپنے من مندر کا دیوتا مانے دل کے سنگھاسن پر بٹھائے اس کی پوجا میں مصروف رہی تھی۔ مگر شاید اس کی تپسیا میں کوئی کمی رہ گئی تھی یا پھر دیوتا ہی کا دل بے ایمان تھا جو اسے روگی کر کے اپنے من کا امرت کسی اور کے گھڑے میں انڈیل دیا۔

وہ جلتی آنکھیں لئے مضطربانہ انداز میں کمرے میں ادھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔

اعزاز علی کا استحقاق قبول کرنا اس کے لئے ایک مجبوری تھی مگر دل پر کس کا زور چلا ہے۔ وہ آج بھی فقط ایک ہی نام کا راگ الاپتا تھا، وقار علی ......وقار علی۔

اس کی رگ رگ میں جیسے شرارے دوڑ اُٹھے تھے۔ اپنے اندر کے شور اور گھٹن سے گھبرا کر وہ باہر نکل آئی۔

''یہ وقار علی کدھر ہے؟ کل سے آیا ہوا ہے یہ لڑکا، مگر آنکھ میں ڈالنے کے جتنا بھی دستیاب نہیں۔'' بے جی عصر کی نماز سے فراغت کے بعد تخت پر بیٹھی تسبیح رول رہی تھیں۔ تفکر سے پوچھنے لگیں۔

فوزیہ تو پہلے ہی تپی ہوئی تھی، اب تڑخ بھی گئی۔

''ہونا کہاں ہے بے جی! وہی ہر بار کی طرح اپنی لاڈلی بیوی کی جی حضوری میں لگے ہوئے ہیں دیور جی۔ کبھی باغ میں جا کر دیکھیں کیا گل وبلبل کا کھیل تماشا ہو رہا ہے۔''

''ہیں ......کیا ہو رہا ہے ......؟'' بے جی نے استعجاب بھرے انداز میں پوچھا تو وہ کوفت زدہ انداز میں بھنوئیں سکیڑتے ہوئے تلخی سے بولی۔

''وہی جو شادی کے روز سے اب تک ہوتا چلا آ رہا ہے۔ آپ کا بیٹا آپ کا نہیں رہا، رفتہ رفتہ وہ جادوگرنی اسے سب سے دور کر کے یہاں سے نکالنے کے چکروں میں ہے۔ خود تو کبھی گھر والوں میں گھل مل کر نہیں بیٹھی، اب وقار علی کو بھی آپ سے دور کر دیا ہے۔''

بے جی کی پیشانی پر شکنوں کا جال سا پھیل گیا۔

فوزیہ کی کہی ہوئی باتیں کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھیں۔ وہ وقار علی جو آتے ہی ماں کے گھٹنوں سے لگ کے بیٹھ رہتا تھا، اب وہ اس کی شکل کو بھی ترس گئی تھیں۔ ویک اینڈ پر آتا بھی تو ہمہ وقت اسے بیوی کے موڈ کی فکر ستاتی رہتی تھی۔

تابندہ پر حادثہ ہی ایسا گزرا تھا کہ بے جی نے وقار علی کے اس التفات کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا مگر فوزیہ نے جس طرح کی منظر کشی کی تھی اسے سن کر بے جی کا ماتھا ٹھنکا۔

''آپ خود سوچیں۔ جس لڑکی نے اپنے ماں باپ کو چھوڑنے میں پل بھر نہیں لگایا اس کے نزدیک وقار علی کے گھر والوں کی کیا اوقات ہو سکتی ہے۔ میں تو کہتی ہوں بے جی! ابھی سے کچھ کر لیں۔ وقار علی کی آنکھوں پر تو اس کی محبت کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ شادی سے پہلے ہی وہ یہاں سے رسیاں تڑا رہا تھا اب تو خیر سے وہ ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتی ہے۔ دیر ہو گئی تو بس پچھتاوا ہی ہاتھ آئے گا۔'' فوزیہ نے بڑی کامیابی سے بچھائی بساط پر ملکہ کو آگے بڑھانا شروع کیا تھا۔

چائے پی کر وقار علی زمینوں پر جانے کے لئے نکل گیا تو وہ بھی آہستہ روی سے چلتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔ وقار علی کی کچھ دیر کی قربت نے ہی اس کے ذہن پر چھائی کثافت کو بہت حد تک کم کر دیا تھا۔ وہ اب خود کو بہت فریش محسوس کر رہی تھی۔

''ہیلو بھابی جان!'' ہنستا مسکراتا اعزاز علی اندر داخل ہوتے ہوئے اس کا مقدم ہوا تھا۔ تابندہ نے بہت خوش اخلاقی سے اس کو جواب دیا۔ اس نے جو قربانی تابندہ اور وقار علی کی زندگی کی خوشی کے لئے دی تھی اس کی وجہ سے تابندہ بھی اس کی معترف ہو گئی تھی۔

انہیں یوں کھلکھلاتے ہوئے اکٹھے اندر آتے دیکھ کر جہاں فوزیہ کے دل پر چھریاں چلی تھیں وہیں بے جی کی پیشانی بھی پُرشکن ہو گئی۔ اعزاز علی تو اپنے کمرے میں چلا گیا مگر تابندہ کے قدم بے جی کی اونچی پکار نے ٹھٹکا دیئے تھے۔

''دلہن ......''

وہ ان کے تاثرات میں واضح تبدیلی محسوس کرتی ان کی طرف آئی۔ فوزیہ کے ہونٹوں پر دلچسپ سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ بڑے اطمینان سے گدیلی کرسی میں دھنس کر بیٹھی تھی۔

''جی بے جی ......؟'' اس کا لہجہ مدھم تھا۔ کچھ بھی ہو اول روز ہی سے بے جی نے چاہے اس کی کتنی ہی آؤ بھگت کیوں نہ کی تھی، پھر بھی اسے اپنے اور ان کے درمیان ایک سردمہری کی چادر تنی محسوس ہوتی تھی۔ وہ چاہ کر بھی ان کے قریب نہیں ہو پائی تھی۔

بے جی نے اس کو سرتاپا کڑی نگاہوں سے دیکھا تو وہ جزبز ہونے لگی۔

''اس حویلی کے کچھ طور طریقے اور کچھ ادب آداب ہیں دلہن! تم تو خیر آزاد گھرانے سے آئی ہو مگر ہمارے ہاں کی عورتیں یوں اپنے دیور، جیٹھ کے سامنے بے پردہ نہیں گھومتی رہتیں اور نہ ہی یوں اونچی آواز میں قہقہے لگاتی پھرتی ہیں۔''

اس قدر اچانک اور غیر متوقع انداز و الفاظ، وہ پتھر کے مجسمے کی طرح اپنی جگہ پر گڑی رہ گئی۔

بے جی لحظہ بھر کو خاموش ہوئیں۔ ان کا خیال تھا کہ جواباً وہ معذرت کے کچھ الفاظ ادا کرے گی مگر اس کی خاموشی انہیں مزید چڑا گئی۔

''مانا کہ تمہیں ہم سب کے بیچ آ کر بیٹھنا پسند نہیں ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم اپنی ہی دنیا بسا کر بیٹھ جاؤ۔ وقار علی اگر تمہیں کچھ نہیں کہتا تو اس سے مراد یہ مت لو کہ تمہاری وجہ سے اس حویلی کے قاعدے قانون بدل دیئے جائیں گے۔ شرم وحیا عورت کا زیور ہوتا ہے، اسے سنبھال کر رکھنے میں ہی دانش مندی ہے۔''

''بے جی ......میں باہر وقار کے ساتھ تھی ......''

لکڑی کی طرح اکڑی زبان بمشکل حرکت میں آئی تو اس نے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔ اس قدر اچانک حملے نے تو اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔

''یہی تو بے جی تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہیں تابندہ بی بی! کہ وقار علی کو اپنے پلو سے لگائے ہوئے مت گھومو۔ اس گھر کے بھی کچھ فرائض ہیں، بہوئیں جنہیں ادا کر کے ہی سرخرو ہوتی ہیں۔ تم نے تو صدیقہ بھابی ہی کو کام والی تصور کر لیا ہے۔ اوپر سے یہ اعزاز علی والا ڈرامہ۔'' وہ ذرا رک کر معنی خیز انداز میں مسکرائی تھی، پھر بولی۔

''سچ پوچھو تو مجھے خود بھی یہ بات پسند نہیں آئی۔ مانا کہ تم پر تو ماحول کی آزادی کا اثر ہے مگر مردوں کو یہی آزادی لبھا لیتی ہے بعض اوقات۔ تمہیں تو اچھا خاصا تجربہ بھی ہے۔''

''فوزیہ......''

اس کے تمام حواس یکلخت بیدار ہوئے تھے۔ اسے لگا جیسے اس کے وجود میں کسی نے نیزہ گاڑ دیا ہو۔ وہ بلند آواز میں اسے ٹوک گئی۔

''آواز دھیمی رکھو تابندہ!''

بے جی نے سختی سے کہا تو وہ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی جن کے تاثرات میں بے حد سردمہری اتر آئی تھی۔

☆......☆

بے یقینی کی گہری دُھند اسے اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھی۔ پے در پے کھلنے والی حقیقتوں نے درحقیقت اسے ڈگمگا دیا تھا۔ وہ چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ رہی۔ تب زارا کو بھی صورت حال کی سنگینی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔

پہلے سطوت رانا پھر ثمین اور شہباز گردیزی والا معاملہ ہی کچھ کم گمبھیر نہ تھا کہ وہ نادانستگی میں ایڈی کی خفیہ محبت بھی آشکار کر گئی تھی۔

''تم ٹھیک تو ہو ناصبی ......؟'' زارا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ اس سے لپٹ کر رو پڑی۔ یہ اس کی برداشت کی آخری حد تھی۔

''تم ایک مرتبہ پھر سے ایڈی کو غلط مت سمجھ لینا۔ یہ بات ہمیں اس نے براہ راست نہیں بتائی بلکہ ایڈی اور ثمین کی جھڑپ کے دوران پتہ چلی ہے۔ وہ یقیناً ایک اچھا دوست اور قابل تعریف انسان ہے صبی! ہم لوگ ہی ہمیشہ ثمین کی باتوں میں آ کر ایڈی سے متنفر رہی ہیں۔'' شفق نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

اسی وقت دروازہ نہایت عجلت سے بجایا گیا، ساتھ ہی ثوبان کی گھبرائی ہوئی شکل دکھائی دی۔ ان کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وہ تیزی سے بولا۔

''ابھی فرحان کی کال آئی تھی۔ ایڈی کی شہباز گردیزی کے ساتھ جھڑپ ہو گئی ہے، ابھی میں وہیں جا رہا ہوں۔ اگر پاپا نے یا آغا جان نے پوچھا تو ذرا سنبھال لینا۔''

وہ جتنی جلدی میں آیا تھا اسی افراتفری میں واپس پلٹا تو زارا اس کے پیچھے لپکی۔

''مگر تم جا کہاں رہے ہو؟''

''ہاسپٹل۔'' وہ مختصراً کہتا ہوا چلا گیا۔ ان تینوں کی رنگت بدل گئی۔

''ہاسپٹل ......؟'' صبیرہ کا دل کسی کھائی میں ڈوب کر ابھرا تھا۔

......

اس وقت وہ انتہائی غیر متوقع صورت حال کا سامنا کر رہی تھی۔

''یہ شریفوں کا گھرانہ ہے، ذرا اپنی آواز دھیمی رکھو۔ ہماری بہو بیٹیاں اتنی اونچی آواز میں بات نہیں کرتیں۔'' بے جی غصے میں آگا پیچھا دیکھنے کی عادی نہیں تھیں، سامنے جو بھی ہوتا اسے لفظوں سے دھنک کر رکھ دیتیں۔

تابندہ کا خون جیسے تیزاب بن کر رگوں کو خاکستر کرنے لگا۔

''تو آپ کا کیا خیال ہے کہ میرا تعلق کسی شریف گھرانے سے نہیں ہے؟'' اس نے اپنی آواز کنٹرول کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''میں کہتی ہوں تابندہ! آہستہ بات کرو۔'' بے جی نے اسے سختی سے ٹوکا۔

''کیوں...... کیوں آہستہ آواز میں بات کروں؟ آپ لوگ چاہیں تو منٹوں میں مجھے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیں اور مجھ سے توقع کرتے ہیں کہ میں اخلاقیات کی پاسداری کر کے سر جھکائے جوتے کھاتی رہوں۔ تو یہ آپ کی بھول ہے۔'' وہ پھٹ پڑی تھی۔

فوزیہ خاموش تماشائی بنی لطف اندوز ہو رہی تھی۔ جبکہ بے جی کا غصہ تو آسمانوں کو چھونے لگا۔ انہیں تابندہ سے اس قدر دلیری کی توقع نہیں تھی۔

''تو تم کیا چاہتی ہو کہ تمہیں مردوں کے ساتھ ہنسی ٹھٹھول کرنے کی کھلی آزادی دے دی جائے؟'' ان کا غصے سے بھرا تلخ لہجہ تابندہ کو جھلسا گیا۔

''مرد؟ کن مردوں کی بات کر رہی ہیں آپ؟ ابھی کچھ دیر پہلے میں اپنے شوہر کے ساتھ تھی۔ اور جس مرد کے ساتھ ''ہنسی ٹھٹھول'' کی آپ بات کر رہی ہیں، وہ میرا جیٹھ ہے اور اس کا میں اپنے بڑے بھائی جیسا احترام کرتی ہوں۔''

''بھائی جیسا احترام کرنے اور بھائی ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے تابندہ بی بی!'' فوزیہ نے معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ اس پر الٹ پڑی۔

''یہ سب تمہاری لگائی ہوئی آگ ہے۔ اور میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ کون سی جلن تمہیں یہ سب کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔''

''اپنی زبان کو لگام دو دُلہن!'' بے جی نے کڑک دار آواز میں کہا۔ اسی اثنا میں اعزاز علی اور صدیقہ بھابی بھی افتاں وخیزاں دالان میں نکل آئے۔

''میں...... زبان کو لگام دوں......؟'' وہ شدید غصے کے ساتھ ساتھ صدمے کی زد میں بھی تھی۔ کس قدر گھٹیا انداز فکر تھا ان لوگوں کا۔ ''اور آپ جو جی میں آئے کہتی رہیں۔ کم از کم آپ کو تو اپنے مرتبے اور حیثیت کا خیال کر لینا چاہئے۔'' وہ غصے سے بولی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے تابندہ؟'' صدیقہ بھابی کے حواس اُڑنے لگے۔ بھلا بے جی کے سامنے کوئی اس لہجے اور آواز میں کب بات کر پایا تھا۔

''یہ آپ بے جی سے پوچھئے یا پھر ان کی چہیتی بہو سے۔'' وہ تلخی بھرے انداز میں کہتی رکی نہیں تھی، سیدھی اپنے کمرے میں آ گئی۔

''کہاں ہے وقار علی؟ ذرا بلاؤ تو اسے، وہ بھی تو آ کر دیکھے اپنی چہیتی بیوی کی زبان درازی۔'' بے جی کی کڑک دار آواز اسے یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔

''آخر بات کیا ہے بے جی؟ کچھ سرا تو پکڑائیں۔'' اعزاز علی پریشانی کے عالم میں پوچھ رہا تھا۔

''بات چاہے کچھ بھی ہو، میں کہتی ہوں اس کل کی لڑکی کی میرے سامنے اتنی اونچی آواز میں بات کرنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ زبان کاٹ کے ہاتھ میں تھما دوں گی۔''

تابندہ نے زور سے دروازہ بند کر کے ہینڈ لاک دبا دیا اور کنپٹیاں مسلتی بستر پر چلی آئی۔ اس کی دماغی نسیں جیسے پھٹنے ہی والی تھیں۔ ایک تو پہلے ہی بمشکل وہ ایک صدمے سے نکلنے کی کوشش میں تھی، اوپر سے بے جی اور فوزیہ کی الٹی سیدھی باتوں نے اس کا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا۔ ورنہ وہ کم از کم بے جی کے سامنے یوں زبان کھولنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ نڈھال سی تھی۔

اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ بے جی اس سے اس طرح پیش آ سکتی ہیں۔ کتنے آرام سے وہ اس کی اور اعزاز علی کی بے تکلفی کو ایک غلط رنگ دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''مائی گاڈ!'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''کس قدر گھٹیا سوچ ہے ان لوگوں کی۔ اور وہ فوزیہ، اس تمام کھیل کے پیچھے یقیناً اسی کا دماغ کام کر رہا ہے۔ ورنہ اتنے دنوں میں بے جی نے کبھی بھی میرے ساتھ ایسا رویہ روا نہیں رکھا۔''

زوردار طریقہ سے دروازہ دھڑ دھڑائے جانے پر اس نے چونک کر گھٹنوں پر سے سر اٹھایا۔ جانے وہ کتنی دیر تک سوچوں میں گم بیٹھی رہی تھی، کھڑکیوں کے پردے گرے ہونے کے باعث کمرے میں بالکل اندھیرا ہو رہا تھا۔

دروازے کے پار وقار علی کی آواز سن کر اس نے تیزی سے اٹھ کر لائٹ آن کی اور دروازہ کھول دیا۔ گزشتہ تمام تر اذیت جیسے اسے سامنے پا کر پھر سے عود کر آئی تھی۔ مگر وہ دروازہ بند کر کے پلٹا تو اسے کوئی اور ہی وقار علی لگا۔ پتھریلے چہرے اور درشت لہجے والا۔

''تم نے بے جی سے بدزبانی کی ہے؟''

اس کے سرد لب ولہجے سے تابندہ کو اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وہ ابھی بے جی کے پاس ہی سے اٹھ کر آ رہا ہے اور یقیناً انہی کی زبان منہ میں لے کر آیا تھا۔

''تصویر کا ایک ہی رخ مت دیکھیں وقار! مجھ سے یہ بھی تو پوچھیں کہ بات کیا ہوئی ہے۔''

اس کے انداز نے تابندہ کو دُکھی کیا تھا۔

''بات چاہے کچھ بھی ہوئی ہو، تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم بے جی کے ساتھ اونچی آواز میں بات کرو۔''

وہ ششدر رہ گئی۔

دانتوں پر دانت جمائے، مٹھیاں بھینچتا یہ وقار علی کا بہت اوپرا سا روپ تھا۔ دکھ اور بے یقینی کا شدید احساس اس کی رگوں کو دور تک کاٹتا چلا گیا۔

''وقار! آپ بھی انہی کی طرح مقابل کو صفائی کا موقع دیئے بغیر بس دفعہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

''تو کیا غلط کہا ہے بے جی نے۔ اگر تم حویلی کے مردوں کے سامنے سر پر دوپٹہ اوڑھ لو گی تو تمہارے حسن کی تشہیر میں کون سی کمی آ جائے گی۔'' وہ آگ کا گولہ بنا ہوا تھا، چھو لو تو تن بدن جل کر راکھ ہو جائے۔ تابندہ بھی جھلس رہی تھی۔

''آپ بھی تو صدیقہ بھابی کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے ہیں، اگر میں نے مسکرا کر اپنے جیٹھ سے بات کر لی تو کیا گناہ ہو گیا؟''

''مائنڈ یو، وہ میری ماں کے برابر ہیں۔'' اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ انگشت شہادت اٹھا کر متنبہ کرنے والے انداز میں بولا تو وہ باوجود ضبط کے چلا اٹھی۔

''تو کیا میں اعزاز علی کو اپنا بھائی نہیں سمجھتی ہوں۔ مجھ پر ہی ایسی پابندی کیوں ہے؟''

''دیکھو تابندہ! یہ حویلی، اس کے قاعدے اور قانون سب بے جی کے ہیں۔ تمہیں بالکل ویسے ہی رہنا ہو گا جیسے وہ چاہتی ہیں۔ تمہاری خاطر میں ایک بار اعزاز علی کی زندگی برباد کر چکا ہوں مگر دوبارہ میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔''

وہ شعلہ بار لہجے میں کہتا اس کی محبت کا سارا مان، سارا غرور جلا کر راکھ کر گیا۔

غصے کی شدید لہر اس کے سر سے پیروں تک دوڑی تھی مگر کچھ کہنے سے پہلے ہی اسے یوں لگا جیسے ہر طرف سفید دھند پھیل گئی ہو۔ آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے اس نے نادیدہ سہارے کو تھامنے کی بے سود کوشش کی مگر کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ وہ ہوا میں لحہ بھر کو لہرا کر نیچے گرنے کو تھی جب انتہائی غیر ارادی طور پر وقار علی نے ہاتھ آگے بڑھائے تو وہ ملائم ریشم کی طرح اس کی گرفت میں بکھر گئی۔

اس کا تمام غصہ اور قہر منٹوں میں اُڑن چھو ہو گیا۔ انتہائی حواس باختہ سا وہ صدیقہ بھابی کو آوازیں دینے لگا۔

......

''میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے؟ شادی والے گھر میں عجیب سی پریشانیاں اُٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ پہلے تم لوگوں کی دوست اٹھ کر چل دی۔ لاکھ میں نے روکا کہ کل مہندی کا فنکشن ہے مگر اس نے ایک نہیں سنی۔ چلو مانا کہ اسے ایمرجنسی میں جانا پڑ گیا مگر اب ایڈی کو کسی فضول چکر میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ شکر ہے خدا کا معمولی زخم آئے ہیں اور بچے کی جان بچ گئی ورنہ ہم اس کے گھر والوں کو کیا منہ دکھاتے۔'' زارا کی ممی مسلسل پریشانی کے عالم میں بول رہی تھیں اور کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی تھیں۔ آج شام کو مہندی کا فنکشن تھا اور رات کو ایڈی کو وہ لوگ بینڈیج کروا کر ہاسپٹل سے لائے تھے۔

''ممی! ثوبان کہہ تو رہا تھا کہ روڈ ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔'' زارا نے دبے لفظوں میں کہنا چاہا تو انہوں نے اسے جھڑک دیا۔

''بے وقوف مت بناؤ مجھے۔ تمہارے ابو بھی سخت ناراض ہو رہے ہیں، اچھی خاصی جھڑپ ہوئی ہے ایڈی کی ان لڑکوں کے ساتھ۔ اس کے ''کرتوں'' کا کرشمہ تو ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے جبکہ ان کی فائرنگ سے یہ بمشکل بچا ہے۔ جو گولی بازو کو چھوتی ہوئی گزر سکتی ہے وہ خدانخواستہ کہیں اور بھی لگ سکتی تھی۔ مگر یہ آج کل کے لڑکے، ان کو کون سمجھائے۔ اچھا خاصا پیارا اور سمجھدار بچہ ہے، پھر بھی۔'' وہ تفکر آمیز لہجے میں کہتی سر جھٹکتی چلی گئیں۔

شفق اب صبیرہ کی طرف متوجہ تھی جو ایک بار پھر سے رونے کی تیاری پکڑ رہی تھی۔

''کم آن صبی، یار! جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب پلیز تھوڑی سی خوشی بھی منا لو۔ آنٹی بے چاری پہلے ہی ہم لوگوں کی وجہ سے اتنا پریشان ہو رہی ہیں۔''

''یہ سب میری بے وقوفی اور کم فہمی کا نتیجہ ہے شفق!'' وہ بھبک کر رو دی تھی۔

''میری ممی کو تو پریشان ہونے کی عادت ہے۔ صبح سے اب تک پتہ نہیں کتنی بار صدقہ خیرات نکال چکی ہیں۔ ایڈی کی نظر تک اتار آئی ہیں پھر بھی چین نہیں آ رہا۔ اب تم تو مت رو یار! اتنے اچھے موقع پر سب یوں سوگوار پھر رہے ہیں، ابھی سب رشتہ دار آنے والے ہیں۔ وہ پتہ نہیں کیا باتیں بنائیں گے۔ اپنا موڈ ٹھیک کرو اور میری شادی کو

اچھے طریقے سے انجوائے کرو۔ خبردار جو میں نے کسی کی سڑی بُسی شکل دیکھی تو۔'' زارا نے دھمکایا تھا۔ صبیرہ کو ایک جھٹکا سا لگا۔

واقعی، کس قدر بے پرواہ تھی وہ اس سے کہ یہ زارا کی شادی کا پُرمسرت موقع ہے۔ وہ بے چاری تو انہیں خوشیاں بڑھانے کے لئے لے کر آئی تھی اور یہاں سب نے اس کے لئے پرابلمز کا پہاڑ کھڑا کر دیا تھا۔

''آئی ایم سو سوری زارا! مجھے خیال ہی نہیں رہا۔'' وہ خفت زدہ سی آنکھیں مسلنے لگی۔ اس خیال سے تو وہ جتنا بھی شرمندہ ہوتی وہ اس وقت کم تھا کہ زارا کی شادی والے دن بھی تمام مسائل تقریباً اسی کے کھڑے کئے ہوئے تھے۔

زارا اپنے رشتہ داروں کو ریسیو کرنے کے لئے اٹھی تو شفق نے اس کی اچھی خاصی برین واشنگ کر ڈالی۔

''جو کچھ بھی ہوا اسے بھول جاؤ صبیرہ! مانا کہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے لیکن ڈیئر! انسان کو ہمیشہ موقع کی مناسبت سے رویہ اپنانا چاہئے۔ جو ہو چکا اس کا مداوا اسی صورت ہو سکتا ہے کہ اب ہم بہت اچھے طریقے سے ان تمام فنکشنز میں شرکت کریں اور آنٹی کی ہیلپ کر کے انہیں بہترین طور پر پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔ ان کی کچھ پریشانیاں تو کم ہوں اور اس کے لئے تمہیں افسردگی اور پچھتاوے کے اس خول سے باہر نکلنا ہوگا جسے تم خواہ مخواہ اپنے چہرے پر سجائے پھر رہی ہو۔ دنیا میں یہ پہلا دھوکا نہیں ہے جو کسی دوست نے اپنے دوست کو دیا ہے۔ البتہ زارا اور ثوبان کی یہ پہلی اور آخری شادی ہے سو پلیز، سب کچھ بھول کر کھلے دل اور فریش ذہن کے ساتھ اسے انجوائے کرو۔ اس یقین کے ساتھ کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔''

اور یہ سب تو وہ بھی سوچ رہی تھی۔

یہ ٹھیک ہے کہ دل کا درد حد سے سوا ہو رہا تھا مگر اس قدر خوشی کے موقع پر چہرے پر غم زدہ و افسردہ سے تاثرات سجانا قطعی نا اندیشی تھی۔

اور ایڈی، وہ اپنے احساسات سے پیچھا چھڑانا چاہ رہی تھی جو زارا کے انکشاف کے بعد بہت عجیب سے انداز میں اس کے دل و دماغ میں پیدا ہوئے تھے اور جن کی ماہیت تا حال وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی اور اسے ان تمام الجھنوں سے جان چھڑانے کا سب سے بہترین طریقہ یہی سجھائی دیا کہ وہ اپنی تمام تر توجہ شام کو ہونے والے مہندی کے فنکشن کی طرف لگا دیتی۔ مگر سوچ کی حساسیت اور دھیان کے دھاگے بار بار ایڈی کے خیال سے جا الجھتے جو یقیناً اسی کے لئے شہباز گردیزی کے گروپ سے جا بھڑا تھا۔ اور ابھی تک صبیرہ اپنے اندر ہمت مجتمع نہیں کر پائی تھی کہ جا کر اس کی عیادت ہی کر لیتی۔ ورنہ رات گئے جب اسے ہاسپٹل سے لایا گیا تو سبھی اس کے گرد جمع تھے اور حسب توفیق ہمدردی، مشوروں اور ڈانٹ سے نواز رہے تھے۔ ایک صبیرہ علی ہی سب سے چھپ کر اپنے کمرے میں بیٹھی روتی رہی۔ اپنی بے وقوفیوں بھری جذباتیت پر۔

کس قدر برا سلوک روا رکھتی تھی اس سے۔ حقارت بھری تلخ باتیں اور اس قدر نارواسلوک برداشت کرنے کے بعد بھی وہ کبھی اس سے غافل نہیں رہا تھا۔ ہر موقع پر اس کی مدد کرنے کو بے جھجک آگے بڑھا تھا، اس کی تلخ نوائی کے باوجود اسے سمجھانے کی مقدور بھر کوشش کرتا رہا تھا اور وہ یہی سمجھتی رہی کہ ایڈی اسے اپنی چکنی چپڑی باتوں میں پھانسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ برہمی کی آنچ میں سلگتی دو سیاہ آنکھیں اس کے ذہن میں در آئیں۔

''بنی تو کبھی میری تمہارے ساتھ بھی نہیں تھی صبیرہ علی! پھر میں کیوں تمہارے پیچھے خوار ہوتا پھر رہا ہوں، کبھی اس پر بھی غور کیا ہے تم نے؟'' بے بسی کی نڈھال سی کیفیت نے اسے اپنی گرفت میں کچھ اس طرح سے جکڑا کہ اس کی پژمردگی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

شام ہوتے ہی جیسے زندگی خوشیوں بھرے ہنگاموں میں گھر گئی۔ فنکشن میں شرکت کی تیاریوں، شوخیوں اور شرارتوں نے زندگی کو ایک بہت خوب صورت سے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔

''تم دونوں میرے قریب سے بالکل نہیں ہلنا اور سنو، خبردار جو کسی نے مجھے گلاب جامن کے علاوہ کوئی اور مٹھائی کھلانے کی کوشش بھی کی تو۔'' زارا مسلسل ہدایات نشر کر رہی تھی۔

''اور وہ جو تمہاری پھپھو تمہیں اپنی ''کترنی'' بند رکھنے کی سخت ہدایات کر کے گئی ہیں وہ شاید تمہیں یاد نہیں۔'' اس کی کزن شائلہ نے یاددہانی کرائی تو وہ سب ہنسنے لگیں۔

''کیا ہے یار! میں پہلے ہی اتنی نروس ہو رہی ہوں، پہلی دفعہ شادی ہو رہی ہے نا اس لئے۔'' وہ واقعی بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔

اس کی کلائی میں پیلی اور سبز چوڑیاں چڑھاتی صبیرہ کو اس کی بات پر ہنسی آ گئی۔

''یہ بات تم نہ بھی بتاؤ تو تمہاری ہوائیاں اُڑتی شکل دیکھ کر سب کو معلوم ہو رہی ہے۔''

چنری کے باریک گوٹے سے سجے پیلے اور سرخ امتزاج کے لباس میں ملبوس صبیرہ کی دلکشی کو اس کی سادگی بھی ماند کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس وقت اس کی ہنسی زارا کو بہت اچھی لگی۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو صبی! کہیں کسی کی نظر ہی نہ لگ جائے۔'' زارا نے بے ساختہ شرارت سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''مجھے کسی کی نظر نہیں لگتی۔''

''تو پھر یقیناً کسی اچھی نظر والے بندے نے آپ کو اپنی نظر میں رکھا ہوگا۔ ورنہ اب تک کسی کی نظر لگ چکی ہوتی۔'' زارا کی کزن اس قدر بے ساختگی سے بولی کہ زارا سے اپنی ہنسی دبانا مشکل ہو گیا۔ نادانستگی ہی میں وہ ایک دبی ہوئی حقیقت تک پہنچنے کی سعی کر گئی تھی۔

صبیرہ خفت و خجالت کا شکار ہونے لگی تو فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مجھ سے یہ گجرے وغیرہ نہیں پہنے جاتے۔ ان کے دھاگے اُلجھے ہوئے ہیں۔'' اس کی بات پلٹنے کی کوشش نے زارا اور شفق دونوں ہی کو محظوظ کیا تھا۔

''تو سیکھو نا۔ یہ نازک معاملات بڑی احتیاط سے سلجھانے والے ہوتے ہیں، جلد بازی یا بے زاری نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔'' مسکراہٹ دباتے ہوئے شفق گجرے کا دھاگہ سلجھا رہی تھی۔ صبیرہ بے بسی سے اسے دیکھنے لگی۔ اپنی بے وقوفیوں کا جو بھگتان وہ بھگت چکی تھی اس سے زیادہ اب اور کیا ہو سکتا تھا۔

رات جانے کتنی دیر تک وہ شکرانے کے نوافل ادا کرتی رہی تھی۔ بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہ تا دیر خدا کے حضور سربسجود رہی تھی، جس نے اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کی تھی۔

✡ …… ✡

''میں ذرا باہر دیکھ کے آتی ہوں، سب ریڈی ہے یا نہیں۔ آنٹی کتنی ہی دفعہ ہمیں نکلنے کا کہہ چکی ہیں۔''

اپنے اندر کی گھٹن سے گھبرا کر وہ کمرے سے بہانہ بنا کر باہر نکل آئی۔ سب لوگ اپنی اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دینے میں مصروف تھے۔ باہر لان میں مردوں کو خوش گپیوں میں مصروف دیکھ کر وہ پلٹ آئی۔ ابھی ''میرج ہال'' پہنچنے میں کافی ٹائم تھا اسی لئے تو سب اتنے اطمینان سے بیٹھے تھے۔ وہ کھلی ہوا میں سانس لینے ٹیرس پر آ گئی۔ تنہائی پا کر دل کچھ اس قدر بے اختیار ہوا کہ اندر کی گھٹن آنسوؤں کے سنگ باہر نکلنے لگی۔

جو کچھ اس کے ساتھ ہونے جا رہا تھا وہ اس قدر لرزا دینے والا تھا کہ وہ اب تک خود کو سنبھال نہیں پا رہی تھی۔ دل کو مسلسل کوئی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھا، اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بھری دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی ہو۔ اسی شدید احساس کے زیر اثر اس نے صبح فون پر امی سے کتنی ہی دیر بات کی تو آنسو روک روک کر اس کا حلق دکھنے لگا تھا۔ مگر اکیلے پن کے ان لمحوں میں اس نے ان جلتے سلگتے آنسوؤں کو بہہ جانے دیا جو اندر ہی اندر بہتے اس کے دل و دماغ میں گھٹن اور خوف کا سیلاب پیدا کر رہے تھے۔

نادیدہ خوف نے اسے بے حد کمزور بنا دیا تھا ورنہ صبیرہ علی ہمیشہ سے دل کی مانتی آئی تھی۔ دماغ کو اس نے کبھی زیادہ اہمیت دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور ہر بار دل کی ماننے والے اکثر نقصان اٹھاتے ہیں۔ دل کی اس قدر ماننے کا مطلب ہے اسے سر پر چڑھانا۔ اسی لئے تو دل کو ضدی بچے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بچے بھی جب سر چڑھ جائیں تو اپنی ضد پر اڑ جانے کی عادت اپنا لیتے ہیں۔ بنا تجربے کے کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ کچھ یہی حال دل کی ہر بات ماننے والوں کا بھی ہوتا ہے۔

اور انہی میں سے ایک صبیرہ علی تھی۔

انتہا درجے کی جذباتی، ایک لائن پر سوچنا تو پھر اس پر سوچتے رہنا۔ اپنی اسی عادت کی بنا پر آج وہ ان حالوں کو پہنچ گئی تھی۔

اس نے دوپٹے سے رگڑ کر چہرہ خشک کیا مگر آنسوؤں کا کیا علاج کرتی جو عزتِ نفس کے مجروح ہونے کے شدید احساس کے زیر اثر بہتے چلے جا رہے تھے وہ اس وقت حساسیت کے انتہائی درجے پر تھی۔

خدا بہت مہربان ہے، جبار و قہار بھی ہے۔ مگر اس کے جبر و قہر پر اس کی رحمانیت حاوی ہے۔

بے شک عزت اور ذلت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ اکبر۔

'اور ایڈی میری ہیلپ نہ کرتا اور میری فضول باتوں کو انا کا مسئلہ بنا کر پیچھے ہٹ جاتا تو؟'

اس کے وجود پر لرزہ طاری ہونے لگا۔

''میں تم جیسے لڑکوں کے ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ مگر میں ان لڑکیوں میں سے قطعی نہیں ہوں جن سے ابھی تک تمہارا کوئی واسطہ پڑتا رہا ہے۔ تمہاری نظر کے اشاروں پر چلنے والی، تمہاری ہر بات کو حرفِ آخر مان کر تمہارے قدموں پر قدم رکھتی ہوئی۔''

اس نے تھک کر گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔

''تو کیا غلط کہتا تھا وہ، کیا رکھا ہے اس مردوں کے معاشرے میں تنہا عورت کے لئے۔ کوئی حصہ تو کیا عزت و احترام کی ایک نگاہ تک نہیں ہے۔ اور وہ بے وقوف، عورتوں کو حقوق دلانے کی بے وقوفانہ سوچ میں مبتلا بھولی رہی کہ میں بھی تو ایک عورت ہی ہوں۔ خود میں چاہے کتنی ہی مضبوط اور نڈر کیوں نہ ہوں مگر معاشرے کے لوگوں کی نظر میں تو گھر سے نکلی ہوئی تنہا، آزاد عورت ہی ہوں نا۔ کمزور ترین مخلوق۔ جسے شکست دینا مردوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، چاہے وہ کیسی ہی جنگ کیوں نہ ہو۔''

وہ مکمل طور پر شکست خوردہ تھی۔ گزشتہ دن، اس کی شخصیت کی تمام مضبوطی سبوتاژ کر گیا تھا۔

اُسے اچھی طرح تجربہ ہوگیا تھا کہ عورت چاہے خود کو گھر سے جتنا بھی مضبوط کر کے اپنی بہترین صلاحیتوں کو پالش کر کے کیوں نہ نکلے، مقام اسے وہی ملتا ہے جو اسے معاشرہ دیتا ہے۔ مردوں کی اجارہ داری کے اس معاشرے میں جو مرد اپنی ''خواتین'' کے حقوق بحال نہیں کر سکتے، وہ بھلا ایک ''عورت'' کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں جو خواتین کے حقوق کی بحالی کے نعرے لگاتی پھرتی ہے۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا صبیرہ علی! کہ تمہارا ہر کام دوسرے سے الگ کیوں ہوتا ہے؟''

اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ وہ سامنے ٹیرس کے پلر کے ساتھ ٹیک لگائے بے حد پُرسکون انداز میں کھڑا تھا۔

چہرے کو تیزی سے ہتھیلیوں سے رگڑ کر اس نے اپنی شکست کے تمام نشانات غائب کرنا چاہے مگر اس لمحے وہ اس قدر شدید آزردگی اور ندامت کے سمندر میں غرق تھی کہ خود کو سنبھالنا ایک دقت طلب مرحلہ ثابت ہونے لگا۔

''سب لوگ گاڑیوں میں بیٹھ چکے ہیں۔ زارا اور شفق تمہارے لئے پریشان ہو رہی ہیں، اب اٹھ جاؤ۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہا تھا۔ لاپروائی اور ذمہ داری کا مخصوص امتزاج۔

وہ سنبھلتے سنبھلتے ایک دم سے رو دی۔

وہ چند ثانیوں تک سنجیدگی سے اسے دیکھتا رہا، پھر بہت معتدل سے لہجے میں بولا۔

''میرا نہیں خیال کہ اب تمہارے رونے کی کوئی وجہ بنتی ہے۔ جو بے وقوفی تم کرنے والی تھیں، وہ تم نے نہیں کی۔ اب تم محفوظ ہو۔ ناؤ اسٹینڈ اپ، سب لوگ ویٹ کر رہے ہیں نیچے۔'' وہ کہنے کے ساتھ ہی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بعجلت اس کے پیچھے بڑھی۔

''ایڈی ......'' عجلت آمیز پکار پر وہ بے ساختہ ہی ایڑیوں کے بل اس کی طرف گھوما تھا۔ آنسوؤں سے دُھلا چہرہ اور بھیگی سرخ آنکھیں لئے وہ سراپا شکست دکھائی دے رہی تھی۔ ہاتھوں کی انگلیوں کو مروڑتی وہ یقیناً اس وقت اپنی زندگی کے مشکل ترین مرحلے سے گزر رہی تھی۔

اپنی شکست تسلیم کرنا، اپنی ہار ماننا۔

اس سے کڑا لمحہ کیا کبھی کسی انسان کی زندگی میں اور ہو سکتا ہے؟ وہ بھی اس انسان کے لئے جس نے ہمیشہ خود کو بہت مضبوط اور پُراعتماد بنا رکھا ہو۔

یہ بھی اس وقت انہی لمحات کے شکنجے میں کسی ایک ایسے شخص کے سامنے کھڑی تھی جس کے سامنے کوئی بھی کمزوری دکھانا وہ اپنی توہین سمجھتی تھی۔ ایک وہ وقت تھا جب اس شخص کے سامنے رونا اسے ذلت لگتا تھا اور آج وہ اس کے سامنے سراپا آنسو بنی کھڑی تھی۔

''تمہارے بازو کا زخم اب کیسا ہے؟''

اس کی حالت نے ایڈی کو کافی متاثر کیا تھا۔

''اگر تم اس بات کے لئے رو رہی تھیں تو یقین کرو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بالکل فٹ۔ بلکہ آج فنکشن میں ایک شاندار سا بھنگڑا ابھی پیش کرنے کا ارادہ ہے۔'' وہ رسان بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''آئی ایم سوری ایڈی! میری وجہ سے یہ سب ......''

''اب سب ٹھیک ہو چکا ہے صبیرہ! پچھلی غلطیوں کو دہرا کر بار بار خود کو اذیت دینے سے بہتر دانش مندی یہ ہے کہ اپنے آنے والے وقت کو بہترین اور اچھا بنانے کی پلاننگ کی جائے۔ میں جانتا ہوں کہ اس تجربے نے تمہیں بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ تمہیں اپنی کوتاہیوں کا احساس بھی ہو گیا ہے مگر میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم خود کو کسی کے سامنے ڈی گریڈ کرو۔ چاہے وہ میں ہی کیوں نہ ہوں۔ یو فیل سوری، او کے فائن۔ لیکن اسے اشتہار مت بناؤ، بس اس تجربے کی روشنی میں اپنی آئندہ زندگی اور تعلقات کو بیلنس کرو، تب ہر کوئی جان جائے گا کہ تم بدل چکی ہو۔ تب تمہیں کسی سے ایکسکیوز کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ میرے نزدیک معذرت کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ اپنی غلطی کا مداوا اپنے رویے سے کر دیا جائے، بجائے کسی کے آگے ہاتھ جوڑنے کے۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

صبیرہ کو لگا جیسے اس کے تمام زخموں پر کسی کی مسیحائی نے جادو اثر کر دیا ہو۔ اس کی عزتِ نفس کا تنفس پھر سے بحال ہونے لگا تھا۔ اس کے کھوئے ہوئے اعتماد نے پھر سے اسے سہارا دینے کو ہاتھ بڑھا دیا تھا۔

''اور ہاں، نیچے آنے سے پہلے منہ ضرور دھو لینا۔ کہیں سب سمجھیں کہ میں تمہاری پٹائی کر کے لایا ہوں۔'' وہ جاتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔

وہ جہاں کی تہاں کھڑی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ معذرت کے سینکڑوں الفاظ دل کی پٹاری میں بند سر پٹختے رہ گئے مگر وہ اس فراخ دلی سے معذرت کا باب بند کر گیا تھا کہ وہ بولنے کا سوچتی ہی رہ گئی تھی۔

☆......☆

لاکھ بار چاہے وقار علی نے اس سے معذرت کی ہو، پیار اور ملامت سے سمجھایا ہو مگر تابندہ کے دل میں اس کی طرف سے گرہ آ گئی تھی۔

''بے جی بڑی ہیں تابی! قابل عزت، قابل تکریم۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری ماں ہیں۔ تم پر تو ان کی عزت کرنا ہر حال میں واجب ہے۔ اگر وہ کچھ سخت سست کہہ بھی دیتی ہیں تو ماں سمجھ کر نظر انداز کر دیا کرو۔ پتہ ہے انہیں پلٹ کر جواب سننے کی عادت نہیں ہے اور تمہیں تو ان کی نظروں میں اپنا مقام بنانا ہے ابھی۔''

شوریدگی کی لہر اس کے تن من کو بھگو گئی تھی۔

''کیوں؟ میں تابندہ وقار علی، آپ کی منکوحہ اس حویلی کی سب سے چھوٹی بہو، کیا ابھی بھی میرا کوئی مقام نہیں ہے ان کی نظروں میں؟''

''وہ تو صحیح ہے، مگر ان کی مرضی کے خلاف ان کی بہو بن کر آئی ہو، ظاہری بات ہے انکے دل میں اس بات کا غصہ تو ہوگا۔''

وہ مصالحانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ کچھ ڈاکٹر کی ہدایت کا بھی اثر تھا، اس نے تابندہ کو ٹینشن فری ماحول میں رکھنے کو کہا تھا۔

''ان کی نہ سہی، ان کے بیٹے کی مرضی اور پسند تو ہوں نا۔ کیا وہ اس ناتے سے بھی مجھے کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں ہیں؟ کیا ضروری ہے کہ میں اپنی خودداری اور عزتِ نفس کی قربانی دوں؟ بلاوجہ کی تُو تکار اور الزام تراشیاں برداشت کروں؟''

''تابندہ پلیز!'' اس کا دل اچاٹ ہونے لگا تھا۔ بے زار کن انداز میں اسے ٹوک گیا۔

''یہ سب تو پہلے سے طے تھا۔ ساس بہو کی چپقلش تو ہمارے گھرانوں میں ایک روایتی سی بات ہے۔ اور خاص طور پر جس طرح سے ہماری شادی ہوئی ہے، اس کے مطابق تو تمہیں خود کو ان حالات کے لئے تیار رکھنا چاہئے تھا۔''

''آپ ہی سب کو بتا دیتے کہ یہ لڑکی میری خاطر سب کچھ ٹھکرا کر آ رہی ہے۔ عزت دلوانا شوہر کا کام ہوتا ہے وقار!'' وہ تلخی سے گویا ہوئی تو وہ آرام سے بولا۔

''مائنڈ مت کرنا۔ میں عام بات کر رہا ہوں کہ اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کرنے والی لڑکیوں کو سسرال میں اپنا مقام بنانے کے لئے زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے جن کی خیر خبر لینے کے لئے پیچھے کوئی بھی نہ ہو، باپ نہ بھائی۔''

تابندہ بے حد بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

کس قدر دل دُکھانے والی بات کی تھی اس نے۔ عام مگر ذلت آمیز۔ یہ اس کے دل میں لگنے والی دوسری گرہ تھی۔

''خوش رہا کرو تابندہ! ہنسا بولا کرو۔ پتہ ہے ماں کے موڈ کا ہونے والے بچے پر بہت اثر پڑتا ہے۔''

☆......☆

صدیقہ بھابی صحیح معنوں میں اس کی دوست ثابت ہوئی تھیں۔ دامے، درمے، سخنے انہوں نے کبھی بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ بے جی کی سرد مہری ہڈیوں میں اترنے لگتی تو وہ صدیقہ بھابی کی پناہ میں چلی آتی۔ کبھی جوفوزیہ کا تپا ہوا مزاج سلگنے لگتا تو ان کی ٹھنڈی میٹھی باتیں اسے بہت راحت اور اپنے پن کا احساس دلاتیں۔

''ایسے موقعوں پر لڑکی کی ماں یا بہن ہی صحیح معنوں میں تقویت کا باعث ہوتی ہے بھابی! اور مجھ سا بدقسمت تو کوئی بھی نہیں ہوگا جس نے اپنی بے وقوفی بھری جذباتیت کے ہاتھوں خود ان آفاقی رشتوں کو کھو دیا۔''

اندر کی گھٹن کبھی کبھار بڑھ جاتی تو وہ رو پڑتی تھی۔

''میں ہوں نا تابندہ! تمہاری بھابی، تمہاری ماں، بہن اور سب کچھ۔'' وہ اس کے لئے سراپا ماں بن جاتیں۔

ان دنوں وہ وقار علی سے بے حد لاپرواہ ہو رہی تھی۔

اور اس بات کو خود وقار علی نے بھی شدت سے محسوس کیا تھا۔

''کیا بات ہے تابی! اتنی بیزار کیوں رہنے لگی ہو؟ بجھی بجھی سی، خفا خفا سی؟'' رات سونے سے پہلے اسے اپنی بانہوں کی دھیمی آنچ دیتے حصار میں لئے وہ ریشم لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''کچھ بھی نہیں، کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ معتدل سے لہجے میں بولی تو وقار علی بے قرار ہونے لگا۔

''کیوں نہیں ہے؟ ابھی تو ہماری شادی کو چند ماہ ہوئے ہیں اور ہمارے درمیان ہونے کو کوئی بات نہیں رہ گئی۔''

''میں آپ سے محبت کرتی تھی اس لئے ایک دنیا کو ٹھکرا کر اس گھر میں چلی آئی۔ آپ کو مجھ سے محبت تھی، تبھی اپنے گھر والوں سے ٹکرا کر مجھے اپنا لیا۔ اب اور کیا بات ہونے سے رہ گئی ہے؟''

اس کے تھکن زدہ لہجے نے وقار علی کو دھچکا پہنچایا تھا۔

''یہ تو شروعات ہے تابی! ہماری زندگی کی بنیاد۔ ابھی تو بہت سے سنہرے پل، سہانی چاندنی راتیں، بہت سی ان کہی باتیں، حکایاتِ دل، سب کچھ تو باقی ہے۔''

''مجھے صرف سر اٹھا کر جینے کا اعتماد چاہئے وقار!'' اس کی آواز میں بھیگا پن اتر آیا تو وقار علی نے اسے ریشم کے ڈھیر کی مانند سمیٹ لیا۔

''سب کچھ، میری جان سب کچھ تمہارے لئے ہے۔''

اس کی محبت کی شوریدہ سری نے تابندہ کو پُرسکون کر دیا تھا۔

وقار علی کی توجہ اور محبت اسے نئی طاقت دے گئی تھی۔ اس کا مرجھایا ہوا روپ پھر سے پھول کی مانند کھل اٹھا تھا۔

محبت تو یوں بھی مُردہ دلوں میں زندگی پھونکنے والا ٹانک ہے۔ وقتی طور پر تابندہ بھی سنبھل گئی تھی مگر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وقار علی کی باتیں اس کے دل کو دھچکا گئی تھیں۔

''اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کرنے والی لڑکیوں کو سسرال میں اپنا مقام بنانے کے لئے زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے جن کی خیر خبر لینے کے لئے پیچھے کوئی نہ ہو۔ نہ باپ نہ بھائی۔''

ہر وقت اب ایک عجیب سا پچھتاوا اسے اپنی گرفت میں لئے رہنے لگا تھا۔ وقار علی یہاں نہیں ہوتا تو وہ سارا سارا دن کچن میں یا پھر صدیقہ بھابی کے پاس گزار دیتی۔

اور پھر ان دنوں جب وہ اپنی ذہنی اور جسمانی دونوں حالتوں سے سخت بیزار ہو چکی تھی، انتہائی غیر متوقع طور پر احسن ملک اس سے ملنے چلا آیا۔

پہلے تو وہ اسے دیکھ کر ششدر ہی رہ گئی۔

وہ تو اپنے میکے کا سارا سامان بھول چکی تھی۔ مگر تپتی دھوپ میں مہربان ہواؤں نے یہ کون سا در کھولا تھا کہ یکلخت ہی وہ مُشک بُو ہو اٹھی تھی۔ اس وقت بے جی دالان میں بیٹھی کام والیوں سے گندم صاف کروا رہی تھیں، پاس ہی فوزیہ اور صدیقہ بھابی میگزین میں شائع ہونے والے سوٹ کے ایک ڈیزائن پر بحث و تمحیص میں مصروف تھیں۔ تابندہ یونہی ان سب سے لاتعلق پیر پھیلائے کرسی پر نیم دراز کیفیت میں بیٹھی تھی۔ احسن کو دروازے میں دیکھ کر لحظہ بھر کو ساکت ہوئی اور پھر بے اختیار اٹھ کر بھاگتی ہوئی اس کے شانے سے جا لگی۔

آنسوؤں نے حلق میں پھندا سا لگا دیا تھا۔ احسن کو سب کی موجودگی میں اس کی یہ بے اختیاری بہت محسوس ہوئی تو ہاتھوں میں تھامے شاپنگ بیگز نیچے رکھ کر اسے شانوں سے تھام کر اپنے سامنے کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''کیسی ہو......؟ بھئی تم دونوں میاں بیوی تو جیسے ادھر کا راستہ ہی بھول گئے ہو۔ میں نے سوچا کہ میں ہی چکر لگا لوں، دیکھوں تو سہی کن محبتوں نے تمہیں باندھ رکھا ہے۔''

صدیقہ بھابی سر پر سلیقے سے دوپٹہ اوڑھتی مہمان کی خاطر داری کو اٹھی تھیں جب کہ فوزیہ ہونٹ پُرسوچ انداز میں سکیڑے احسن کو جھک کر بے جی سے سر پر پیار لیتے دیکھ رہی تھی۔

وہ اسے ساتھ لئے ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

''امی کیسی ہیں احسن؟ رخشی کا کیا حال ہے؟ تم ان لوگوں کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟'' وہ بھرائے ہوئے لہجے میں پوچھ رہی تھی اور اسے یوں مہینوں بعد سامنے پا کر خود احسن عجیب سی سوگوار کیفیت کی زد میں تھا۔ سامنے بیٹھی اپنی مگر حد سے زیادہ پرائی۔

''وہ دونوں بالکل ٹھیک ہیں، بلکہ رخشی نے تو تمہارے لئے گفٹس بھی بھجوائے ہیں۔''

وہ اس کے زخموں کو جانتا تھا اس لئے بڑی کامیابی سے ان پر پھائے رکھنے کی سعی میں مصروف تھا۔

''اور امی نے؟''

اس کی آنکھوں میں امید و یاس کے ہزاروں دیئے جگمگا اٹھے تھے۔ احسن نظریں چرا گیا۔

''تم یہ بتاؤ کہ وقار علی کیسا ہے؟ مجھے تو اس کا آفس معلوم نہیں مگر اسے تو ہمارا ایڈریس پتہ ہے، پھر بھی کبھی اس نے چکر نہیں لگایا۔''

''وہ بالکل ٹھیک ہیں، بس مصروفیت کی وجہ سے کہیں نہیں جاتے اور ویک اینڈ پر ادھر آجاتے ہیں۔'' وہ دوپٹے سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے پھیکے سے انداز میں مسکرائی تو احسن نے بغور اسے دیکھا۔

''تم خوش تو ہو نا تابندہ؟''

جانے اس کے ذہن میں کیسا خدشہ کلبلایا تھا۔

''میں کیسے خوش رہوں احسن؟ امی کی ناراضگی میری اس خوشی کو مکمل نہیں ہونے دیتی۔ ابو مجھ سے خفا، مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ انہوں نے تو مجھے معافی مانگنے کا موقع بھی نہیں دیا، ساری زندگی کی کسک اور ملامت میرے لئے چھوڑ گئے۔''

سیاہ آنکھوں کے نگینے پانیوں میں گھرنے لگے۔ احسن نے اس کی بے بسی و بیچارگی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے اپنے لہجے کو مضبوط بنا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

''غلطی ہر انسان سے ہوتی ہے تابندہ! اور ان غلطیوں سے تجربہ حاصل کر کے زندگی کو بہتر تو بنایا جا سکتا ہے۔ مگر ساری عمر ان غلطیوں پر سر پکڑ کر رونا دانش مندی نہیں ہے۔''

''مگر بعض نقصانات ایسے بھی ہوتے ہیں احسن! جن پر تمام عمر بھی سر پر ہاتھ رکھ کر رویا جائے تو بھی ان کی تلافی ممکن نہیں ہوتی۔''

آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر ہاتھوں پر گر رہے تھے۔

صدیقہ بھابی چائے اور دیگر لوازمات لے کر آئیں تو ماحول بہت سوگوار ہو رہا تھا۔

''بھئی یہ تو بہت غلط بات ہے تابندہ! اتنے دنوں کے بعد ملنے پر تو خوشی حد سے سوا ہوتی ہے اور تم رو رو کر دریا بہا رہی ہو۔''

وہ تابندہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ چکی تھیں۔ احسن بہت سنجیدہ سا بیٹھا تھا۔

''میں تو اس لڑکی کو سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں۔ گزری باتوں کو اتنی شدت سے سوچیں تو آئندہ زندگی دشوار ہو جاتی ہے مگر یہ اس بات کو سمجھنے کو تیار نہیں۔'' انہوں نے شکایتی انداز میں کہا تو احسن ان کے لب و لہجے سے جھلکتی محبت کو محسوس کرتے ہوئے متاثر کن لہجے میں بولا۔

''آپ اس کو سمجھاتی رہئے گا۔ یقیناً یہ آپ کی بات سمجھ جائے گی۔''

تھوڑی دیر کی بات چیت کے بعد صدیقہ بھابی اٹھ گئیں۔

''میں ذرا کھانے کا انتظام دیکھ لوں۔''

''ارے، آپ یہ انتظام میری خاطر دیکھنے لگی ہیں تو پلیز زحمت مت کریں۔ میں اتنی دیر نہیں رکوں گا۔'' احسن نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا تو وہ اپنائیت بھرے رعب سے بولیں۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ اتنے دنوں کے بعد آئے ہیں اور یونہی آپ کی خاطر مدارت کئے بغیر جانے دیں، یہ اس حویلی کی روایت نہیں۔ اور یوں بھی تابندہ کے میکے سے کوئی پہلی بار یہاں آیا ہے۔''

''اس کی تو عادت ہے بھابی تکلف برتنے کی۔'' تابندہ نے یاسیت سے مسکرا کر کہا تو وہ بے اختیار بولا۔

''اور تمہاری غیریت برتنے کی۔''

خاموشی کا وقفہ بہت بے ساختہ تھا۔ صدیقہ بھابی نے ہی مسکراتے ہوئے اس مجرمانہ سکوت کی چادر کو توڑا۔

''تو بس پھر ٹھیک ہے، آپ لوگ اطمینان سے باتیں کریں اور آپ بھی فکر مت کریں۔ میں زیادہ دیر بالکل نہیں لگاؤں گی۔'' انہوں نے جاتے جاتے احسن کو تسلی دی تھی۔

''بہت اچھی طبیعت ہے ان کی۔'' ان کے جانے کے بعد احسن نے توصیفی انداز میں کہا تو تابندہ نے بھی اس کی تائید کی۔

''واقعی، سادہ اور بے ریا طبیعت رکھتی ہیں بھابی۔ میری سب سے زیادہ دوستی انہی سے ہے۔ امی نے میرے بارے میں کیا کہا ہے احسن، کیا وہ اب بھی مجھے ان لوگوں سے ملنے کی اجازت نہیں دیں گی؟''

جو کانٹا دل میں گڑا تھا، اس کی تکلیف برداشت سے باہر تھی۔ بہت پُرامید لہجے میں اس نے پوچھا تو وہ اس سے نظریں چرا گیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اور رخشی کوشش کر رہے ہیں انہیں سمجھانے کی۔ اس وقت وہ صدمے کی گرفت میں ہیں ورنہ ماؤں کے دل تو بہت نرم ہوتے ہیں، بچوں کی کوتاہیاں بہت جلد بھول جاتی ہیں۔'' اس کا لہجہ جتنا بھی آس بندھانے والا کیوں نہیں تھا مگر اس کا یوں نگاہیں چرا کر بولنا تابندہ کے دل کو مٹھی میں لے گیا۔

''تم کب شادی کر رہے ہو؟''

بہت وقتوں کے بعد خود کو سنبھال کر اس نے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلائی تھی۔

''بس کر لوں گا۔'' قدرے توقف کے بعد وہ بولا تو اس کے چہرے پر پھیلنے والی تاریکی تابندہ سے مخفی نہیں رہی تھی۔

ندامت کا احساس اندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تو وہ بے بسی سے چور لہجے میں بولی۔

''دیر مت کرو احسن! رخشی سے شادی کر لو۔ ہو سکتا ہے تبھی امی کا دل میری طرف پلٹ آئے۔''

''ہوں......'' وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا، مبہم سے لہجے میں بولا تو اس نے پوچھا۔

''خالہ کیسی ہیں؟''

''بالکل ٹھیک۔'' وہ چونکا تھا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم چیک تو کرو۔ رخشی کے علاوہ امی نے بھی تمہارے لئے کچھ چیزیں بھجوائی ہیں۔''

اس کی بات رکھنے کی خاطر وہ اٹھ کر شاپنگ بیگز ٹٹولنے لگی۔ رخشی نے اس کے اور وتار علی کے لئے تین تین سوٹ پیس بھجوائے تھے اور قیمتی پرفیومز، خالہ جان نے بھی ان دونوں کے کپڑے بھجوائے تھے۔ وہ نفیس سا مخملیں کیس کھول کر بے ساختہ احسن کی طرف دیکھنے لگی۔ یہ واحد چیز تھی جس پر کسی کے بھی نام کی پرچی نہیں لگی تھی۔ گولڈ کا خوب صورت سا بریسلیٹ۔ چین کے ساتھ لٹکتے ننھے ننھے سے دل بہت نفیس لگ رہے تھے۔

''یہ میری طرف سے تمہارے لئے۔'' وہ ہلکا سا مسکرا کر بولا۔ اس کی آنکھوں کی بجھتی کیفیت تابندہ کو بہت شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

''اتنا مہنگا گفٹ۔'' وہ متذبذب ہوئی مگر وہ اس کے پس و پیش کو درخور اعتنا جانے بغیر سرسری انداز میں بولا۔

''چلو اب یہ سب کچھ سمیٹ لو۔''

'میری کوتاہیوں کو تم کتنی فراخ دلی سے سمیٹ لیتے ہو احسن ملک۔'

اس کا دل بے بسی سے پھڑ پھڑا کر رہ گیا تھا۔

سب چیزیں سمیٹ کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی اور جلدی جلدی اپنے سوٹ کیس کھول کر امی، خالہ جان اور رخشی کے لئے سوٹ نکال کر شاپنگ بیگ میں ڈالے اور ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ مون کو احسن کی گود میں براجمان بے تکلفی سے گفت و شنید کرتے پا کر وہ مسکرا دی تھی۔

''بھئی بہت ذہین بچہ ہے۔'' احسن نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر محظوظ ہونے والے انداز میں اس کی کہی باتیں دہرانے لگا۔

''نام عدیم نواز ہے، عمر اڑھائی سال ہے، اگلے سال اسکولنگ بھی شروع ہو جائے گی۔ اس کو کارٹونز بہت پسند ہیں، اپنی امی زیادہ اچھی لگتی ہیں ابو کی نسبت۔ اور تابی چچی اسے بہت پیار کرتی ہیں۔''

''یہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار اور ذہین بچہ ہے احسن!'' تابندہ نے اسے خوشگوار انداز میں بتایا تھا۔ ''عموماً اس عمر میں بچے کی زبان اتنی صاف اور رواں نہیں ہوتی مگر یہ صاحب فر فر ہر سوال کا بے تکلفی سے جواب دیئے چلے جاتے ہیں۔ ابھی تو انہوں نے آپ کو یہ راز کی بات نہیں بتائی کہ ان کی شکل چونکہ چاند سے ملتی ہے اس لئے سب ان کو مون کہتے ہیں۔''

''ارے واہ.....'' احسن بھی محظوظ ہوا تھا۔

تابندہ اسے یونہی عدیم کی چھوٹی چھوٹی دلچسپ باتیں بتانے لگی۔ اسے کبھی بھی چھوٹے بچوں سے اتنی دلچسپی نہیں رہی تھی مگر ایک تو عدیم تھا ہی اتنا پیارا، اوپر سے باتیں بھی اتنی دلچسپ کرتا تھا کہ وہ اس کی گرویدہ ہو گئی تھی۔ دوسری سب سے بڑی وجہ شاید اب خود تابندہ کا تخلیق کے عمل سے گزرنا تھا، جس کی وجہ سے وہ عدیم کی ہر ادا، ہر حرکت کو انجوائے کرتی تھی اور اس کی محبت ہی کی وجہ سے عدیم بھی اس کا دیوانہ تھا۔ اسے بھی اپنی ''تابی چچی'' سے بہت محبت تھی۔ سب اس کے تابندہ کو ''تابی چچی'' کہنے پر بہت محظوظ ہوتے تھے۔ مگر تابندہ کو اس کا انداز تخاطب دل لوٹ لینے والا لگتا تھا۔

کھانے کی میز پر بے جی موجود نہیں تھیں۔ اعزاز اور بھایا کا کھانا یوں بھی زمینوں پر بھجوایا جاتا تھا، جہاں عموماً مہمان خانے میں کوئی نہ کوئی مہمان آیا رہتا تھا۔

''بھابی! یہ بے جی اور فوزیہ کھانے پر نہیں آئیں۔'' اسے تعجب ہوا تھا۔

''بے جی تو ٹھہر کر کھانا کھائیں گی۔ اور فوزیہ کا تو تمہیں علم ہی ہے کہ اپنی مرضی کی مالک ہے، جب جی چاہے گا کھا لے گی۔''

انہوں نے عدیم کو اس کی گود سے لیتے ہوئے کہا جو چپس اور پیسٹری سے پیٹ بھرنے کے بعد اب سونے کی تیاریوں میں تھا۔

''آپ تو آئیں نا، یوں اچھا نہیں لگتا میز بالکل خالی ہو۔'' تابندہ نے کہا تو وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

''میں بس عدیم کو سلا کر ابھی آتی ہوں۔ بھوک تو مجھے بھی زوروں کی لگی ہے، مگر جانتی ہو نا مون صاحب کا سونے کا ٹائم نکل گیا تو یہ رو رو کر میرا رات کا کھانا اجیرن کر دیں گے۔''

''یہ تو ہے۔'' وہ سر ہلا کر کہتی پلٹ گئی۔

''بڑے آزاد طبع لوگ ہیں بھئی۔ ہر چیز بہوؤں کے حوالے کر رکھی ہے۔'' کھانے سے سجی میز پر اپنے علاوہ صرف تابندہ کو دیکھ کر احسن نے تبصرہ کیا تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔ بے جی ابھی ٹھہر کر کھانا کھائیں گی اور بھابی ابھی مون کو سلا کر آ رہی ہیں۔ تابندہ نے مسکراتے ہوئے اس کے آگے ڈونگا کھسکایا تھا۔

''جاؤ ثریا! تم بھی جا کے کھانا کھا لو۔'' مؤدب کھڑی ملازماؤں سے اسے ہمیشہ چڑ ہوتی تھی۔ حاکم و محکوم کا تاثر گہرا ہونے لگتا تھا۔ عموماً وہ کھانا کھانے کے دوران کسی چیز کی ضرورت پڑتی تو خود ہی اٹھ کر لے آتی تھی۔

وہ دونوں کھانا کھا چکے جب صدیقہ بھابی فراغت پا کر پہنچیں۔

''اب میں اکیلی کیا کھاؤں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو احسن فی الفور توصیفی انداز میں بولا۔

''کھانا اس قدر اچھا اور مزیدار بنا ہے کہ اگر پیٹ میں گنجائش ہوتی تو میں پھر سے کھا سکتا تھا، آپ کا ساتھ دینے کے لئے۔''

''واقعی بھابی! کھانا بہت اچھا بنا ہے۔'' تابندہ تو یوں بھی معترف تھی۔ یوں براہ راست تعریف و ستائش پر صدیقہ بھابی جھینپ سی گئیں۔

✡......✡

ادھر فوزیہ نے بے جی کے دل و دماغ کو پوری طرح اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ تابندہ، احسن کو لے کر ڈرائنگ روم میں گئی تو تھوڑی دیر کے بعد جب بے جی کام والیوں سے فارغ ہوئیں تبھی اس نے آگ لگانے کا کام شروع کر دیا تھا۔

''دیکھ رہی ہیں بے جی اپنی چھوٹی بہو کی آزاد روش کے مظاہرے۔''

''کیا ہوا؟'' وہ چونکی تھیں۔

کچھ دن پہلے جو تابندہ نے ان کے ساتھ منہ ماری کی تھی اس کے بعد تو ان کے دل میں بھی اس کی طرف سے بال آ گیا تھا۔

''ارے بے جی! آپ بھی نا بہت سادہ ہیں۔ ابھی دیکھا نہیں سب کے سامنے غیر مرد کے ساتھ کس قدر بے تکلفی دکھا رہی تھی۔ آپ سے کہہ دیا کہ کزن ہے مگر اصل بات تو بتائی ہی نہیں۔'' وہ آنکھیں گھماتے ہوئے شاطرانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

''تو کیا وہ اس کا کزن نہیں ہے؟ کہہ تو رہی تھی کہ خالہ کا بیٹا ہے۔'' بے جی کی سوچ اتنی گہری اور دماغ اتنا شاطر نہیں تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ جہاں انہیں اپنے اختیارات میں کمی کا احساس ہوتا تب وہ صحیح یا غلط کچھ نہیں دیکھتی تھیں۔ اور فوزیہ ان کی اسی کمزوری کا فائدہ اٹھاتی تھی۔

''ارے میری بھولی بے جی! خالہ کا بیٹا ہے تو کس کتاب میں لکھا ہے کہ یوں بے حیائی سے اس کے سینے سے لگ کر کھڑی ہو جائے۔ توبہ توبہ، غضب خدا کا ساری ملازمائیں موجود تھیں۔ کیا کیا باتیں نہیں بن رہی ہوں گی۔ اسے تو دیور جی کی عزت کی بھی پروا نہیں۔ اور پھر صرف خالہ زاد ہوتا تو چلو معاف بھی تھا کہ بھائی پہلی بار میکے سے آیا ہے۔ یہ تو اس کا منگیتر بھی تھا۔'' وہ گال پیٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

بے جی کا چہرہ ایک دم سے رنگ بدل گیا۔

✡......✡

''میرج ہال'' پہنچتے ہی وہ زارا کے ساتھ دلہن کے لئے مختص روم میں گھس گئی۔ شفق کے احتجاج پر زارا نے اسے گھرکا۔

''ارے، جا کر تم بھی انجوائے کرو۔''

''تم بھی تو یہیں ہو۔ ویسے بھی مجھ سے کچھ بھی انجوائے نہیں کیا جا رہا۔ ہمیں ثمین کو یوں بے رخی سے جانے نہیں دینا چاہئے تھا۔ اس نے کتنے شوق سے شادی میں شرکت کی تیاریاں کی تھیں، اور ہم نے اسے ایک بار بھی نہیں روکا۔'' اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

اور یہ نہیں تھا کہ زارا اور شفق کو ثمین کے یوں عین شادی والے روز جانے کا دکھ نہیں تھا مگر حالات کا تقاضا ہی یہی تھا کہ اسے جانے دیا جاتا ورنہ شاید کچھ مزید غلط ہو جاتا۔

''وہ کون سا دوستی کے تقاضے نبھا رہی تھی جو ہم اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر رکنے کی استدعا کرتے۔'' شفق نے اسے دکھ کے اس حصار سے نکالنے کے لئے تنک کر کہا تو زارا نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''جو کچھ اس نے کیا وہ کسی طور بھی معافی کے قابل نہیں تھا۔ اب تم اس سارے قصے کو بری یاد سمجھ کر بھول جاؤ۔ اور اگر تم نے میری شادی فلاپ کرنے کی کوشش کی تو پھر دیکھنا۔'' اس نے کہتے ہوئے آخر میں اسے دھمکایا تو اسے ہنسی نہیں آئی۔ اس کی جگمگاتی آنکھیں اس پل یاسیت کی دھند سے بھری ہوئی تھیں۔

'یادیں مہمان تو نہیں ہوتیں زارا! کہ اپنی من مرضی سے جب جی چاہا انہیں مدعو کر لیا اور جب جی چاہا واپس لوٹا دیا۔ یہ تو مکین ہوتی ہیں اور مکینوں کو ان کے اپنے گھروں سے نکالنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ بہت مشکل۔' وہ سوچ کر رہ گئی۔

زارا کی کزنز بیٹھ کر اس کے ہاتھوں پر مہندی لگانے لگیں تو شفق نے صبیرہ کو بھی ساتھ ہی باہر گھسیٹ لیا۔

''اسے ڈسٹرب مت کرو، مہندی لگوانے دو۔ ہم ذرا ہال میں رونق میلہ دیکھتے ہیں۔''

''تم بھی نا شفق، اور اسے عقل نہیں ہے کہ پارلر سے ہی مہندی لگوا لیتی۔ ابھی کیسے سوکھے گی؟''

وہ اس ''دیس نکالی'' پر جھنجلائی تھی۔

''اس کا خیال ہے کہ مہندی لگے ہاتھوں کی مووی زیادہ پیاری بنتی ہے۔ جبکہ پارلر سے لگوانے کے بعد خشک ہو کر جھڑ جاتی ہے اس لئے عین ٹائم پر لگوا رہی ہے۔ رسم تک خشک تو ہو جائے گی مگر جھڑے گی نہیں۔''

''اُف۔'' شفق کے مزے سے بتانے پر وہ حیران ہوئی تھی۔ کتنی گہری سوچ ہے، وہ خود کبھی ان تمام لوازمات کے قریب بھی نہیں پھٹکتی تھی سو ان باتوں کی گہرائی میں بھی

نہیں گئی تھی۔

''یہ دولہا کہاں غائب ہے آنٹی؟''شفق اسے ساتھ لئے زارا کی ممی کے پاس چلی آئی۔وہ ہنستے ہوئے اسے بتانے لگیں۔

''وہ لوگ بڑی دھوم دھام سے آنے والے ہیں۔باقاعدہ دولہے کو بگھی میں سوار کر کے لانے کا پروگرام ہے۔''

''دیکھا یہ ہوتی ہیں شادی بیاہ کی رونقیں۔مگر تمہیں تو کچھ پتہ ہی نہیں ہوگا۔''اپنی نشست کی طرف بڑھتے ہوئے شفق اسے چھیڑ رہی تھی۔

''واقعی، میں نے کبھی کسی شادی میں اتنی خصوصیت سے شرکت نہیں کی۔''اس نے ایمانداری سے اعتراف کیا تھا۔

آنٹی نے اپنی نگرانی میں ان دونوں کے لئے کولڈ ڈرنکس بھجوائی تھیں۔

''ویسے صبی یار! آج میں ایک حقیقت تو مان ہی گئی ہوں۔''

شفق کے انداز کی شرارت کو محسوس کئے بغیر وہ اسٹیج کی ڈیکوریشن کو دل ہی دل میں سراہتی بے توجہی سے بولی۔

''کون سی حقیقت؟''

''یہی کہ نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی۔''

اب کی بار وہ چہرہ موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

''ایسا کون دکھائی پڑ گیا تمہیں اس فیشن شو میں؟''

''صرف مجھے ہی نہیں بلکہ بہت سی بیٹوں کی ماؤں کی نظر بھی یقیناً اسی پر ہوگی۔''وہ محظوظ ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔اب کی بار صبیرہ کو بھی تجسس نے گھیر لیا۔

''مجھے بھی تو دکھاؤ وہ پری چہرہ۔جو سادگی میں بھی لوگوں کو لوٹ رہا ہے۔''

''آئینہ لاؤں؟''وہ سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔صبیرہ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگی، پھر اس کی بات سمجھی تو یکلخت ہی خجل سی ہوگئی۔سنہری رنگت کے نیچے دوڑتے خون نے اس کی رنگت میں گلابیاں سی گھول دی تھیں۔

''اسٹوپڈ۔''

''قسم لے لو۔ابھی زارا کی ممی سے بات کرنے کے دوران سب آنٹیوں کی نظر تم پر تھی۔''وہ مزے سے کہہ رہی تھی۔صبیرہ کے چہرے پر شرم وخجالت کا ملاجلا سا روپ دیکھنا بھی ایک بہت دلچسپ منظر تھا۔خوب صورت تو وہ تھی ہی مگر اس کی سادگی اس کی دلکشی کو مزید دوام بخش دیتی تھی۔اوپر سے اس کی خود سے بے نیازی اور لاپروائی سونے پر سہاگے کا کام دیتی تھی۔

''بہت فضول باتیں کرتی ہو تم۔''اس نے تادیبی انداز میں کہا تو شفق نے ہاتھ ہلا کر جیسے مکھی اڑائی۔

''کبھی کبھار ایسی فضول باتیں ہونی چاہئیں۔''

''ہاں، ویسے کبھی کبھار کوئی حرج نہیں۔''اس نے بھی ماحول کی مناسبت سے دل میں پھیلتی خوشگواری محسوس کرتے ہوئے اعتراف کرنے میں عار محسوس نہیں کی تھی۔

کافی دیر تک یونہی گپیں مارتے ہوئے ہال میں موجود لوگوں پر دلچسپ فقرے چست کرتے ہوئے انہوں نے کافی ٹائم بہت مزے سے گزارا مگر کچھ لڑکیوں اور بقول شفق ''آنٹیوں'' کی نظروں اور مسکراہٹ سے کنفیوژ ہو کر وہ اٹھ گئی۔

''کچھ دیر کے لئے زارا کے پاس بیٹھتے ہیں۔اب تک تو وہ مہندی کے جھنجھٹ سے بھی فراغت پا چکی ہوگی۔''

''تم بھی نا، کوئی اور لڑکی ہوتی تو ان سب کے سامنے اور بھی بن بن کر بیٹھتی۔''شفق نے اُسے چھیڑا تو وہ ہنس دی۔

''مجھے ایسی فضول حرکتیں کرنا نہیں آتیں۔''

زارا مہندی لگائے انہی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

''کتنی اچھی لگ رہی ہو زارا!''صبیرہ نے بے ساختہ ہی اس کی تعریف کی تھی۔ہاتھوں پیروں پر باریک ڈیزائن کی مہندی سجائے زرد لباس میں گوٹے سے سجا دوپٹہ شانوں پر ڈالے وہ واقعی پیاری لگ رہی تھی۔

''تمہارا کیا خیال ہے، ثوبان صاحب یونہی دیوانے ہوئے پھر رہے تھے اس کے پیچھے؟''شفق نے دلچسپ انکشاف کیا تھا۔ان کی ہنسی پر زارا کی رنگت دہک اٹھی تھی۔

اسی وقت ڈھول تاشوں اور بارودی پٹاخوں کی آوازوں نے ہلچل مچادی۔

''لگتا ہے وہ لوگ آ گئے۔''شفق تیزی سے آگے بڑھ کر کھڑکی کے شیشے سے نیچے جھانکنے لگی۔''زبردست۔''اس کی آنکھوں میں ستائشی تاثرات بھر گئے۔پھر اس نے ان دونوں کو بھی بلایا۔''دیکھو تو سہی، کیا زبردست مہندی لائے ہیں سب لڑکے۔''

''یہ تو سمجھو بارات کی ریہرسل کر ڈالی ہے انہوں نے۔''صبیرہ محظوظ ہوئی تھی۔

''ثوبان اچھا لگ رہا ہے نا یار؟''زارا نے بے ساختہ کہا تو ان دونوں نے بھی اس کی تائید کی تھی۔

واقعی وہ ہلکی بڑھی ہوئی شیو کے باوجود خوشی اور مسرت کی تمتماہٹ سے جگمگاتا چہرہ لئے سفید کاٹن کے براق لباس میں ملبوس گلے میں پیلا صافہ ڈالے بہت اچھا لگ رہا تھا۔بگھی میں شاہانہ انداز میں بیٹھا وہ مسلسل ساتھ بیٹھے ایڈی سے محو گفتگو تھا۔

بگھی کے آگے ثوبان کے تمام دوست اور کزنز بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ڈھول کی تیز دھمک اور ان کے وقتاً فوقتاً گونجنے والے نعرے ماحول کو گرمائے دے رہے تھے۔بے تحاشا آتش بازی نے فضا کو رنگین بنا دیا تھا۔آسمان پر جا کر چھوٹنے والی پھلجھڑی میں سے رنگ برنگی مالا سی نیچے آتی تو سب کی نظریں اس خوبصورت منظر میں اٹک جاتیں۔

''آج تو ایڈی کی بھی شان نرالی ہے۔میں تو اسے پہلی بار ایسی ڈریسنگ میں دیکھ رہی ہوں۔''شفق نے برملا کہا تو صبیرہ کی نگاہ بے ساختہ ہی اس پر جا پڑی۔آج وہ بھی جینز شرٹ کی بجائے کاٹن کے سفید شلوار کرتے میں ملبوس تھا۔ثوبان کی کسی بات پر ہنستے ہوئے اس نے اپنے مخصوص انداز میں سر جھٹکا اور اس کے شانے پر ایک مکا رسید کر دیا۔اب وہ جھک کر ثوبان کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا۔صبیرہ لاکھ کوشش کر کے بھی اپنی نگاہ نہیں ہٹا پا رہی تھی۔

اک عجیب سا احساس، نامانوس سی کیفیت۔

وہ لوگ نیچے ریسیپشن میں پہنچ چکے تھے۔ثوبان اور ایڈی دوستوں کی معیت میں اندر بڑھے تو ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اسے ایک دم جھٹکا لگا، جیسے کوئی سحر ٹوٹا ہو۔

وہ متوحش سی پلٹ کر کرسی میں دھنس گئی تھی مگر فی الوقت اس کے پاس اپنی اس بے اختیاری اور اس عجیب سی کیفیت پر غور کرنے کا ٹائم نہیں تھا۔

''تم لوگ یہیں رہو، میرے ساتھ ہی باہر جانا۔''زارا نے انہیں تنبیہ کی تھی۔صبیرہ نے شکر ادا کیا کہ وہ یوں بھی ابھی باہر جانا نہیں چاہ رہی تھی۔

اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جب مہندی تیل کی رسم ادا ہونا تھی۔زارا کے پھپھو زاد عدیل بھائی مووی میکرز کے ساتھ آ گئے۔

''تم میرے ساتھ کھڑی ہو۔''زارا نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے جکڑ لیا تو اس کے ساتھ ہی وہ نہ صرف منقش دوپٹے کے سائے میں بلکہ مووی کیمرے کے فوکس میں بھی آ گئی۔وہ احتجاج کرنے کے بھی قابل نہیں رہی تھی۔ساتھ ہی دوپٹے کا کونا پکڑے کھڑی شفق کا ساتھ دل کو تھوڑا سا آسرا دے رہا تھا مگر یوں سینکڑوں نگاہوں کا مرکز بن کر باہر جانا اس کے لئے ایک امتحان ہی ثابت ہوا تھا۔کمرے سے لے کر اسٹیج تک کا فاصلہ جیسے میلوں پر پھیل گیا۔زارا کے دل کی حالت تو وہ نہیں جانتی تھی مگر خود اس کا دل جیسے ہتھیلیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔یوں براہ راست کیمرے کی آنکھ کا سامنا کرنا اس کے لئے عذاب سے کم نہیں تھا مگر اب یوں سب کے بیچ میں سے بھاگ کر بھی نہیں جا سکتی تھی۔اسے اسٹیج پر بٹھاتے ہی سب سے پہلے وہ بھاگی تھی اور اسی اندھادھند دوڑ کی وجہ سے وہ بری طرح کسی سے جا ٹکرائی۔حواس تو پہلے ہی جواب دے رہے تھے، اب تو نظر بھی گھوم گئی۔

''آئی ایم سوری۔''بے ساختہ ہی اس کے ہونٹوں سے پھسلا۔مگر مقابل کو دیکھ کر وہ جیسے اپنی جگہ گڑ کر رہ گئی۔

''پہلی بار دیکھ رہا ہوں کہ سینکڑوں لوگوں میں بے حد اعتماد سے بولنے والی صبیرہ علی آج یوں نروس ہو رہی ہے۔''ایڈی کے ہونٹوں پر محظوظ ہونے والی دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔صبیرہ دھک سے رہ گئی۔تو یہ سب نوٹ کرتا رہا ہے۔

''نہیں تو۔ایکچوئلی میں نے کبھی ایسے فنکشن میں...... آئی مین کبھی ایسا رول پلے ہی نہیں کیا۔''وہ گڑبڑا سی گئی۔

''اوں ہوں، کرنا چاہئے۔ریہرسل ہوتی رہتی ہے، جو اپنی باری میں کام آتی ہے۔''ایڈی کے ہونٹوں پر آنے والی بے ساختہ مسکراہٹ اسے کنفیوژ کر گئی۔وہ اب بھی وہی صبیرہ تھی اور سامنے وہی ایڈی تھا مگر جو انکشاف صبیرہ پر ہوا تھا، اس کی وجہ سے وہ عجیب سی گھبراہٹ بلکہ خجالت آمیز احساسات کا شکار ہو رہی تھی۔

''ابھی تم ریسیپشن پر نہیں تھیں۔''اسٹیج پر نظر دوڑاتا وہ سرسری انداز میں کہتا صبیرہ کی تمام تر توجہ سمیٹ گیا۔

'یا خدا! ان پچاس ساٹھ لڑکیوں اور خواتین کی بھیڑ میں اس نے یہ بھی دیکھ لیا۔'اب خدا جانے وہ یونہی لاپرواہی سے پوچھ رہا تھا یا خود کو لاپرواہ پوز کر رہا تھا مگر صبیرہ کی حالت ضرور غیر ہو رہی تھی۔

''ہاں وہ میں...... کمرے میں زارا کے ساتھ تھی۔''

اسی وقت وہ کسی کے بلانے پر ایکسکیوز کرتا چلا گیا تو اس کی سانسیں آسان ہوئی تھیں مگر ساتھ ہی وہ اپنی حالت پر حیرت سے غور کرنے لگی۔ایڈی سے اسے اس طرح گھبرانا، کترانا اور اس کی سادہ سی بات پر بھی نروس ہونا اسے خود عجیب سے احساسات کا شکار کر رہا تھا۔مگر کوئی بھی سرا ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔

''یہ سب زارا کی فضول گوئی کا قصور ہے۔مگر مجھے اس کے سامنے اس قدر کانشس نہیں ہونا چاہئے۔کس قدر گھٹیا اور سبکی والی بات ہے۔''اس نے سختی سے خود کو سرزنش کی

تھی۔

لڑکوں نے بہت شور ہنگامے کے بعد بھنگڑا ڈالتے ہوئے ثوبان کو اسٹیج پر زارا کے ساتھ والی منقش کرسی پر جا بٹھایا۔ سی ڈی پلیئر کا فل والیم ماحول میں جوش پیدا کر رہا تھا۔

مہندی کی یہ رات
مہندی کی یہ رات
آئی مہندی کی یہ رات، لائی سپنوں کی بارات
سجنیا، ساجن کے ہے ساتھ، اس کے ہاتھوں میں ہے ہاتھ
او گوری کرت سنگھار، گوری کرت سنگھار

تیل مہندی کی دلچسپ رسم میں سبھی نے جوش و خروش سے حصہ لیا تھا۔ شفق اسے کتنی ہی بار اشاروں سے بلا چکی تھی۔ اسے زارا نے اپنے پاس روک رکھا تھا مگر وہ نظر انداز کیے اپنی نشست پر براجمان رہی۔

بڑوں کے فارغ ہونے پر اب دولہا دلہن کے دوستوں کے رسم ادا کرنے کی باری تھی۔ آنٹی اسے زبردستی اٹھا کر ساتھ لے گئیں۔

''تمہیں تو سب سے آگے ہونا چاہیے صبیرہ! بیسٹ فرینڈ ہو زارا کی۔'' انہوں نے اسے کرسی پر جا بٹھایا تو وہ نروس سی ہو کر رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ رسم شروع کرے تو کیسے کرے۔

''مہندی رکھو پہلے میرے ہاتھ پر پھر تیل لگاؤ اور اس کے بعد مٹھائی کھلاؤ۔'' زارا بی بی نے اطمینان سے مشورہ دیا تو شفق نے پیچھے سے اس کا سر دبا کر جھکا دیا۔

بمشکل ہی سہی مگر وہ یہ مرحلہ طے کر کے اٹھنے لگی تو ان سب نے شور مچا دیا۔

''ابھی تو دولہا باقی ہے۔''

''اوہ گاڈ......'' وہ پھنس کر رہ گئی۔ بہر طور اس نے ثوبان کی رسم بھی ادا کر ہی دی۔

''ذرا اس شہ بالے کو بھی تیل لگاؤ صبیرہ! تا کہ اس کی بھی جلدی سے شادی ہو۔'' آنٹی نے اونچی آواز میں کہا تو وہ بے بسی سے انہیں دیکھنے لگی۔ سبھی نے ثوبان کے ساتھ ساتھ ایڈی پر بھی خوب تیل انڈیلا تھا مگر صبیرہ نے قطعی نہیں سوچا تھا کہ اس کی باری بھی آ جائے گی۔ دل کڑا کر کے اس نے ایک انگلی تیل میں ڈبو کر ایڈی کے تیل میں لتھڑے بالوں پر رگڑ دی۔ تبھی اس نے ایک دم سے اپنی ہتھیلی صبیرہ کے آگے پھیلا دی۔

''مہندی نہیں لگاؤ گی۔ کسی خوبصورت سے نام کی۔''

اس کا دل سکڑ کر پھیلا۔ چاہے کسی نے اس شور میں ایڈی کی بات نہ سنی ہو مگر صبیرہ اس کی فرمائش پر ساکت رہ گئی۔ ایڈی کے لب و لہجے جیسی سنجیدگی اس کی آنکھوں سے جھلکتی نامانوس سی کیفیت سے بھی ظاہر تھی۔ وہ تیزی سے وہاں سے ہٹ گئی۔

اس کے بعد وہ سارے فنکشن میں زارا کے ساتھ چپکی رہی۔ حتیٰ کہ مہمانوں کی رخصتی عمل میں آنے لگی۔ اسی اثناء میں صبح کے ساڑھے تین بج چکے تھے۔

''مجھے تو سخت نیند آ رہی ہے۔ اور تھکن سے برا حال ہے۔'' صبیرہ بدمزہ ہو رہی تھی۔ دراصل اپنے احساسات کی تبدیلی کو اس کے دل و دماغ قبول کرنے سے انکاری تھے۔ ہاں، ناں کی یہی جنگ اس کے اعصاب کو تھکا رہی تھی۔

وہ سب نیچے داخلی دروازے پر آئیں تو زارا کے پاپا نے کہا۔

''تم لوگ بھی گاڑی میں بیٹھو، چلو جلدی کرو۔''

''چلو بھئی۔'' ایڈی نے بلیک کرولا کا دروازہ کھولا تو زارا اور شفق کی تقلید میں اسے بھی بیٹھنا پڑا۔

''ایڈی! تمہاری گاڑی میں جگہ تو ہے نا ایک بندے کی؟'' انکل نے فرنٹ سیٹ خالی دیکھ کر آواز لگائی تو وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے مصروف انداز میں بولا۔

''خالی تو ہے مگر بیٹھنے کے قابل نہیں، گیلی ہے۔''

ان تینوں کو بھی کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی تھی مگر زارا تو تب بدکی جب مین روڈ پر جا کر ایڈی نے گاڑی روکی اور محو انتظار دولہا کو فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کا شرف بخشا۔

''کس قدر بدتمیز ہو ایڈی! تم تو کہہ رہے تھے کہ سیٹ گیلی ہے۔'' زارا نے حسب استطاعت دوپٹے کا گھونگھٹ نکالتے ہوئے چلا کر کہا تو وہ ہنسنے لگا۔ مگر ثوبان بہت جذباتی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا۔

''تمہاری خاطر تو میں کہیں بھی بیٹھ سکتا ہوں۔''

''جلتے توے پر بھی۔'' ایڈی نے گرہ لگائی تو وہ اسے گھورنے لگا۔

''یہ ویسے بہت غلط بات ہے۔ ابھی گھر جا کے سب کو پتہ چلا تو ڈانٹ پڑ جائے گی سب کو۔'' شفق نے ان کی شرارت سے محظوظ ہوتے ہوئے بظاہر انہیں ڈرایا تھا۔

''میں ڈانٹ بھی کھا لوں گا۔'' فرمانبرداری تو آج ثوبان پر ختم تھی۔ انہیں اس کی حرکت پر ہنسی آ رہی تھی۔

''ایڈی نے آج اچھی طرح اپنی مایوں کی ریہرسل کر لی۔ لگتا ہے کہ بہت جلدی ہے شادی کرنے کی۔'' شفق عموماً اتنی بے تکلفی سے کام نہیں لیتی تھی۔ صبیرہ کو لگا اس کی پیشانی تپ اٹھی ہو۔ اگر زارا نے محض قیاس آرائی نہیں کی تھی تب تو اس وقت ایڈی سے اس نہج پر گفتگو کرنا گویا صبیرہ کی برداشت کا امتحان تھا۔ وہ کچھ بھی کہہ سکتا تھا، اس نے بے اختیار شفق کا ہاتھ دبا کر اسے باز رہنے کو کہا تھا۔

''بھئی ہو سکتا ہے کہ کوئی اس کی نظر میں ہو۔'' ثوبان کی مسکراہٹ بے وجہ نہیں تھی۔ صبیرہ کی اٹھتی نگاہ ویو مرر میں ایڈی کی مسکراتی نظروں سے جا ٹکرائی تو پہلو میں ہلچل کا سا احساس پا کر صبیرہ نے فی الفور نظر کا زاویہ تبدیل کر لیا۔

''اور جو میری نظر میں ہو، وہ تو کوئی نایاب ہستی ہی ہو سکتی ہے۔ تو میں کیسے اسے کھونے کا رسک لے لوں؟''

اس کا چہرہ پُرسکون مسکراہٹ کی زد میں تھا۔ صبیرہ کا رہا سہا سکون بھی غارت ہو گیا۔ وہ خود اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی۔ نہ تو ایڈی نے اس سے اقرار محبت کیا تھا اور نہ ہی ایسا کچھ ظاہر کیا تھا۔ پھر بھی اس کی باتیں اور نظروں کا تصادم ہر لحظہ اسے خود میں سمٹنے پر مجبور کر رہا تھا۔

''یہ نئے دور کا مجنوں ہے۔ پتہ ہے پچھلے دو سالوں سے لیلیٰ کے پیچھے پتھر کھا رہا ہے اور مزے کی بات یہ کہ لیلیٰ کو خبر بھی نہیں۔'' ثوبان اس کا مذاق اُڑا رہا تھا۔

''تم ذرا اپنی خبر رکھو، ابھی جب گھر جا کر اس گاڑی میں سے برآمد ہو گے تو تم پر کیسی سنگ باری ہو گی۔''

اس موضوع کی طوالت صبیرہ کو خلجان کا شکار کرنے لگی تو اس نے فوراً ہی ثوبان کی توجہ زیر غور مسئلے کی طرف مبذول کرا کر موضوع بدلنے کی سعی کر ڈالی۔ ایڈی کی ویو مرر میں اس پر اٹھنے والی مسکراتی نگاہ بہت بے ساختہ تھی۔

''ڈیئر سسٹر! ابھی ہم اپنے گیٹ پر اتر جائیں گے۔ اور ویسے بھی ہم باطل سے ڈرنے والے بالکل بھی نہیں ہیں۔'' وہ مزے سے بولا تو زارا نے جل بلا کر کہا۔

''تم صرف آغا جان کی چھڑی کی مار سے ڈرنے والے ہو اور ابھی دیکھنا میں گاڑی رکتے ہی ہنگامہ کھڑا کر دوں گی۔''

''بس یہی آواز سننے کی خاطر تو میں اس گاڑی میں بیٹھا ہوں۔'' دوبدو کہتے ہوئے وہ ڈیش بورڈ بجا کر گنگنانے لگا۔

''آواز وہ جادو سا جگاتی ہوئی آواز
مدہوش دل و جاں کو بناتی ہوئی آواز
کلیوں کے چٹخنے کی صدا ہم نے سنی ہے
شیشے کے کھنکنے کی صدا ہم نے سنی ہے
بلبل کے چہکنے کی صدا ہم نے سنی ہے
لیکن وہ کہاں ہوش اُڑاتی ہوئی آواز
مدہوش دل و جاں کو بناتی ہوئی آواز''

آسمان پر چھائی سیاہی سے جھلکتی صبح کے ہلکے ہلکے نور کی چادر تلے رات کے سناٹے میں اس کی آواز کا دلکش زیر و بم لطف دے گیا تھا۔ خود زارا سٹپٹا کر چپ ہو رہی تھی۔

''ویری گڈ، بہت اچھے۔'' ثوبان کے خاموش ہوتے ہی شفق نے اسے سراہا تھا۔

''زارا! کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ کل کے بعد یہ نظم بالکل بدل جانے والی ہے۔ پھر یہ کہے گا 'بھیگی بلی بنے شوہر کو ڈراتی ہوئی آواز'۔'' ایڈی نے ہنستے ہوئے کہا تو ثوبان اس پر خفا ہونے لگا۔

''کم از کم آج تو آزادی کا جشن منا سکتا ہوں نا۔ کل کے بعد سب سے پہلے گھر میں تیرا آنا جانا ہی بند ہونے والا ہے۔''

''بہت فضول ہیں یہ لوگ۔'' زارا تنگ آ گئی تھی۔

اور پھر اس نے ایسے ہی کیا۔ خود اپنے گیٹ سے کچھ پہلے ہی اتر گیا۔

''کہہ دینا احتجاجاً مارچ پاسٹ کرتا میرج ہال سے گھر تک آیا ہوں۔ میری آزادی سلب کی جا رہی ہے۔'' ایڈی نے اسے مشورہ دیا جس پر اس نے فوری طور پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''بہت فضول شخص ہو تم۔ میری موجودگی میں تم اسے ایسے شر انگیز مشورے دیئے جا رہے ہو۔'' گاڑی آگے بڑھتے ہی زارا نے ایڈی کی گردن ناپی تھی۔

''مشکل میں دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔'' وہ ہنسا تھا۔

تمام گاڑیاں گھر پہنچ چکی تھیں۔ سب سے آخر میں ان کی گاڑی پہنچی تھی۔ وہ سیدھا گاڑی کو پورچ میں لے آیا۔ وہ تینوں نیچے اتریں، ایڈی بھی انجن آف کرتا اگنیشن میں سے چابی کھینچتا نیچے اترنے لگا تھا۔ جانے کیسے بے احتیاطی سے اس کا بازو گاڑی کے کھلے دروازے سے رگڑ کھا گیا تھا۔ درد کی شدید لہر نے اسے ہونٹ بھینچنے پر مجبور کر دیا۔

''کیا ہوا ایڈی؟'' زارا پریشان ہوئی تھی۔

''اوہ گاڈ!'' اس کے بازو پر پھیلنے والی خون کی سرخی صبیرہ کو دہلا گئی۔

''یہ کیا ہوا ہے؟'' انکل تیزی سے اس کی طرف بڑھے تھے۔

''یونہی انکل! دروازے سے رگڑ لگ گئی۔'' وہ انہیں ٹالنے لگا مگر آغا جان نے اسے ڈانٹ دیا۔

''تمہیں ضرورت ہی کیا تھی ڈرائیونگ کرنے کی۔ بالکل تازہ زخم ہے بازو کا۔ پتہ ہے بے احتیاطی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔''

''درد تو بالکل نہیں ہو رہا آغا جان! بس رگڑ لگنے سے بلیڈنگ شروع ہوگئی ہے۔ میں ابھی بینڈیج تبدیل کر لیتا ہوں۔'' وہ اب بھاگنے کو پر تول رہا تھا۔

''چلو، میں خود ثوبان سے کہتا ہوں جا کر۔'' انکل اسے ساتھ لے گئے تھے۔

''میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔'' زارا نے جھرجھری لے کر کہتے ہوئے اندر کی طرف قدم بڑھائے تو وہ بھی مُردہ دلی سے اس کے ساتھ بڑھ گئی۔

''مجھے بھی خیال نہیں رہا کہ زخمی بازو کے ساتھ وہ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔'' شفق کو اپنی کند ذہنی پر افسوس ہوا تھا۔

''اس لڑکے کو یوں بھی ایسی بہادریاں دکھانے کا بہت شوق ہے۔ اسے تو کسی بہت مضبوط دل والی لڑکی سے شادی کرنی چاہئے۔'' زارا نے مسکرا کر کہا تھا۔

شدید تکان کے باوجود نیند تھی کہ آ نہیں رہی تھی۔ وہ تنگ آ کر اٹھ بیٹھی۔ زارا اور شفق بے سدھ پڑی تھیں۔

ایک وہی احساسِ ندامت کا شکار بنی وحشت کے گھیراؤ میں تھی۔ اسے اب شدت سے اپنی سابقہ غلطیوں کا احساس ہو رہا تھا جو وہ ایڈی کے کردار کے حوالے سے کرتی چلی آئی تھی اور اس کے باوجود وہ ہر مشکل مرحلے میں بلا جھجک اس کی مدد کو آگے بڑھا تھا۔ یہاں تک کہ کل شہباز گردیزی سے بھی بھڑ گیا۔ وہ اچھی طرح جان گئی تھی کہ ایڈی کی یونیورسٹی سے باہر شہباز گردیزی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں تھی، ماسوائے خود صبیرہ والے قصے کے۔

'کس قدر ذلالت کی بات ہے کہ ایک شخص میری خاطر موت کی حدوں کو چھو آیا اور مجھے اس بات کا کوئی احساس ہی نہیں۔ یا خدا، میں کیا کروں کہ میرے دل پہ دھرا یہ ندامت کا بوجھ ہٹ جائے؟' وہ بے چینی و اضطراب کے بھنور میں غوطہ زن تھی۔

ایڈی سے کہے تمام فضول الفاظ، بے دریغ اس کی کردار کشی کرنا، اسے جھوٹا اور دھوکے باز کہنا۔ تمام کچھ اسے طمانچے کی طرح اپنے منہ پر پڑتے محسوس ہو رہا تھا۔

پتہ نہیں کس خیال میں وہ سٹنگ روم میں چلی آئی۔ لائٹ آن کرتے ہوئے اس نے لحظہ بھر کو نہیں سوچا تھا کہ اگر اس وقت آنٹی وغیرہ میں سے کوئی اسے یوں دیکھ لے تو کیا سوچے گا۔

ایڈی کا موبائل نمبر اس کے پاس کبھی بھی نہیں رہا تھا مگر اس نے ثوبان کے موبائل پر کال کر لی۔ وہ بلا جھجک اس سے ایڈی سے بات کرانے کا کہنا چاہتی تھی مگر خوش قسمتی سے کال ایڈی ہی نے ریسیو کی تھی۔

''کون، ایڈی؟'' دوسری طرف سے ایڈی کی آواز سن کر اس نے واضح طور پر اپنے ریسیور کو تھامنے والے ہاتھ میں کپکپاہٹ محسوس کی تھی۔

''جی، مگر آپ کون ہیں؟'' سی ایل آئی پر واضح طور پر زارا کا فیڈ کیا ہوا نام آیا تھا مگر آواز زارا کی نہیں تھی سو اس کی حیرانی واجب تھی کہ اس قدر روشق سے اس کا نام لینے والا کون ہے۔

''میں صبیرہ بول رہی ہوں۔'' اسے متعارف ہونے کے لئے اپنی تمام تر ہمت مجتمع کرنا پڑی تھی۔ اور اس کے جواب میں چھانے والی چند ثانیوں کی خاموشی بھی بہت اچھی طرح محسوس ہوئی۔

''خیریت؟'' حیرت کے پہلے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد وہ اب تشویش بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''میں تمہاری طبیعت کا حال معلوم کرنا چاہ رہی تھی۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز نم ہونے لگی۔ بھلا اس شخص کے احسان کا بدلہ کسی طور چکایا جا سکتا تھا؟

''مجھے کیا ہوا ہے، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بلکہ ابھی میں ٹیرس پر چہل قدمی کرتے ہوئے خود کو زیادہ بہتر محسوس کر رہا ہوں مگر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ ثوبان کا موبائل میرے پاس ہے؟'' لاپروائی سے کہتے ہوئے اس کے لہجے میں تجسس در آیا تھا۔

''اگر ثوبان کے پاس بھی ہوتا تو میں اس سے تم سے بات کرانے کا کہہ دیتی۔'' اس نے رخساروں پر آ جانے والے آنسوؤں کو انگلیوں کی پوروں سے جھٹکا تھا۔

''تم رو رہی ہو صبیرہ؟'' وہ سنجیدہ تھا۔

''نہیں۔'' اس سے بولا نہیں گیا۔

''تم رو بھی رہی ہو اور جھوٹ بھی بول رہی ہو صبیرہ! کیا بات ہے؟ کھل کر کہو۔'' اس نے مضبوط لہجے میں اپنی بات دہرائی تو وہ جیسے تھک سی گئی۔

''میں بہت شرمندگی محسوس کر رہی ہوں ایڈی! آج تک آنکھوں پر خود ساختہ نفرت کی پٹی باندھے میں نے حقیقت کو محسوس کرنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ ہر موقع پر تم سے بدگمانی برتی مگر تم نے پھر بھی اچھے دوست ہونے کا حق نبھایا حالانکہ ہمارے درمیان کبھی یہ رشتہ نہیں رہا پھر بھی تم نے اس رشتے کے تقاضے نبھائے۔ میں خود کو بہت چھوٹا محسوس کر رہی ہوں ایڈی! تم چاہتے ہو کہ میں کوئی معذرت نہ کروں لیکن میں جانتی ہوں کہ اگر میں نے تم سے معذرت نہیں کی اپنی تمام غلطیوں اور بدکلامیوں کی تو میں کبھی بھی اپنے آپ سے نظریں نہیں ملا سکوں گی۔ میں جانتی ہوں کہ کس وجہ سے تم نے شہباز گردیزی سے جھگڑا کیا ہے۔ میں نے تو کبھی بھی تمہیں صحیح نہیں سمجھا تھا ایڈی! پھر بھی تم نے میری خاطر ...... یہ گولی تمہاری جان بھی تو لے سکتی تھی۔ پتہ نہیں کیسی بے چینی اور ندامت میرے دل کو مٹھی میں لئے ہوئے ہے ایڈی! مجھے لگ رہا تھا اگر میں نے تمہارے سامنے اپنی غلطیوں، اپنی بدتمیزیوں کا اعتراف نہیں کیا تو شاید میں عمر بھر اسی اضطراب میں گھری رہوں گی۔''

وہ رو رہی تھی۔

اس شخص کے سامنے، جس کے سامنے شکست کا اعتراف کرنا اسے ذلت لگتی تھی۔

مگر اب اسی شخص کے سامنے رو کر اسے اپنے دل و دماغ پر سے ندامت کا بہت سا بوجھ ہٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''صبیرہ ...... صبیرہ! پلیز خود کو سنبھالو۔''

''میں تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں ایڈی! خدا کے بعد تمہی نے مجھے ذلت کے اس عمیق گڑھے میں گرنے سے بچایا ہے۔ اگر تم میری بدتمیزی اور بدزبانی کے باوجود میری مدد نہیں کرتے تو مجھے ٹریپ ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔'' وہ نڈھال ہو رہی تھی۔

وہ لب بھینچے اس کی دل گرفتہ باتیں سن رہا تھا مگر ایک مرتبہ بھی اس نے صبیرہ کو نہیں ٹوکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دل کا بوجھ ہلکا ہو جانا ہی اس کا سب سے بہترین علاج تھا۔ جس صورت حال سے وہ ٹریپ ہوتے ہوتے بچی تھی وہ واقعی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اگر کسی طور وہ ایک بار بھی سطوت آرا کے ہتھے چڑھ جاتی تو تمام عمر کے لئے عزت کی زندگی گزارنا ایک خواب سا بن کر رہ جاتا۔

''اٹس او کے، اگر اس طرح تمہارے دل کو سکون ملتا ہے تو ٹھیک ہے۔ میں نے تمہاری معذرت سن بھی لی اور قبول بھی کر لی۔ حالانکہ میں نے کبھی بھی تمہاری طرف سے اپنے دل میں کوئی ایسی بات، کوئی بغض نہیں رکھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم بہت بہترین لڑکی ہو۔ اگر میرا امیج تمہاری نظروں میں خراب نہیں ہوتا تو تم کبھی بھی مجھ سے اتنے برے تعلقات نہیں رکھتیں۔ کیونکہ تم ایسی لڑکی نہیں ہو جو خواہ مخواہ کسی سے ذاتی عناد رکھتی پھرے۔'' وہ نرمی سے کہتے ہوئے رکا تھا، پھر قدرے توقف کے بعد سنجیدگی سے بولا۔ ''اور جہاں تک میری اچھائی کی بات ہے تو صبیرہ! انسانیت کا درد رکھنے والے تو کسی کو بھی مشکل میں دیکھ کر اس کی مدد کرنے کو آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر رشتہ داری یا دوستی و دشمنی نہیں دیکھی جاتی۔ اور ایک بات جو میں نے آج تک تم سے صرف اسی وجہ سے نہیں کہی تھی، کیونکہ تم کبھی بھی میرے کردار کی طرف سے مطمئن نہیں رہیں وہ یہ کہ میرا تمہارے اتنا بدگمان رہنے کے باوجود تمہارے پیچھے خوار ہونا صرف اس وجہ سے ہے کہ مجھے تمہارے کردار کی پختگی اور صاف ستھری سوچ نے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ جانے کب اور کیسے حمایت اور مخالفت کے چکر میں تقریریں کرتے، اتنے گولڈ میڈل جیتنے کے بعد بھی میں ہارتا چلا گیا۔ وہ بھی ایک ایسی لڑکی سے جو ہمیشہ ہی مجھے اپنا دشمنِ اول قرار دیتی رہی ہے۔ اور جسے نہ تو کسی پر اعتبار کرنا آتا ہے اور نہ ہی آنکھیں پڑھنا۔''

اس کا دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو بے تاب ہونے لگا۔ پسینے سے بھیگتی ہتھیلی میں تھما ریسیور پھسلنے لگا تو اس نے جلدی سے لائن ڈراپ کر کے موبائل میز پر رکھ دیا۔

وہ اس وقت خود بھی اچھی طرح اپنی ہوائیاں اُڑتی محسوس کر سکتی تھی۔

اس کے ہاتھوں، پیروں میں عجیب سی سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔

دشمنی سے ہٹ کر دوستی پر آنے اور اب یکلخت ہی اپنائیت اور لگاؤ کے اس غیر متوقع اظہار نے اس کی دھڑکنیں اتھل پتھل کر دی تھیں۔ اس نے سرد ہوتے ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر کچھ سمجھنے کی کوشش کی۔

'تو زارا کا کہنا غلط نہیں تھا۔'

اس کا دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر اُبھرا تھا۔

......

وقار علی کو ویک اینڈ سے دو روز پہلے گھر میں دیکھ کر وہ خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت کا بھی شکار ہوئی تھی۔ وہ سو رہی تھی، جب وہ آیا۔ کھٹکے کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی تو وقار علی کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

’’آپ کب آئے؟‘‘ وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ کرسی میں دھنسا پیروں کو جوتوں سے آزاد کر رہا تھا۔

’’فون بھی نہیں کیا اور ابھی آپ کی چھٹی بھی نہیں تھی۔‘‘

’’تو کیا کروں، واپس چلا جاؤں؟‘‘ وہ اس قدر تلخی سے بولا تھا کہ ایک پل کو تابندہ بھی بولنا بھول گئی۔

’’کیا بات ہے وقار، خیریت تو ہے نا؟‘‘ اس کے دل کو کئی اوہام نے گھیر لیا۔

’’خیریت، اطمینان، سکون، یہ سب رہا ہی کہاں ہے میری زندگی میں۔‘‘ وہ بہت غصے میں لگ رہا تھا۔ تابندہ تحیر میں مبتلا ہونے لگی۔

’’کچھ بتائیں تو سہی۔ ہوا کیا ہے؟‘‘

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے پتھریلے تاثرات اس لمحے تابندہ کو بے حد اجنبیت کا احساس دلا رہے تھے۔

’’میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا کہ اس حویلی کے کچھ اصول، کچھ ضوابط ہیں تابندہ! جن کی پاسداری کرنا تمہارے لئے فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔‘‘

وہ بحرِ تحیر میں غرق ہونے کو تھی۔

’’میں نے ایسا کیا، کیا جس سے اس گھر کی عزت پر کوئی حرف آیا ہو یا پھر کوئی اصول ٹوٹا ہو؟‘‘ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

’’احسن ملک یہاں کیا کرنے آیا تھا؟ وہ بھی میری غیر موجودگی میں؟‘‘ وہ چبھتے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ تابندہ خالی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس پوچھ گچھ کا پس منظر سمجھنے کی کوشش میں اس کا ذہن ناکام رہا تھا۔

’’کیا مطلب ہے آپ کا؟‘‘

’’تم بچی نہیں ہو کہ میرے سوال کو سمجھ نہیں پا رہیں۔ میں پوچھ رہا ہوں کہ تمہیں احسن ملک کو یہاں بلانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟‘‘

’’اول تو یہ کہ میں نے اسے نہیں بلایا تھا بلکہ وہ خود مجھ سے ملنے آیا تھا۔ دوسرے یہ کہ آپ کو اس بات پر کیا اعتراض ہے؟‘‘

اسے وقار علی کی بات پر شاک پہنچا تھا۔

وہ تنتناتا ہوا پسلیوں پر ہاتھ جمائے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اسے گھورتے ہوئے غصے سے بولا۔

’’مجھے یہ اعتراض ہے کہ وہ شخص میری غیر موجودگی میں اس گھر میں کیوں آیا تھا۔ اور تمہیں اس کے ساتھ اتنی آزادروی سے ملنے کی اجازت کس نے دی ہے؟‘‘

تابندہ کو لگا بہت سے شیشے اس کے گرد وپیش میں ٹوٹے ہوں۔ اعتماد کے، یقین کے، مان اور بھروسے کے۔ اور ان ٹوٹے شیشوں کی کچھ کرچیاں شاید اس کی آنکھوں میں بھی جا پڑی تھیں تبھی تو یکلخت اس کی نگاہ دھندلا سی گئی تھی۔

’’اس میں پابندی والی کوئی بات تو نہیں وقار! وہ میرا کزن ہے.....‘‘

وہ اس سے تیز لہجے میں بولا۔

’’پابندی ہے تابندہ بیگم! میری طرف سے پابندی ہے۔ وہ صرف تمہارا کزن نہیں بلکہ تمہارا منگیتر بھی رہ چکا ہے۔‘‘

اس کی دماغی نسیں جیسے تن سی گئیں۔

اس قدر گھٹیا سوچ۔

یا خدا! یہ کیسی پُر اذیت ساعتیں ہیں۔ بداعتمادی کا یہ کیسا روپ ہے جو اس قدر محبت کرنے والے شخص کی صورت میرے سامنے آن کھڑا ہوا ہے۔

’’میں اس سے منگیتر والے رشتے سے نہیں ملی تھی وقار! وہ میرے میکے سے پہلی بار آیا تھا اور تم ایسی گھٹیا باتیں.....‘‘

وہ چیخ اٹھی تھی۔

اس قدر ذلت واہانت سے پُر الفاظ برداشت کرنے کی مزید سکت اس میں باقی نہیں رہی تھی۔ مگر وہ اس سے اونچے لہجے میں اس کی بات کاٹ کر درشتی سے بولا۔

’’وہ چاہے پہلی بار آیا ہو یا آخری بار مگر مجھے اپنی بیوی کا غیر کے شانے پر سر رکھ کر اپنا دکھ بانٹنا گوارہ نہیں۔ میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں کہ اپنی بیوی کو اتنی بے باکی کے ساتھ اس کے سابقہ منگیتر سے ملتے ہوئے.....‘‘

’’تمیز سے بات کریں وقار! میں بیوی ہوں آپ کی، کوئی زرخرید غلام نہیں جس کے ساتھ آپ جس لب ولہجے میں چاہیں بات کرتے پھریں۔‘‘

اس کی پیشانی پر جیسے کسی نے تپتی سلاخ رکھ دی تھی۔

اس کے انداز نے لحظہ بھر کو وقار علی کو ٹھٹکا دیا۔ وہ بری طرح چلا رہی تھی۔

’’جانتی ہوں میں کہ کس نے آپ کے کان بھرے ہیں۔ مگر آپ تو مجھے اچھی طرح جانتے ہیں پھر آپ کی یہ سب باتیں کرنے کی ہمت بھی کیسے ہوئی؟ اگر احسن کی میری نظر میں کوئی ایسی حیثیت ہوتی تو میں کبھی بھی آپ کے لئے اسٹینڈ نہ لیتی۔ اور آج آپ دوسروں کی باتوں میں آ کر مجھ پر الزام تراشی کر رہے ہیں۔ یہ بات بھول کر کہ آپ کی خاطر میں نے احسن کو ٹھکرا دیا تھا۔‘‘

’’تم نے اسے ٹھکرا دیا تھا تابندہ! وہ کن جذبات کے ساتھ تم سے ملنے یہاں آیا تھا۔ کیا تم اس کے دل کی بات جان سکتی ہو؟‘‘

وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ تابندہ کا سر چکرانے لگا۔

یہ وقار علی ہے، اس قدر تنگ ذہن، گندی سوچ کا مالک۔

’’بس..... بس کریں وقار! اور کتنے زیادہ کریں گے میری نظر سے۔‘‘ وہ نڈھال ہو گئی۔ یقین کے جگنو، اعتبار کی تمام خوش رنگ تتلیاں اس کی مٹھیوں سے پھسل گئی تھیں۔ پھولوں کی روش پر چلتے چلتے وہ جیسے تپتے صحرا میں نکل آئی تھی جہاں ہر طرف دل وجان کو راکھ کر دینے والی تیز دھوپ تھی۔ کوئی مہربان سایہ دور دور تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔

’’شٹ اپ تابندہ! میں تمہیں ایک سیدھی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم بکواس کر رہی ہو۔‘‘ وقار علی کا جیسے دماغ الٹ چکا ہو۔

ابھی فوزیہ اور بے جی کی زبانی جو کچھ سن کر وہ آ رہا تھا اس نے وقار علی کی آنکھوں میں خون اتار دیا تھا۔

احسن ملک کا اس کی غیر موجودگی میں آنا اور تابندہ کا اتنی بے تکلفی سے اس سے ملنا اور تنہائی میں محو گفتگو رہنا، اس کی غیرت پر تازیانہ بن کر لگا تھا۔

’’کیا سیدھی بات سمجھا رہے ہیں آپ؟ آپ تو صرف مجھ پر دفعہ عائد کرنے آئے ہیں۔ میں اتنی ہی بری تھی آپ کی نظر میں تو مجھ سے شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اب آپ کو مجھ میں خامیاں دکھائی دینا شروع ہو گئی ہیں، آپ بھی تو میرے لئے غیر تھے، تب میں آپ سے بھی ملتی تھی۔ اس وقت آپ میں یہ غیرت کیوں نہیں جاگی، تب آپ کو کسی کی عزت کا خیال نہیں آیا تھا؟‘‘

وہ چیخ کر رہ گئی۔ آنسوؤں نے اس کا چہرہ بھگو دیا تھا۔

’’وہ تمہارا مسئلہ تھا تابندہ! اگر ایک لڑکی اپنے والدین سے چھپ کر مجھ سے ملتی ہے تو اس میں میرا کیا جاتا ہے۔ بنیادی بات ہوتی ہے لڑکی میں اپنی عزت بنا کر رکھنے کا احساس ہونا۔ اگر تمہیں ہی اپنے گھر والوں اور اپنی عزت کا احساس نہیں تھا تو مجھے کیا پرواہ تھی۔

بس اسے لگا جیسے یہی قیامت کا لمحہ ہو۔

اندر کا شور اس قدر بڑھ گیا کہ سائیں سائیں کرتی سماعتوں کے ساتھ وہ بے حد بے یقینی سے وقار علی کے ہلتے ہونٹوں کو دیکھ رہی تھی مگر آواز نہیں سن پا رہی تھی۔

ابھی سورج دھرتی پر اُتر آئے گا، پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح اُڑنے لگیں گے۔

اسے لگا وہ اپنی بداعمالی کی پاداش میں دوزخ کے سیاہ بھڑکتے الاؤ میں ڈال دی گئی ہو اور اب اس کی سزا شروع ہو گئی ہو۔ اس کے بالوں کو رسی سے باندھ کر کھینچو، اس کے وجود کو شکنجے میں اتنی سختی سے کس دو کہ اس کی تمام ہڈیاں آپس میں خلط ملط ہو جائیں۔ اس کی سماعتوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے، اس کے حلق میں کانٹے اتار دیئے جائیں، اس کے وجود کو تیز دھار خنجر سے کاٹ ڈالو۔ وہ ان تمام عذابوں کو بہت اچھی طرح محسوس کرتے ہوئے حواس سے بے گانہ ہو گئی تھی۔

اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

’’کیا بات ہے وقار! اتنی جلدی تمہارا جنون ختم ہو گیا، جذباتی محبت کا نشہ اتر گیا؟‘‘ بھایا اس پر سخت خفا ہو رہے تھے۔ وہ سر جھکائے بیٹھا ان کی سخت سست سن رہا تھا۔

’’دن کتنے ہوئے ہیں تمہاری شادی کو کہ تم نے لڑنا جھگڑنا بھی شروع کر دیا ہے آپس میں۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ عملی زندگی میں جذباتیت کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔‘‘

’’بھایا! میں اسے صرف سمجھا رہا تھا۔‘‘ وہ مدھم آواز میں بولا۔ کچھ بھی ہو، تابندہ کی بگڑتی حالت نے اسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ اشتعال کا طوفان تھما تو وہ خود کو کوس کر رہ گیا۔

’’جانتا ہوں میں۔ مگر تم اپنے ذہن سے بھی سوچنا شروع کرو۔ عورتوں کی سیاست کا شکار بن کر اپنی ازدواجی زندگی کو داؤ پر مت لگاؤ۔ نہ تو تابندہ تمہارے لئے غیر ہے اور نہ اجنبی۔ میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا وقار! عورت کے لئے عزتِ نفس اس کی انا سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ کبھی بھی اپنی بیوی کی عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچانے کی غلطی مت کرنا۔‘‘

صدیقہ بھابی کی وساطت سے وہ بہت کچھ جان اور سمجھ چکے تھے۔ ماں کے سامنے تو وہ کچھ کہہ نہیں پائے تھے مگر اعزاز علی سے انہوں نے فوزیہ کو سمجھانے کا ضرور کہا تھا۔

’’میں نے ایسا کچھ نہیں کیا بھایا! اور اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں کسی کے کہے میں آ کر تابندہ سے جھگڑا کر رہا تھا تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ اس کا اپنے سابقہ منگیتر سے ملنا مجھے بالکل بھی گوارہ نہیں۔‘‘ وہ لب بھینچ گیا تھا۔ بھایا متاسفانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے، پھر تاسف بھرے لہجے میں بولے۔

’’اپنا لہجہ درست کرو وقار! تم اپنی بیوی کے متعلق بات کر رہے ہو، کسی غیر کے بارے میں نہیں۔ کوئی بھی دوسرا شخص نہیں بلکہ بعض اوقات ہماری سوچ غلط ہوتی ہے۔ اور تم

تابندہ کے متعلق بہت غلط سوچ رہے ہو۔ میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ تم اسے آزمائش کی بھٹی میں اتار رہے ہو مگر مجھے یہ علم نہیں تھا کہ پہلی آزمائش تمہاری ہی طرف سے ہوگی۔

''میں اسے غلط نہیں کہتا بھابی! میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ اپنے شہری طرز زندگی کو بھول کر اس حویلی کی روایات اپنا لے۔ یوں اپنے کزن کے ساتھ تنہائی میں محوِ گفتگو ہونا مجھے پسند نہیں اور نہ ہی اس کا منہ اٹھا کر یہاں چلے آنا۔''

جانے اسے کن لفظوں میں بہکایا گیا تھا پھر بھی بھابی نے اپنی طرف سے اسے سمجھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اور وہ بھی سر جھکائے یوں سنتا رہا جیسے اب ہر قدم ان کی نصیحت کے مطابق اٹھانے کا ارادہ ہو۔

فوزیہ بہت اطمینان سے بستر پر نیم دراز، غصے کے عالم میں پنڈولم کی طرح کمرے میں ادھر اُدھر ٹہلتے اعزاز علی کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہی تھی۔

'مجھے جلتے توے پر بٹھا کر سب بہت سکون میں تھے۔ اب خود پر ذرا سی آنچ آئی تو سب ہی سلگنا شروع ہو گئے ہیں۔'

وہ اس کے سامنے تھم گیا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کس طبیعت کی عورت ہو۔ تمہیں ذرا سی بھی شرم نہیں آئی وقار کے سامنے اس طرح کی بکواس کرتے ہوئے۔ کچھ اپنے رتبے ہی کا لحاظ کر لیتیں۔''

اس کی آنکھوں میں اتری سرخی، بھنچا ہوا لہجہ، پیشانی کے بل کچھ بھی فوزیہ کے لئے پریشانی کا باعث نہیں تھے بلکہ کلیجے میں اتنی ٹھنڈک پڑ چکی تھی کہ اس اعزاز علی کے غصے کی تپش بھی اسے بادِ نسیم کے جھونکے کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔

''ہم نے تو جو دیکھا وہ دیور جی کو بتا دیا۔ اب آپ ہی بتائیں، کون سا شوہر برداشت کر سکتا ہے کہ اس کی بیوی غیر مرد سے اتنی بے تکلفی برتے؟ ایک ہم ہیں کہ کبھی اپنے شوہر کے سامنے اتنے بے اختیار نہیں ہوئے جیسا کہ دیورانی جی اپنے سابقہ منگیتر کو دیکھ کر ہو رہی تھیں۔'' وہ اپنے مخصوص تمسخر وطنز سے بھرپور انداز میں کہتی اعزاز علی کو اپنا ضبط آزمانے پر مجبور کر گئی۔

''گھر اس طرح نہیں بنائے جاتے فوزیہ! اس طرح کی غیبت اور چغلیاں گھروں کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔''

وہ جیسے تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟ میں نے خود سے گھڑ کر یہ سب وقار علی کو بتایا ہے؟''

''میں یہ نہیں کہہ رہا۔ مگر تمہارا طریقہ بالکل غلط تھا۔'' وہ اب بھی نرمی سے کہہ رہا تھا۔

''مسٹر اعزاز علی! وقار علی کو بے جی نے فوری نوٹس پر بلوایا تھا۔ انہی کو تابندہ بیگم کے لچھن ٹھیک نہیں لگے تھے۔ اور وقار علی کو ہر بات سچ سچ بتانے کا سہرا بھی انہی کے سر جاتا ہے۔'' وہ بھڑک اٹھی تھی۔ پھر قدرے توقف کے بعد تلخی سے بولی۔ ''جب بات گھر کی عزت اور مردوں کی غیرت پر آجائے تو پھر لاپرواہی نہیں برتی جا سکتی۔ غضب خدا کا، تمام ملازمائیں وہاں موجود تھیں، ہر کسی نے وہ بے حیائی دیکھی۔ اب کسی کو کیا پتہ کہ دونوں میں کیا رشتہ ہے۔ اس کے بعد دو گھنٹے تک اکیلے بیٹھ کر گپیں مارتے رہے، پھر لنچ کیا گیا۔ ہم میں سے تو کسی کو جھوٹے منہ نہیں پوچھا تابندہ بیگم نے۔ شاید ڈسٹربنس کے خیال سے۔''

وہ معنی خیز انداز میں آنکھیں گھماتے ہوئے بولی تو اعزاز علی کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔

''بکواس مت کرو فوزیہ! اب اگر تم نے بھابی کے متعلق ایک بھی فضول بات کہی تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔''

مارے اشتعال کے اس کی رنگت سرخ ہو گئی۔ آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا ہو۔ اگر وہ تمام صورت حال سے انجان ہوتا تب شاید اس کا ردِ عمل اتنا شدید نہ ہوتا مگر صدیقہ بھابی نے اس سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔

''ارے واہ، آپ کے دل میں بہت درد جاگ رہا ہے بھابی کے لئے۔ اور جو اسے بھگا کر لائے ہیں وہ خوامخواہ تپے پھر رہے ہیں۔ اتنا اعتماد تو انہیں ہونا چاہئے اعزاز صاحب! ہوں، کہیں خیریت تو ہے نا خدانخواستہ......''

وہ بڑی شرارت سے مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ اعزاز علی نے دانتوں پر دانت جما کر بمشکل غصہ ضبط کیا تھا۔ پھر قدرے سنبھلنے کے بعد متاسفانہ انداز میں بولا۔

''بے حد گھٹیا ذہنیت ہے تمہاری فوزیہ! تمہیں نہ تو کسی رشتے کی عزت کا پاس ہے اور نہ ہی اپنی عزت کا۔ تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں کہ شوہر سے کیسے بات کی جاتی ہے۔''

''اب آپ سے ہم کو اتنی بھی محبت نہیں ہوئی کہ خوش اخلاقی اور تمیز کی کلاسز جوائن کرنے کا جنون سوار کر لیں۔ ہم بھی تو کمپرومائز کر رہے ہیں، آپ بھی گزارہ کیجئے۔''

وہ تنفر سے کہہ رہی تھی۔ اعزاز علی کو اپنے اعصاب تنتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے تمام نسیں کسی بھی پل ٹوٹ جائیں گی۔''

وہ سر جھٹکتا کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ فوزیہ جیسی عورت کے ساتھ بحث کر کے انسان صرف اپنا دماغ ہی خراب کر سکتا تھا جس کا اندازہ اب تک اعزاز علی کو بہت اچھی طرح ہو چکا تھا۔ اس عورت نے اس کی ازدواجی زندگی کو ایک امتحان بنا کر رکھ دیا تھا۔ نہ تو وہ خود خوش رہتی تھی اور نہ ہی اعزاز علی جیسے سادہ مزاج بندے کو مطمئن رہنے دیتی تھی۔

وہ آکر وقار علی پر اُلٹ پڑا۔

''یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم نے۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی بھابی سے یہ سب فضول باتیں کہنے کی؟''

''اے ہے اعزاز میاں، کیوں ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔ ذرا دم تو لو۔'' بے جی نے اسے ٹوک دیا تھا۔ مگر وہ وقار علی کی طرف متوجہ تھا جو خاموشی سے بے جی کے قریب موڑھے پر بیٹھا تھا۔

''دیکھو اعزاز! تم لوگ خوامخواہ بات کو غلط رُخ دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ بہو کو اس حویلی کی عزت اور اقدار کا پاس رکھنا چاہئے۔ اس کے کزن کا یوں وقار علی کی غیر موجودگی میں بہو کے پاس آنا کسی طور بھی درست نہیں ہے۔'' بے جی کے منہ میں فوزیہ کی زبان بول رہی تھی اور کچھ اب سر پر بھی آن پڑی تھی تو اپنے کہے سے ہٹنا ان کی شان کے خلاف تھا۔

''کیوں بے جی! کیوں درست نہیں؟'' وہ خلاف عادت اونچی آواز میں بول گیا تھا۔ ''گھر میں صرف وقار علی ہی نہیں تھا، باقی سب لوگ بھی تو موجود تھے۔ پھر اس شخص کا آنا کیسے غلط ہو سکتا ہے؟''

''وہ بہو کا صرف کزن ہی نہیں منگیتر بھی رہ چکا ہے۔'' بے جی نے اسے باور کرایا تو وہ سلگتی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

''آپ لوگوں کو یہ حقیقت تو دکھائی دے رہی ہے کہ وہ بھابی کا سابق منگیتر ہے مگر یہ حقیقت کسی کو دکھائی نہیں دے رہی کہ اسی شخص سے رشتہ توڑ کر وہ وقار علی کے ساتھ چلی آئی تھیں۔ اگر ان کے دل میں اس شخص کے لئے کوئی جگہ ہوتی تو وہ وقار علی کی خاطر اپنے والدین کو نہیں چھوڑ دیتیں۔ مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ وقار بھی ان کی اس قربانی کو بھول گیا ہے جو بھابی نے اس کے لئے دی تھی۔ ہمیشہ کے لئے اپنے پیاروں کو کھو دیا ہے انہوں نے مگر اس نے ان کی قدر نہیں جانی اور محض چند بے بنیاد باتوں کے بل بوتے پر ان کے سر پر سے آسمان اور قدموں تلے سے زمین کھینچ لی۔ شاباش ہے تم پر وقار علی! اور آج مجھے اس قربانی پر افسوس ہو رہا ہے جو میں نے تمہاری اور بھابی کی شادی کی خاطر دی تھی۔ اگر اس وقت میں فوزیہ کو اپنانے سے انکار کر دیتا تو آج شاید حالات کچھ اور ہی ہوتے۔''

اس کے ہر لفظ سے دکھ اور نا اُمیدی جھلک رہی تھی۔

جس کی خوشی کی خاطر اعزاز علی نے اپنی زندگی بھر کی خوشیاں داؤ پر لگا دی تھیں، وہ آج خود اپنی مرضی سے آگ کے جلتے الاؤ میں کودنے کو تیار بیٹھا تھا۔

اعزاز علی اکتا کر باہر نکل گیا۔

''پتہ نہیں سب مجھے ہی کیوں غلط سمجھتے ہیں۔ میں نے تو اپنے بچے کی بھلائی سوچ کر یہ سب اسے بتایا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ہر کوئی مجھ ہی کو الزام دینا شروع کر دے گا۔''

بے جی نے دوپٹے کا پلو منہ پر ڈال کر رونا شروع کر دیا تو وقار علی اپنی پریشانی بھول کر انہیں سنبھالنے لگا۔

وہ کمرے میں آیا تو صدیقہ بھابی اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

وقار علی نے ان کی ناراضگی کو شدت سے محسوس کیا تھا۔ مگر فی الوقت تو وہ تابندہ کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس نے دیکھا وہ آنکھوں پر بازو رکھے شاید سو رہی تھی یا پھر اسے دیکھ کر خود کو سویا ہوا ظاہر کر رہی تھی۔

اسے پشیمانی کا تند و تیز احساس اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔

اعزاز علی کی باتوں نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسے خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے فوزیہ اور بے جی کی باتوں پر یقین کیسے کر لیا تھا۔

کرسی گھسیٹ کر بستر کے قریب کرتے ہوئے وہ آگے جھک کر بیٹھا اور نرمی سے اس کی کلائی تھام کر اس کا بازو ہٹانے کی سعی کی تو وہ ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''آئی ایم سوری تابی! پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا؟'' وہ بے حد شرمندہ دکھائی دے رہا تھا۔

تابندہ کی آنکھوں میں دکھ کروٹیں لینے لگا۔ نس نس میں جیسے پھر سے وہی اذیت دوڑ اٹھی جس نے اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا تھا۔ وہ سراپا اظہار ندامت بنا بیٹھا تھا۔ مگر اس نے اپنے دل میں وقار علی کے لئے ذرہ برابر بھی نرمی محسوس نہیں کی تھی۔

''مگر میں اچھی طرح جانتی ہوں وقار علی! آپ کو کیا ہو گیا ہے۔'' غیر متوقع طور پر وہ بے حد صاف آواز میں بولی تھی۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ جس کے انداز و الفاظ اسے کسی عجیب سے احساس کا شکار بنا گئے تھے۔

''وہ سب آپ کے اندر کی باتیں تھیں۔ وہ تمام خیالات جو آپ میرے بارے میں رکھتے ہیں اور میرا جو کردار آپ نے اپنی نظروں میں تراش رکھا ہے، آپ کے نزدیک میں اب ایک ایسی ناقابل اعتبار عورت ہوں جس نے اگر آپ کی خاطر اپنے محبت کرنے والے والدین کو چھوڑ دیا تھا تو پھر کسی اور کی خاطر آپ کو بھی چھوڑ سکتی ہوں۔'' وہ

عجیب سے انداز میں کہہ رہی تھی۔ وقار علی نے اس پل اپنے آپ کو بہت چھوٹا ہوتے محسوس کیا تھا۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو نابی......''

اس نے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی مگر وہ اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر بولی تو اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمکینی گھلی ہوئی تھی۔

''میں بالکل ٹھیک سمجھ رہی ہوں وقار! یہ دنیا مکافاتِ عمل ہے۔ میں نے اپنے جان سے زیادہ محبت کرنے والے والدین کو شدید تکلیف پہنچائی تھی۔ بالکل وہی تکلیف، وہی ذلت کل میں نے بھی برداشت کی ہے۔ میں محسوس کرسکتی ہوں کہ ان لوگوں پر کیا بیتی ہوگی، جب لوگوں نے انہیں ایسے طعنے دیئے ہوں گے۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ انہوں نے اس صدمے کو کیسے برداشت کیا ہوگا۔ مگر خدا نے بہت جلدی یہ سب کردیا نا، بہت جلدی۔ میں نے تو ابھی ٹھیک طرح سے تمہاری محبتوں کو برتا بھی نہیں تھا وقار! کہ تم نے اپنا چولا اتار کر ایک اجنبی اور خوف زدہ کردینے والا روپ میرے سامنے لارکھا۔ مگر شاید یہی میری کرنی کی سزا ہے۔ یہ دنیا مکافاتِ عمل ہے وقار!''

اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبتی چلی گئی۔

شدید ترین احساسِ ندامت اور ذلت کا شکار وقار علی پسینوں میں ڈوب گیا تھا۔

✿......✿

کسی خوش نگاہ سی آنکھ نے
یہ کمال مجھ پہ کیا
میری لوحِ جاں پہ رقم کیا
وہ جو ایک چاند سا حرف تھا
وہ جو ایک شام سا نام تھا
اسے گلستاں کا پتہ دیا
میرا دل کہ شہرِ ملال تھا
اسے روشنی میں بسا دیا
میری آنکھ اور میرے خواب کو
کسی ایک پل میں بہم کیا
میرے آئینوں پہ جو گرد تھی مہ و سال کی
وہ اُتر گئی
وہ جو دھند تھی میرے چار سُو، وہ بکھر گئی
سبھی روپ عکسِ جمال کے
سبھی خواب شامِ وصال کے
جو غبارِ وقت میں سر بسر تھے اٹے ہوئے
وہ چمک اٹھے
جو یقین سے بھی حسین تھا
مجھے ایک ایسا گماں دیا
وہ جو ریزہ ریزہ وجود تھا
اسے اک نظر میں بہم کیا
کسی خوش نگاہ سی آنکھ نے
یہ کمال مجھ پہ کیا

ایڈی کا یہ اعتراف اس کے لئے نیا ہرگز نہیں تھا۔ اس سے پہلے یہی بات وہ زارا سے سن چکی تھی مگر یوں ایڈی کے منہ سے وہی بات سننا، وہ پوری ذات سے ہل کر رہ گئی تھی۔

فون رکھ کر اس نے تپتے رخساروں کو ہتھیلیوں سے ڈھانک لیا۔ درحقیقت وہ ایڈی کے اس اعتراف کے بعد خائف ہوگئی تھی۔ ایک ایسا شخص جو شروع ہی سے اس کے لئے دنیا میں واحد دشمن کی حیثیت رکھتا تھا، یکلخت ہی تمام رشتوں کے معنی بدل گیا تھا۔ اس کے متعلق ذہن میں موجود تمام سوچیں تو ختم ہو ہی گئی تھیں مگر آنِ واحد میں جو اس نے روپ بدلا تھا، وہ صبیرہ کو ہراساں کر گیا تھا۔

'کب سے، نجانے کب سے۔ اور مجھے کبھی احساس تک نہیں ہوا۔'

وہ بے یقینی کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ پھر ذہن میں ایک کوندا سا لہرایا۔ ''کہیں ان آنکھوں سے جھلکتی برہمی کے ساتھ اس عجیب سی آنچ دیتی کیفیت کا یہی مطلب تو نہیں تھا؟ میں ہی اسے سمجھ نہ پائی ہوں۔''

وہ بوجھل قدموں سے چلتی اندر کمرے میں آگئی جہاں وہ دونوں محوِ خواب تھیں۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا تو وہاں ایک عجیب مگر نامانوس سی کیفیت کو کروٹیں لیتے پایا مگر اس کا ماخذ وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

گھبرا کر اس نے شفق اور زارا کو جگا دیا۔

اتنی لیٹ سونے کے بعد یوں صبح سویرے جگائے جانے پر زارا کافی بدمزہ ہوئی تھی۔ شفق بھی نیند کے جھونکوں کی زد میں تھی مگر تفصیل سن کر ان دونوں کی نیند اڑن چھو ہو گئی۔

''یہ سب تم سے ایڈی نے کہا ہے؟'' زارا کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ اس نے نروس انداز میں انگشتِ شہادت کا ناخن چباتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تو شفق نے چڑ کر اس کا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

''اس میں اتنی عجیب بات تو کوئی نہیں ہے۔ وہ بھی انسان ہی کا بچہ ہے۔''

''تم نے جواب میں کیا کہا؟'' زارا کو بے قراری لگی ہوئی تھی۔ شفق بھی جواب طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''میری تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا۔'' وہ الجھن بھرے لہجے میں بولی۔

''مجھے پتہ ہے۔ دل کی دھڑکن برق رفتاری سے چل رہی ہوگی۔ کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آرہی ہوں گی، ہاتھ لرز رہے ہوں گے اور ٹانگیں کپکپا رہی ہوں گی۔'' زارا نے بڑے اطمینان سے مسکراتے ہوئے نقشہ کھینچا تھا۔ صبیرہ کے ساتھ ساتھ شفق نے بھی اسے گھور کر دیکھا۔

''یہ کون سے تجربے بول رہے ہیں؟''

''جب ثوبان نے مجھ سے ایسا کچھ کہا تھا تب میرا بھی یہی حال ہوا تھا۔'' وہ شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

شفق نے تاسف سے سر ہلایا اور صبیرہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

اگر کسی کی محبت دل میں بیج بو کر اپنے جذبوں کی بارش سے اس کی آبیاری شروع کردے تو پیار کے گلاب، چہرے پر لہلہاتے دکھائی دیتے ہیں مگر صبیرہ کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

''اپنے دل کو ٹٹولو صبی! ایسے موقع پر اپنے دل سے زیادہ سچی گواہی اور کسی کی بھی نہیں ہوتی۔'' اس نے نرمی سے کہا تھا۔

''پتہ نہیں شفق! میری عقل حیران ہے۔'' وہ بے بسی سے بولی۔ پھر قدرے توقف کے بعد مجرمانہ انداز میں انہیں بتانے لگی۔

''میں نے تو شروع ہی سے کبھی مرد کے کسی بھی رشتے کو محسوس ہی نہیں کیا ہے۔ میں بہت چھوٹی تھی جب میرے ابو جرمنی چلے گئے اور اب بائیس برس ہونے کو آئے ہیں مگر وہ واپس نہیں لوٹے بلکہ کوئی ٹیلی فونک یا تحریری رابطہ بھی نہیں رکھا۔ وہ نہ صرف میری ماں کے لئے ایک برے شوہر بلکہ میرے لئے ایک برے باپ بھی ثابت ہوئے۔ یوں مرد کا پہلا روپ ہی میرے لئے ایک برا تجربہ بن کر رہ گیا۔ ہر لڑکی اپنے باپ اور بھائی ہی کو معیار بناتی ہے۔ ان کی نفسیات کو سمجھنے کے بعد ہی معاشرے کے دوسرے مردوں کو سمجھ پاتی ہے، جن سے آئندہ زندگی میں اس کے مختلف رشتے جڑتے ہیں۔ اس کا شوہر، اس کے سسرالی رشتے دار وغیرہ۔ میری بدقسمتی یہ ہے کہ مجھے آئیڈیل کے روپ میں میرا باپ نہیں ملا اور میری امی نے مجھے ہمیشہ خود پر انحصار کرنے کا سبق دیا ہے۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ زندگی میں کبھی میں کسی مرد پر اس قدر اعتبار کرپاؤں گی۔'' وہ بے حد مایوسی سے کہہ رہی تھی۔

''کسی پر بھی اعتبار کرنے کے لئے اس کے کردار کی پختگی کا یقین ہونا کافی ہوتا ہے صبی!'' شفق نے سنجیدگی سے اسے سمجھانے کا آغاز کیا تھا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔ ''اسی لئے میں تمہیں کہہ رہی ہوں کہ اپنے دل سے رجوع کرو اور بنا کسی ہچکچاہٹ کے، بلاجھجک فیصلہ کرو۔ ایسے مواقع زندگی میں کبھی کبھار ہی آتے ہیں۔ جب کوئی بہت معتبر بندہ آپ کو پروپوز کرتا ہے تو اتنا زیادہ سوچ میں پڑنا فیصلے کو بہت مشکل بنا دیتا ہے۔ جتنا سوچو گی، اتنے ہی خدشات اور وہم ذہن کو جکڑیں گے۔''

صبیرہ نے سانس اندر کھینچتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

‘‘دیکھو صبی! اگر میں تمہیں ایڈی کے لئے کنونس کر رہی ہوں تو اس کا مطلب یہ بالکل بھی نہیں کہ میں تمہیں عشق و محبت کے چکر پالنے کی ترغیب دے رہی ہوں۔ اس نے اپنا پرپوزل تمہارے سامنے رکھا ہے، تمہیں پسند ہے تو موقع مت گنواؤ۔ کسی بالکل انجان شخص سے اتنا نازک رشتہ جوڑنے سے بہتر ہے کہ تم ایسے شخص کو ترجیح دو جسے تم اچھی طرح جان چکی ہو۔’’ شفق نے اسے سنبھالا دیا تھا۔

وہ مندی آنکھیں کھول کر خلا میں دیکھتے ہوئے الجھے لہجے میں بولی۔

‘‘پتہ نہیں، میرا دل اس طرح کیوں نہیں سمجھتا۔’’

‘‘سمجھنا بہت آسان ہے۔’’ شفق نے فی الفور اس کے بات کا جواب دیا۔ ‘‘اتنے سالوں سے تم خود کو ‘‘خود انحصاری’’ کا جو سبق پڑھاتی چلی آئی ہو اس کے رنگ آہستہ آہستہ ہی چھٹیں گے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے سہارے کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ دونوں کی بقا ایک دوسرے کے بغیر ناممکن ہے۔ اگر دونوں فریق اپنی انا کے جھنڈے بلند کر کے خود انحصاری کا سبق دہراتے رہیں اور ہر کوئی اپنی زندگی، اپنی جگہ اور اپنی ذات میں گزارنے لگے تو نسلِ انسانی کو فنا ہونے میں بہت دیر نہیں لگے گی۔ یہی تو فطرت کا قانون ہے اور اسی کی وجہ سے کائنات میں زندگی کا احساس باقی ہے۔ کسی بھی رشتے سے یوں نظریں چرانے کا مطلب ہے اس رشتے کی بربادی۔ رشتے بھی نازک بیل کی طرح ہوتے ہیں، جب تک پُرخلوص جذبوں کی بارش اور باہمی اعتماد کی کھاد ملتی رہے پیار و محبت کے خوش رنگ پھولوں سے سجی یہ بیل زندگی کی دیوار کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ بیل، اس میں سجا ہر پھول، ہر پتا، آپ کی پوری توجہ، محبت اور اعتماد چاہتا ہے اور اگر ان میں سے کسی بھی احساس یا جذبے کو عنقا پائے تو یہ بیل دنوں میں مرجھا کر فنا کی راہ پر گامزن ہو جاتی ہے یا دوسرے لفظوں میں اس رشتے کی موت ہو جاتی ہے۔ اور تم بھی اب تک کچھ ایسا ہی کرتی آئی ہو۔ اپنی زندگی میں سے مردوں کا خانہ تم نے نکال ہی پھینکا ہے جو قانونِ فطرت کی سراسر خلاف ورزی کے زمرے میں آتا ہے۔ ہر رشتے کا ایک مقام اور ایک حیثیت ہوتی ہے جو کہ ہر ذی روح پر فرض ہے۔ ان احکامات سے منہ موڑنا یا کوئی خود ساختہ اصول بنا کر ان پر قائم ہو جانا، کم از کم ہمارا مذہب تو اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ اور پھر کسی ایک شخص کے تجربے کو اپنی زندگی پر اپلائی کر کے اپنی من مرضی کا رزلٹ سوچ لینا کسی طور بھی دانش مندی نہیں کہلاتا ہے۔ اگر تم سوچتی ہو کہ تم اپنی پوری زندگی کسی مرد کے سہارے کے بغیر گزار سکتی ہو تو واقعی گزار سکتی ہو۔ مگر تم ان مشکلات اور مصائب کا فی الوقت اندازہ نہیں کر سکتیں جو کہ کسی بھی اکیلی عورت کو پیش آ سکتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان تنہا رہنے کا صرف سوچ ہی سکتا ہے مگر رہ نہیں سکتا۔ آخری وقت میں کوئی تو رونے والا اور کندھا دینے والا ہونا چاہئے۔’’

شفق نے حقائقِ زندگی کا دانش مندی سے تجزیہ کر ڈالا تھا۔ وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے بحرِ حقیقت میں غوطہ زن تھی۔ زارا نے کچھ کہنے کو لب وا کیے تو شفق نے آنکھ کے اشارے سے اسے خاموشی کا اشارہ دے دیا۔ وہ دلی طور پر متمنی تھی کہ صبیرہ علی اپنے بے بنیاد اور خود ساختہ ‘‘خود انحصاری’’ کے حصار سے باہر آ کر ایک نارمل انسان کی طرح زندگی بسر کرے اور اسے یہ بھی اچھی طرح خبر تھی کہ اس نے بروقت چوٹ لگائی ہے۔ فی الحال لوہا گرم تھا۔ سو کامیابی کے امکانات بھی زیادہ تھے۔

⁂......⁂

چھوڑ بابل کا گھر

موہے پیا کے نگر

آج جانا پڑا

بیٹی چاہے ایک کمرے سے بیاہ کر دوسرے کمرے ہی میں کیوں نہ جا رہی ہو، پرائے ہو جانے کا احساس ماں باپ کے دل میں جاگزیں ہو ہی جاتا ہے۔ یہی حال زارا کا بھی تھا۔ میکہ اور سسرال بالکل ساتھ ساتھ ہونے کے باوجود پہلے نکاح کے وقت اور پھر رخصتی کے وقت ماحول خود بخود سوگوار سا ہو گیا تھا۔ خوشی کی ہر چہچہاہٹ پر اس سمے جدائی کی یاسیت اپنا ڈیرہ ڈالنے لگی تو نہ چاہتے ہوئے بھی کئی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ایسے میں ایڈی کی متفکرانہ سرگوشی، جسے تمام حاضرینِ محفل نے اچھی طرح سنا، ماحول میں پھلجھڑی سی چھوڑ گئی۔

‘‘یار ثوبان! ابھی تم لوگ دُلہن کے لئے ڈولی لائے ہو، یہاں سے گیٹ تک تو ہم بھائیوں کو ہی ڈولی اٹھانا ہے۔ ہمیں چاہئے تھا پہلے زارا کا وزن کرا لیتے۔ اس نے تو کبھی ڈائٹنگ بھی نہیں کی ہے۔’’

سب سے پہلے زارا کی ہنسی چھوٹی تھی اور پھر ماحول کی اداسی میں قدرے مزاح کا رنگ گھل گیا۔

‘‘چلو بھئی! تمہاری دوست تو رخصت ہو رہی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟’’

وہ دونوں محویت سے زارا کو ڈولی میں ‘‘گھسائے’’ جانے کا پروگرام دیکھ رہی تھیں۔ ایسے میں ایڈی کا سوال صبیرہ کو گڑبڑا ہی گیا۔ وہ اس کی شکل دیکھ کر ہنس دیا۔

‘‘میرا مطلب ہے کہ تم دونوں بھی ساتھ چلو۔’’ اس نے وضاحت کی تھی۔

‘‘ابھی آنٹی سے پوچھ لیں پھر ادھر ہی چلیں گے۔’’ شفق نے مسکرا کر کہا۔ صبیرہ غیر محسوس طریقے سے اس کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔ مگر مقابل بھی بہت زیرک تھا۔ ایڈی نے اس کی احتیاط اور گریز کے رنگوں کو فوراً بھانپ لیا تھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ آنٹی نے ان دونوں کے پوچھنے سے پہلے ہی ان کو ثوبان کے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔

‘‘بالکل، ابھی تو یہ لوگ گھر جا کر بھی ہلا گلا کریں گے۔’’ ثوبان کی امی نے فوراً ان کی تائید کی تھی۔

سب کے منع کرنے کے باوجود دولہا کی گاڑی ایڈی ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ گیٹ پر ڈولی سے زارا کو نکال کر گاڑی میں بٹھانے کے بعد ثوبان نے ان دونوں کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

‘‘چلو بھئی، یاجوج ماجوج دلہن کے آس پاس بیٹھ جاؤ۔’’ ایڈی نے فقرہ کسا۔ صبیرہ تو چپ چاپ اندر بیٹھ گئی مگر شفق نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

میرج ہال سے گھر کی طرف سفر شروع ہو گیا تھا۔

‘‘ویسے تمہارا یہ فیصلہ بہت غلط تھا یار!’’ ثوبان مایوسی سے بولا تو وہ استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

‘‘یہی یاجوج ماجوج کا پہرہ بٹھانے والا۔’’

اس کے برجستہ جملے پر ایڈی نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر داد دی تھی۔

‘‘بہت فضول ہو تم ثوبان! بلکہ شیطان بھی۔ نیکی کی پری ہے ہماری زارا۔ پتہ نہیں رشتہ کرتے ہوئے آنٹی نے سوچا کیوں نہیں۔’’ شفق نے پورا پورا بدلہ چکایا تھا اور ثوبان کو تو ذرا سا موقع ہی چاہئے تھا۔ پورے کا پورا ان کی طرف گھوم گیا۔ آرگنزا کے سرخ جھلملاتے دوپٹے سے جھلکتے حُسن نے لحظہ بھر کو نظریں خیرہ کر دی تھیں۔

‘‘خیر سے کس بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آ رہی ہیں نیکی کی پری صاحب؟’’ اس کے شرارتی سوال پر انہیں ہنسی آئی تھی۔

‘‘بالکل بھی متاثر مت ہونا ثوبان! یہ جو تمہاری بیگم کے چہرے سے آج نور ٹپک رہا ہے نا یہ کسی نیکی کا نہیں بلکہ چھ ہزار روپے کا کمال ہے۔’’ ایڈی نے ویو مرر ‘‘درست’’ کرتے ہوئے اسے تنبیہ کی تھی۔ اس کی بات ہی ایسی تھی کہ زارا کی کسمساہٹ اور ان دونوں کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

‘‘بھئی آج کل اتنی پلیوشن ہو چکی ہے کہ اچھے اچھوں کا نور غائب ہو جاتا ہے۔’’ شفق نے ہنسی روکتے ہوئے جواب دیا۔

‘‘کچھ چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں، کسی بھی طرح کا پلیوشن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔’’ ایڈی نے مسکراتے ہوئے لہجے میں کہا تو ثوبان کی معنی خیز ہنسی بات کی گرہ کھولنے لگی۔ ویو مرر میں نہ دیکھتے ہوئے بھی صبیرہ کو اپنے چہرے پر کسی کی نگاہوں کی تپش اچھی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی ہنسی جھجک کی لپیٹ میں آنے لگی۔

‘‘یار ایڈی! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ ہر لڑکی اپنی شادی کے موقع پر اتنے پیسے خرچ کر کے بلکہ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اپنی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے۔ تو کیا یہ لڑکے کو دھوکا دینے والی بات نہیں ہے؟ صبح کو بے چارہ بیوی کا دھلا ہوا منہ دیکھ کر ڈر رہا ہوتا ہے کہ یہ کون آ گئیں؟’’ وہ سیدھے ہوتے ہوئے با آواز بلند پوچھ رہا تھا۔

‘‘بھئی ہر لڑکی کا حق ہوتا ہے حسین نظر آنا۔’’ شفق نے لڑکیوں کی سائیڈ لی تھی مگر ایڈی نے بات پکڑ لی۔

‘‘نظر آنا۔ یعنی مانتی ہو کہ لڑکی حسین ہوتی نہیں بلکہ اتنا زیادہ خرچہ کرنے کے بعد ہی حسین نظر آتی ہے۔’’

‘‘تو لڑکے کون سا پیچھے ہیں اس میدان میں۔ ابھی ثوبان کا منہ دھلواؤ تو آدھے سے زیادہ نور اس کا بھی پانی کے ساتھ بہہ جائے گا۔’’ زارا کے مسلسل ٹہوکے بالآخر صبیرہ کو زبان کھولنے پر مجبور کر گئے تھے۔

‘‘مائنڈ یور ڈیئر۔ یہ ان نیکیوں کا نور ہے جو.....’’ ثوبان نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی تو صبیرہ نے درمیان ہی میں اس کی بات کاٹ دی۔

‘‘جو کہ گنی چنی ہی ہیں اور یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آتیں۔’’

‘‘دیکھا، بہت غلط فیصلہ تھا یہ تمہارا۔’’ ثوبان نے ایڈی کو گھورا تو وہ ہنستے ہوئے پوچھنے لگا۔

‘‘کون سا؟’’

‘‘یہی یاجوج ماجوج کو ساتھ لانے والا۔ یہ تو نیکی کی پری کو گھیر کر ہی بیٹھ گئی ہیں۔’’

‘‘تاکہ اس پر کوئی شیطانی سایہ نہ پڑے۔’’ شفق نے برجستہ کہا تو ثوبان کی تلملاہٹ پر ان سب کو خوب ہنسی آئی تھی۔

⁂......⁂

پو پھوٹنے تک ان سب نے محفل سجائے رکھی بلکہ دولہا دُلہن کو مہمانِ خصوصی بنائے رکھا۔ ان میں سے کوئی بھی ثوبان کی اشاراتی دھمکیوں سے متاثر نہیں ہوا تھا بلکہ یوں انجان بن کر کوئی دوسری بات شروع کر دیتے جیسے اس کی بات سمجھے ہی نہ ہوں۔ وہ بے چارہ ان شیطانوں میں پھنس کر رہ گیا تھا، جب تک کہ خود ثوبان کی امی نے سب کو ڈانٹ کر کمروں میں نہیں بھیج دیا۔ صبیرہ اور شفق کو بھی انہوں نے وہیں روک لیا تھا۔

صبح سب کی ‘‘صبح’’ بارہ بجے سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ صبیرہ نے حواس باختہ ہو کر شفق کو جھنجھوڑ ڈالا۔

”یہ دن کا وقت ہے یا رات کا؟“ شفق نے جمائی روکتے ہوئے دریافت کیا۔

”ابھی سارا گھر سویا پڑا ہوگا۔ صبح چار بجے تو سونے کو لیٹے تھے سب۔“

”تم تو اُٹھو، زارا کے ہاں چلتے ہیں۔ فریش ہو کر آجائیں گے۔ ٹوتھ برش بھی تو اُدھر ہی پڑا ہے۔“

صبیرہ کو اُلجھن ہو رہی تھی۔ مجبوراً شفق کو اس کے ساتھ اٹھنا پڑا۔ سوائے آنٹی کے سبھی محوِ خواب تھے۔ ان کو بتا کر وہ ادھر آ گئیں، جہاں کا حال دولہا والوں سے مختلف نہیں تھا۔ صبیرہ آتے ہی واش روم میں گھس گئی جبکہ شفق دس منٹ مزید سونے کے خیال سے لیٹ گئی۔

✡ ...... ✡

ریت کی لوح پہ لکھے ہوئے دریا کی طرح
یہ جو ہر راہ کے ہمراہ چلی آتی ہے
کیسی دیوار ہے یہ؟
از ازل تا بہ ابد
خواب اور خواب کی تعبیر کے مابین جو یہ
بھاگتے وقت کی تلوار سی لہرائی ہے
کیسی تلوار ہے یہ؟
یہ جو ہر موڑ پہ رُکتے ہوئے رستے کی طرح
ڈولتے پاؤں کی زنجیر بنی جاتی ہے
کیسی رفتار ہے یہ؟
لفظ کی راہ میں، معنوں کی گزرگاہوں میں
کون سے سچ کو چھپانے کے لئے
جھوٹ اسٹیج کے پردے کی طرح حائل ہے
یہ بھی معلوم نہیں
کون ناظر ہے یہاں اور تماشا کیا ہے؟
ریت کی لوح پہ لکھے ہوئے دریا کی طرح
از اُفق تا بہ اُفق
شک کی دیوار چلی جاتی ہے
شک کی دیوار کے اس پار کا منظر کیا ہے؟
کون بتلائے مجھے!
بات کا روپ ہے کیا، بات کے اندر کیا ہے؟

وہ ابھی تک شاک کی کیفیت میں تھی۔ وقار علی کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس تھا۔ چند لمحوں کی کمزوری نے اسے ڈگمگا دیا تھا مگر تابندہ کی تو پوری ہستی ہی ڈول گئی تھی۔ وقار علی کی ندامت، اس کی معافی بھی دل کو راکھ ہونے سے نہیں بچا پائی تھی۔ ایک عورت کے پاس عزت اور کردار کی مضبوطی کے سوا ہوتا ہی کیا ہے۔ شک کا ہلکا سا دھبہ اس کی پوری عمر کی ریاضت کو دھندلا دیتا ہے۔ پھر لاکھ چارہ کرو مگر وہ چمک واپس نہیں لوٹتی جو اپنی سچائی اور معصومیت سے سب کی نگاہوں کو خیرہ کرتی رہتی ہے۔

ایک ایسا شخص جس کی خاطر وہ اپنے خون کے رشتوں کو تاعمر خوش رہنے کے دعوے کے ساتھ ٹھکرا آئی تھی، آج وہی مٹھیاں بھر بھر کر کیچڑ اس کی طرف پھینک رہا تھا۔ جس کے متعلق وہ لمحہ بھر کو بھی غلط نہیں سوچتی تھی، وہ اسے اپنی ہی نہیں بلکہ دوسروں کی نظر میں بھی ذلیل کر گیا تھا۔

اس کا سارا مان، سارا غرور پانی کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وقار علی نے شرمساری کے تمام تر احساس کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگی تھی اور وہ بس خالی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”کیا اس جرم کی کوئی معافی ہو سکتی ہے وقار؟ ایک عورت جسے چند لمحوں میں بہت برا سمجھ کر اس کے متعلق گری ہوئی ہر بات سوچی ہو، کیا وہ پھر سے چاہت اور اعتماد کے دعوے کے ساتھ سر اٹھا سکتی ہے؟ ایسی عورت دوسروں سے تو کیا خود سے بھی نظر نہیں ملا پاتی وقار علی! جس کا اعتماد پارہ پارہ ہو گیا ہو، جس کے فخر اور مان کو تاراج کر دیا گیا ہو۔ تمہاری معافی تو بہت چھوٹی شے ہے وقار، بہت چھوٹی۔ یہ تو تپتے سلگتے دل پر ہلکا سا سرد چھینٹا بن کر بھی نہیں لگ رہی۔“

اس کے بازوؤں کے آنچ دیتے آہنی حصار میں وہ سرد گلیشیر بن گئی تھی، جسے وقار علی کا کوئی بھی پُرجوش جذبہ پگھلا نہیں سکا تھا۔

”انسان خطا کا پتلا ہے تابندہ! اور پھر غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انسان انہی لمحات کا قیدی بن جائے۔ زندگی ایک جگہ منجمد ہونے کا نام نہیں ہے، یہی چھوٹی موٹی غلط فہمیاں، ان کے پس پردہ چھپی محبت کی شدتیں اور ہلچل مچاتی خوشیاں زندگی کا محرک ہیں۔ شدید محبت صرف محبت ہی کو نہیں اور بھی بہت جذبوں کو ساتھ لے کر پروان چڑھتی ہے۔ کبھی گرمی، کبھی سردی، کبھی خزاں تو کبھی بہار اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ ان تمام موسموں کو خندہ پیشانی سے سہنا اور اپنے جذبوں کی آبیاری کرتے رہنا ہی محبت کی کامیابی کا راز ہے۔ بادِ مخالف سے گھبرانا عقل مندوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔“

صدیقہ بھابی اس کی بہت اچھی دوست ثابت ہوئی تھیں۔ مخلص اور بے لوث۔ اگر وہ پاگل پن کے دوروں سے بچی تھی تو یہ انہی کی برین واشنگ کا کمال تھا۔ انہوں نے ایک پل بھی اسے تنہا چھوڑنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ ان دنوں وہ مایوسی اور یاسیت کی انتہا پر تھی۔

”یہ بہت بڑے حوصلے والوں کا کمال ہوگا بھابی! وقار کے اس روپ نے تو مجھے جیتے جی مار ڈالا ہے۔ اس شخص سے محبت کی تھی میں نے لمحوں میں جس نے میری ہستی کو ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ میرا سارا مان، میرا غرور مٹی میں ملا دیا۔ میں نے ساری دنیا کو چھوڑ کر اسے اپنے لئے چنا تھا اور اس نے چند لمحوں میں یوں کھڑے کھڑے مجھے اپنے فیصلے پر پچھتانے پر مجبور کر دیا۔“ اس کی آواز میں نمکینی اترنے لگی تھی۔

”زندگی صفحات پر لکھی تحریر نہیں ہے تابندہ! جسے مٹا کر تم اپنی من چاہی تحریر لکھ ڈالو۔ جو مقدر ہے اسے ہونا ہے۔ جو ہو گیا اس پر ہی پڑاؤ ڈال کر پچھتاتے رہنا درحقیقت مزید غلطی کی شروعات ہے۔ میاں بیوی کے رشتے میں ایسے کئی موڑ آتے ہیں جہاں بیوی کو سرنڈر کرنا پڑتا ہے۔ چاہے وہ حق پر ہی کیوں نہ ہو۔“ انہوں نے اس کی سوچ کو بدلنے کی پوری کوشش کی تھی مگر اس کا دل کچھ اس بری طرح سے ٹوٹا تھا کہ اب نہ تو اس میں ان ٹکڑوں کو سمیٹنے کی طاقت رہی تھی اور نہ ہی جوڑنے کی خواہش۔

”میں کسی کو بھی الزام نہیں دیتی بھابی! گناہ گار تو میں خود ہوں۔ میں کیوں اس وقت اپنے بے لگام جذبات پر بند نہیں باندھ پائی۔ کیسے میں نے اپنے آفاقی رشتوں کو پاؤں کی ٹھوکر میں رکھ لیا تھا۔ رخشی صحیح کہتی تھی، انسان کو اپنے دل کو مارنا ضرور آنا چاہئے۔ دل کی خواہشات درحقیقت نفس کی طمع ہوتی ہیں۔ اگر اس وقت میں اپنے دل کو مار لیتی تو آج مجھے اپنی عزتِ نفس کو نہ مارنا پڑتا بھابی!“ اس کے لہجے میں تھکن، شکستگی اور ہار تھی۔ جیسے اس نے تمام عمر جی لی ہو اور اب مزید کی ہوس باقی نہ رہی ہو۔

انہوں نے گھبرا کر اس کے سرد پڑتے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

”تم حد سے زیادہ حساس ہو رہی ہو تابندہ! میاں بیوی کے رشتے میں تو ایسی باتوں کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔ جہاں محبت ہو، وہاں چھوٹی موٹی چپقلش تو چلتی ہی رہتی ہے۔ چند لمحوں کو پوری زندگی گردان لینا محض حماقت ہے۔“

”مجھ سے بہتر اور کون اس حقیقت کو سمجھ پائے گا بھابی! یہ حماقت میں بھی کر چکی ہوں۔ اس کی محبت کے چند لمحوں کو میں نے پوری عمر پر محیط کرنے کا سوچ لیا۔ میں نے سراسر گھاٹے کا سودا کیا تھا بھابی! ”محبتوں“ پر ”محبت“ کو ترجیح دی اور ”دلوں“ پر ”دل“ کو۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ اتنی ساری محبتوں کو خفا کر کے صرف ایک محبت کو راضی رکھنا اور اتنے سارے دلوں کو توڑ کر اپنے دل کو خوش رکھنا سب سے بڑی کمینگی ہے۔ محبتوں کو ٹھکرانا، دلوں کو دکھ دینا اس سے بڑھ کر بھی کیا گناہ ہوگا بھابی! بس سزا ذرا جلدی مل گئی ہے مجھے۔“

اس کے آنسو اب چہرے کو بھگونے لگے تھے۔

”تم سراپا نااُمیدی کا شکار ہو تابندہ! اور یہ بہت غلط بات ہے۔ اُمید تو زندگی ہے۔ تم کیوں اس کی لو کو جلنے نہیں دیتیں؟“ بھابی بھی دکھ کا شکار تھیں۔ وہ جتنا اسے سمجھا بجھا کر زندگی کی طرف لانے کی سعی کرتیں، اتنا ہی وہ دل گرفتگی اور مایوسی کا شکار ہوتی تھی۔

”اس اُمید کی لو کو میں نے نہیں، وقار نے شک کی آگ سے جلا کر راکھ کیا ہے بھابی! میں تو خود اس راکھ میں چنگاری ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہار گئی ہوں۔“

”مت کیا کرو ایسی نااُمیدی کی باتیں۔ اپنا نہیں تو اپنے بچے ہی کا سوچ لو۔ خود کی خاطر جیے تو کیا جیے۔ اب تم اپنا نقصان بھول جاؤ اور اس پیارے سے نفع کے متعلق سوچو جس کی آمد میں بہت تھوڑا سا وقت باقی ہے۔ اس کے لئے پُرمحبت فضا بناؤ۔ تم لوگوں کے جھگڑے میں اس آنے والی روح کا تو کوئی قصور نہیں۔ کم از کم اس کا استقبال تو محبت اور خوشی سے کرو۔“ انہوں نے اس کا دھیان بٹایا تو وہ اپنے ہاتھ چھڑا کر چہرہ خشک کرتے ہوئے پھیکے انداز میں مسکرا دی۔

”ایک یہی خیال تو مرنے نہیں دیتا بھابی! ورنہ میں تو سراپا ندامت بن گئی ہوں۔ جینے کی خواہش ختم ہوتی محسوس ہو رہی ہے۔“

”خبردار جو کوئی فضول بات کی ہو تو۔ یہ کیسی محبت ہے جس میں معافی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؟“ بھابی نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

مگر جل بجھنے والے دل میں خوشی کی رمق کیسے پیدا ہو......

جذبے سرنو کیسے نمو پائیں......؟

وہ بھی خود کو بے بس پاتی تھی۔

وقار علی اس کے خوابیدہ جذبوں تک رسائی حاصل کرنے، انہیں چھونے اور پھر انہیں جگانے والا پہلا شخص، اس کا محبوب، وہ شخص جس کی ایک نگاہ اسے پگھلا کر پانی کر دیتی تھی۔ جس کے لو دیتے جذبوں نے اس کی دھڑکنوں کی ترتیب بدل کر رکھ دی تھی۔ جسے پا کر اس نے خود کو مکمل ہوتے محسوس کیا تھا۔ مگر پھر ایک روز جیسے جادوگرنی نے اپنی چھڑی گھما دی ہو۔ ان شیریں گفتار لبوں سے اس قدر شعلہ بار الفاظ نکلے کہ تابندہ کی روح تک جھلسا گئے۔

اس روز اسے اپنے نامکمل ہونے کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ جب نہ تو باپ کا شفیق سایہ نصیب ہوا تھا اور نہ ہی بہن اور ماں کی محبت بھری پناہ کہ جس میں چھپ کر، رو کر دل کا بوجھ ہی ہلکا کر لیتی۔ انسان تو رشتوں سے بندھا محبتوں میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔ فقط ایک محبت اس کی تکمیل کا باعث نہیں بن سکتی۔ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر یہ کمی اتنی شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ پھر اس کی واپسی کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ پچھتاوے کی طرف، بے بسی کی طرف۔

''محبت کرنے والے بہت خود غرض اور انتہا پسند ہوتے ہیں تابندہ! اس کی خاطر یہ کچھ بھی کر جاتے ہیں۔ وقار اتنا تنگ دل نہیں ہے کہ تم پر کسی قسم کا شک کرے۔ بس تم سے محبت نے اسے تمہارے متعلق حساس بنا دیا ہے۔ شاید اسی لئے وہ ایسی تنگ نظری کا ثبوت دے گیا ورنہ تم سے اچھی طرح اسے کون جان اور سمجھ سکتا ہے۔''

''مجھ سے زیادہ محبت کرنے والوں کی خود غرضی اور انتہا پسندی سے کون واقف ہو گا بھابی! اسی لئے، شاید اسی لئے محبت کو جائز قرار نہیں دیا گیا جو گلی محلوں اور پارکوں میں پروان چڑھتی ہے۔ یہ وہی محبت ہے جو آدمی کو انتہا پسند اور خود غرض بنا دیتی ہے کہ انسان سوائے اپنے جذبات کی آسودگی کے اور کچھ سوچتا ہی نہیں۔ مگر یہ بھی طے ہے بھابی! کہ اب میرا دل، وہ دل نہیں رہا جس میں صرف وقار علی کے نام کے دیے جلتے تھے۔ اس کے سنگ دلانہ رویے نے تو میرے دل کو جلتا دیا بنا دیا ہے، جس میں میرے ارمانوں کا تیل اور میری عزتِ نفس کے شعلے جل رہے ہیں۔ اس نے بات کرتے وقت ایک لمحے کو بھی میری انا، میری عزتِ نفس کے متعلق نہیں سوچا۔ اس کا ہر لفظ میرے اور اس کے مابین دیواریں کھڑی کرتا جا رہا تھا بھابی! اب تو ان دیواروں کے پار اس کی صورت بھی دکھائی نہیں دیتی ہے۔''

''یہ عمر بھر کا رشتہ ہے تابندہ! یونہی تو ختم نہیں ہو سکتا۔ اور پھر لڑائی جھگڑے کس گھر میں نہیں ہوتے۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہر بات کو دل پر لے لیا جائے۔'' انہوں نے اپنائیت بھری ڈانٹ کے ساتھ اسے سمجھایا تھا۔ مگر اس کے دل میں کوئی جوت نہیں جگی تھی۔

''ہر معاملہ، ہر مسئلہ انتہا پسندی کا متقاضی نہیں ہوتا تابندہ! اب تم دونوں صرف اپنے متعلق سوچنا چھوڑ کر اپنے آنے والے بچے کے متعلق سوچو، جسے صرف ماں یا صرف باپ نہیں بلکہ والدین کی ضرورت ہو گی۔ تم لوگوں کی محبت کی نشانی۔''

''ہاں۔'' اس نے سینے میں دبی آہ خارج کرتے ہوئے دھواں ہوتی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔ ''ایک یہی تو نشانی رہ گئی ہے اس گم گشتہ محبت کی۔ باقی تو صرف سمجھوتہ ہی بچا ہے یا پھر گزرنے والے طوفان کی تباہیوں کے نشان باقی ہیں۔'' وہ پھر سے انتہا پسندی کے آخری مقام پر جا کھڑی ہوئی تھی اور جذباتیت کے پیروکار ہمیشہ ہی نقصان اٹھاتے ہیں۔ چاہے چھوٹا نقصان ہو یا بڑا۔ چاہے صدیقہ بھابی کی مخلصی ہو یا وقار علی کی محبت۔ وہ اپنی ذات کے قفل اتنی مضبوطی سے بند کر بیٹھی تھی کہ کوئی بھی چابی ان قفلوں کو کھول نہیں پا رہی تھی۔ اعتماد کا سلیقہ بھول گئی تھی۔

''آئی ایم سوری بھابی!'' اعزاز علی تو اس کے سامنے نظر نہیں اٹھا پا رہا تھا۔ وہ پھیکے انداز میں مسکرا دی، شاید قسمت کی ستم ظریفی پر۔

''آپ کا بھلا اس سارے قصے میں کیا قصور ہے۔ یہ تو میری قسمت کی خرابی تھی۔''

مگر اعزاز علی اتنی آسانی سے چپ بیٹھنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے فوزیہ کی اچھی خاصی کلاس لے ڈالی تھی۔ مگر وہ دبنے والوں میں سے نہیں تھی اس لئے اپنی پشت پر ہمہ وقت بی جان اور بے جی کے ہاتھ دھرے محسوس ہوتے تھے۔ وہ کس کھاتے میں سر جھکاتی، سو اب بھی شیرنی کی طرح غرائی تھی۔

''تمہیں اس غیر عورت کا اس قدر درد اٹھ رہا ہے کہ تم اپنی بیوی سے اس کی حمایت میں الجھ رہے ہو؟''

اس قدر بدتمیزانہ انداز گفتگو اعزاز علی کو دانتوں پر دانت جمانے پر مجبور کر گیا۔ وہ بے حد ٹھنڈی طبیعت کا مالک تھا مگر یہ بھی فوزیہ جیسی عورت کا کمال تھا جو لمحوں میں مقابل کو تپا کر رکھ دیتی تھی۔

''وہ غیر عورت نہیں بلکہ میری بھابی ہے، میرے بھائی کی بیوی ہے۔''

''اچھا......'' اس نے تمسخرانہ نظروں سے اعزاز علی کو دیکھتے ہوئے فضا میں طنزیہ ہنسی بکھیری تھی۔ ''جس بھائی کی بیوی ہے، اس کی محبت اتنا جوش نہیں مار رہی جتنا کہ اس کے دکھ پر آپ تڑپ رہے ہیں۔''

''بہت گھٹیا ذہنیت ہے تمہاری۔ کسی رشتے کی حرمت کا احساس نہیں ہے تمہیں۔'' اس کی کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔ غصے سے رنگت تمتما اٹھی تھی۔

''یہ احساس مجھ سے زیادہ تمہیں ہونا چاہئے اعزاز علی! اور میں نے تو کوئی خاص اعتراض نہیں کیا۔ تمہارے بھائی ہی کو تمہارا اس کی بیوی کے ساتھ فری ہونا پسند نہیں تو میرا کیا قصور ہے اس میں؟'' وہ بڑی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔ اعزاز علی کا دماغ گھوم گیا۔

کس قدر غلاظت میں لتھڑا دماغ تھا اس عورت کا۔

''یہ سب تمہارے گندے ذہن کی کارستانی ہے۔ تمہی نے بے جی کو بے بنیاد شکوک کا شکار بنایا ہے۔ مگر اتنی بات سمجھ لو فوزیہ! اگر وقار کا گھر برباد ہوا تو آباد تم بھی نہیں رہو گی۔'' وہ پھٹ پڑا تھا۔

''اہمیت گھروں کے آباد ہونے کی نہیں، دل کے آباد ہونے کی ہوتی ہے۔ اور میں تو پہلے ہی دل برباد لئے ہوئے ہوں اعزاز علی! اور کیا برباد کرو گے مجھے؟'' وہ ہر طرح سے مطمئن تھی۔

''جب وقت آئے گا تو تمہیں اس بربادی کا بھی بہت اچھی طرح سے اندازہ ہو جائے گا۔'' وہ اپنی فطرت کے ٹھنڈے پن کی وجہ سے مجبور تھا ورنہ شاید ابھی کوئی انتہائی فیصلہ کر ڈالتا۔

٭......٭

بہت دنوں کے بعد آج وہ وقار علی کے ساتھ کہیں جانے کے لئے نکلی تھی، وہ بھی وقار کے شدید اصرار پر۔ یہیں ٹاؤن ہی میں اس کے کسی دوست نے اپنی پروموشن کی سلیبریشن پارٹی رکھی تھی۔ ویک اینڈ پر وقار آیا تو اس نے تابندہ کو ساتھ چلنے پر مجبور کر دیا۔

''پلیز وقار! میری حالت دیکھیں۔ اتنے بھرے سراپے کے ساتھ میں کہیں نہیں جا سکتی۔'' اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

''فضول مت بولو۔ تم آج کل پہلے سے زیادہ خوب صورت دکھائی دے رہی ہو۔ بلکہ تم ساتھ چلو گی تو میری خوبصورتی میں بھی اضافہ ہو گا۔'' وہ خوشامدانہ انداز میں کہتا اسے ہنسا گیا تھا۔ ''بس اب تم فوراً تیار ہو جاؤ۔'' اس کی ہنسی پر وہ مزید بضد ہوا تو تابندہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی ضد ماننی ہی پڑی تھی۔

''اچھا ہے۔ طبیعت پر خوشگوار اثر پڑے گا اس چھوٹی سی تفریح کا۔'' صدیقہ بھابی نے سراہا تھا۔

اور واقعی پوری پارٹی کے دوران وقار علی کے دوستوں کی بیویوں کے ساتھ خوش دلی سے گپ شپ لگاتے اس کے ذہن پر چھایا جمود کافی حد تک ہٹ گیا تھا۔

اس کی طبیعت کی اس شگفتہ سی تبدیلی کو وقار علی نے بھی شدت سے محسوس کیا تھا اور واپسی پر گاڑی میں اس کا اظہار بھی کر دیا۔

''میں تو ترس کر رہ گیا تھا تمہاری اس ہنسی کو۔''

''خیر اب ایسا بھی کال نہیں پڑ گیا میری ہنسی کا۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ اس کے رخساروں کی تمتماہٹ اور آنکھوں کی جگمگاتی روشنیاں اس کے سادہ سے روپ کو بھی چکا رہی تھیں۔ بڑھتی سردی کے باعث وہ دبکے کے ہلکے سے کام سے سجے ویلوٹ کے بلیک سوٹ اور شال میں ملبوس تھی۔ گہری ہوتی رات کے سفر میں یہ ساتھ وقار علی کی زندگی کا جیسے یادگار سفر تھا۔ اس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ کی گرفت میں لے کر اسٹیئرنگ پر رکھ لیا۔ وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ آج بہت دنوں کے بعد طبیعت میں لطیف سا ہلکا پن اُترنے لگا تھا۔

''دیکھ کیسا عجب ہوا، ترا میرے ہاتھ کو تھامنا
رنگ اُبھرے ہیں میرے اندر کئی چراغ جل اُٹھے''

کہتے ہوئے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے وہ مسکرا رہی تھی۔ وقار علی کے روم روم میں جیسے دل دھڑکنے لگا۔ کتنے دنوں کے بعد وہ یوں فریش دکھائی دی تھی۔

''ہے جنوں تری دید کا، تجھے دیکھتے ہی اک نظر
یوں ہوا ہے کہ پانی پر، کئی چراغ جل اُٹھے''

وہ بے ساختہ بولا تھا۔

کتنے دنوں کے بعد تو اس کا یہ روپ دیکھا تھا۔ کتنی اپنی اپنی سی لگ رہی تھی وہ۔ ورنہ کچھ عرصے سے تو ایک عجیب سا بیگانہ پن اور سرد مہری دونوں کے مابین در آئی تھی۔

جواباً اس کی مہکتی ہنسی گاڑی کی فضا میں کھنک اٹھی تھی۔

''محبتوں کے یہ دریا اُتر نہ جائیں کہیں
جو دل گلاب ہیں زخموں سے بھر نہ جائیں کہیں
یہ رنگ چہرے کے اور خواب اپنی آنکھوں کے
ہوا چلے کوئی ایسی بکھر نہ جائیں کہیں
جھلک رہا ہے جن آنکھوں سے اب وجود مرا

''اب نہیں تابی! محبتوں کے یہ دریا تو بس منہ زور سیلاب کی طرح بڑھتے ہی چلے جائیں گے اور دل کی کھیتیوں میں صرف محبتوں کے گلاب ہی کاشت ہوں گے۔ تمہارے ان رنگوں اور حسین خوابوں کو میں کبھی بکھرنے نہیں دوں گا۔ ان آنکھوں میں ہمیشہ سے تمہارا عکس تھا اور دمِ آخر تک رہے گا۔ تم سے بچھڑنا تو موت ہے تابی!'' وہ بے حد جذباتی ہونے لگا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے تابندہ وقار علی اس کے لفظوں کو سچ اور جھوٹ کے پلڑوں میں تول رہی تھی۔ ذہن و دل اور یقین کے مابین اٹھ کھڑی ہونے والی دیوار میں شگاف ڈالنے کی سعی کر رہی تھی۔ اور اس کے اندر مچی کشمکش سے بے خبر وقار علی اسے اپنے جذبوں کی حسین داستان سنا رہا تھا۔

اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ اس نے ہر طرف سے کان بند کر کے جینا سیکھ لیا تھا۔

وقت بہت بڑا اُستاد ہے۔

اس کا ہر امتحان ایک سرپرائز ہوتا ہے۔ کبھی کبھار تو یہ ان دیکھے، ان سوچے حالات کو سامنے لا کھڑا کرتا ہے اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ گم گشتہ لمحات کو پھر سے دہرا کر دل کے زخم ہرے کر دیتا ہے۔ تابندہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی کھیل کھیلا تھا اس وقت نے۔ وہ بہت کسلمندی سے اپنے بستر پر دراز ثریا کو جھاڑ پونچھ کرتا دیکھ رہی تھی۔

''الماری کے نچلے خانے میں، میں نے تمہارے لئے دو سوٹ نکال کر رکھے ہیں ثریا! وہ بھی لے جانا۔'' تابندہ نے کہا۔ ''وہ یہ مہربانیاں اکثر کرتی رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ثریا کی اس کے ساتھ کافی بننے لگی تھی اور وہ اکثر گھر میں چلنے والے مسائل سے اسے آگاہ کرتی رہتی تھی جن سے اپنی لاپرواہ طبیعت کے باعث وہ انجان ہی رہتی تھی۔

ثریا نے اشتیاق کے مارے اسی وقت الماری کھول کر نچلے خانے میں سے شاپر نکال کر دونوں سوٹ دیکھ لئے۔

''ہاں، بہت سوہنے ہیں بی بی جی!'' اس نے باچھیں پھیلائیں تو تابندہ مسکرا دی۔

''تم میرے لئے دعا کیا کرو۔ وقت آئے گا تو بالکل نیا سوٹ خرید کر دوں گی۔''

''بی بی جی! میں تو ہر ویلے (وقت) آپ کے لئے دعا کرتی رہتی ہوں۔ آپ جیسی میٹھی طبیعت تو اس پوری حویلی میں کسی ہور کی نئیں۔'' اس نے فوراً اپنی وفاداری کا ثبوت دیا تھا۔

''اچھا۔'' وہ اس کی خوشامدانہ ادا سے محظوظ ہوئی تھی۔ تب وہ رازدارانہ انداز میں اس کے قریب آ بیٹھی۔

''سب سے کوڑی (کڑوی) طبیعت تو فوزیہ بی بی کی ہے۔ توبہ میری۔'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اوپری دانتوں کو زبان لگاتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں ہاتھوں سے کانوں کو چھوا تھا۔ پھر ہمدردانہ انداز میں بولی۔ ''آپ سے تو پکی دشمنی پالی ہوئی ہے انہوں نے۔ ہر ویلے بے جی کو آپ کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہیں۔ اس دن بھی جب آپ کے پروہنے (مہمان) آئے ہوئے تھے تو انہوں نے ہی بے جی کے کان بھرے تھے۔ بے جی بیچاری سیدھی سادی، ان کی چکر بازی کو سمجھ ہی نہیں پائیں۔ آپ کے بھائی کو انہوں نے منگیتر بنا دیا۔ بے جی بیچاری تو اپنے بیٹے کی محبت میں آپ سے الجھ گئیں۔ اصل چکر تو فوزیہ بی بی نے چلایا تھا، صرف آپ کو بدنام کرنے کے لئے۔''

اس کا دماغ سنسنا اٹھا تھا۔

زخمی انا اپنی بچی کھچی طاقت کے ساتھ پھر سے پھنکار اٹھی تھی۔

''کیوں؟''

''سیدھی سی بات ہے۔ آپ نے ان کی جگہ جو لے لی ہے۔ وقار باؤ کے ساتھ ان کا رشتہ جو طے تھا۔ اس روز انہوں نے بے جی کے سامنے آپ کے خلاف بڑی گندی باتیں کی تھیں۔ توبہ میری۔'' ثریا نے اپنے مخصوص انداز میں پھر سے کانوں کو چھوا تھا۔

اور تابندہ نے خود کو پھر سے ان پُر اذیت لمحوں کی قید میں پایا جنہوں نے اس کی خوشگوار زندگی میں کانٹے ہی کانٹے بکھیر دیئے تھے۔

''تم نے یہ سب وقار کو کیوں نہیں بتایا؟'' تابندہ نے سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ تختی سے پوچھا تو وہ مسکین انداز میں بولی۔

''مجھ سے کسی نے کچھ پوچھا ہی کب تھا تابندہ بی بی! پھر میری ایسی مجال کہاں کہ حویلی کے معاملات میں دخل دوں۔''

''مگر اب تم سب کچھ بتاؤ گی۔ وہ بھی سب کے سامنے۔'' وہ بے لچک انداز میں بولی تھی۔ اس نے اپنے اندر عجیب سی طاقت کو اُمڈتے محسوس کیا تھا۔

''یہ داغ بھی دھل ہی جائے تو بہتر ہے وقار علی۔ کم از کم کچھ چہروں پر سے معتبری کے نشانات تو مٹ جائیں گے، ان کی اصلیت تو سب پر واضح ہو جائے گی۔ تب شاید میری عزتِ نفس بھی کھل کر سانس لینے لگے۔''

''اچھا بی بی جی۔'' ثریا گواہی کے لئے جی جان سے تیار تھی۔

تابندہ نے پانچ سو کا نوٹ اس کی مٹھی میں دبا دیا۔ کمرے میں داخل ہوتے وقار علی نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

''ثریا بی بی پر بہت مہربانیاں ہو رہی ہیں بھئی۔''

''ظاہر ہے میرا اتنا خیال جو کرتی ہے۔'' ثریا کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے تابندہ نے خوشگوار انداز میں کہا تو وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے، آج بہت خوش ہو؟''

''اچھی نہیں لگ رہی کیا؟'' اسکے ہونٹوں پر ان چھوئی سی مسکراہٹ جگمگا اٹھی تھی۔

''اچھی تو اتنی لگ رہی ہو کہ اٹھا کر آنکھوں میں بسا لینے اور دل میں چھپا لینے کو جی چاہ رہا ہے۔'' اس کا ہاتھ تھام کر وہ خوشنما سی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

محبت، محبت، محبت

یہی تو ایک اٹل حقیقت ہے اس کائنات کی۔

کس شے کو ابدیت نے دوام بخشا ہے سوائے محبت کے۔ ہر چیز کھنڈر ہو جاتی ہے سوائے محبت کے۔

محبت تو چتوں کی سائیں سائیں کی طرح ہوتی ہے۔ نہ دکھائی دیتی ہے نہ پکڑ میں آتی ہے بس اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔

وہ دونوں بھی اس کے نرم گرم حصار کی گرفت میں تھے۔

تابندہ خوش تھی کہ وہ سب کے سامنے اپنی بے گناہی اور فوزیہ کی بدنیتی ثابت کرنے والی تھی اور وقار علی اپنے آپ میں مطمئن تھا کہ تابندہ گزری ہر بات کو بھلا کر شاہراہ زندگی پر اس کی محبتوں کے جلو میں محوِ سفر ہے۔

رات کھانے کی میز پر تابندہ نے بہت غیر یقینی طور پر ثریا سے حقیقت آشکار کرنے کی فرمائش کر ڈالی تھی۔

وقار علی دنگ سا اسے دیکھ رہا تھا، جواب بھی بہت مطمئن اور پُرجوش سی لگ رہی تھی۔

''کیا مسئلہ ہے پتر! کھل کے بات کرو۔''

ابا جی گھر کے ''خواتینی'' مسائل میں کم ہی دلچسپی لیتے تھے۔ اس سارے معاملے سے بھی لاعلم تھے۔ نرمی سے تابندہ کو بڑھاوا دیا تو اس نے ثریا کی طرف اشارہ کیا۔

''اس سے پوچھیں ابا جی! جو سارے معاملے کی گواہ ہے، آنکھوں دیکھنے والی بھی اور کانوں سننے والی بھی۔''

فوزیہ نے جلبلا کر اس پر وار کیا تھا۔

''تو یوں کہو کہ تم نے گھر میں جاسوس پال رکھے ہیں۔ ہاں جی، ہر وقت تمہارے خلاف پالیسی ہی تو بنتی رہتی ہے یہاں۔''

''یہ تو تمہیں ابھی پتہ چل جائے گا۔ اس نے خود تمہیں وہ گھٹیا گفتگو کرتے سنا تھا جو تم احسن کے اور میرے متعلق کر رہی تھیں۔ تم ہی نے ساری غلط فہمیاں پیدا کی تھیں۔ کیونکہ تم کبھی بھی مجھے اس گھر میں خوش نہیں دیکھ سکتیں۔'' تابندہ نے تلخی سے کہا تو وہ بھڑک اٹھی۔

''دیکھ رہی ہیں آپ بے جی؟''

''یہ کیا ہو رہا ہے تابندہ! کیا مسئلہ ہے؟'' وقار حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

صدیقہ بھابی اور بھایا بھی پریشانی سے سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے۔

''جب سب معاملہ ختم ہو چکا ہے تو یہ نیا تماشہ گھڑنے کی کیا ضرورت ہے؟'' بے جی کو غصہ آیا تھا۔ پہلے ہی بمشکل انہوں نے اپنے غصیلے جذبات کو تھپک تھپک کر سلایا تھا، اب وہ ایک نیا قضیہ کھڑا کر رہی تھی۔

''کیا سنا تم نے حرام خور! اب بولتی کیوں نہیں۔ کیا پٹی پڑھائی ہے اس نے تمہیں؟'' فوزیہ لرزتی، کپکپاتی ثریا پر الٹ پڑی تو وہ گھگھیانے لگی۔

''مجھے کچھ نہیں پتہ۔ اللہ پاک کی قسم لے لو جو میں نے کچھ سنا بھی ہو۔''

''ایک لفظ بھی جھوٹ کہا تو میں زبان کاٹ ڈالوں گا تمہاری۔'' اعزاز علی غرایا تو وہ اپنی چندی چندی آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔

''میں تو جی اس حویلی کی نوکر ہوں۔ نمک کھایا ہے میں نے آپ سب کا۔ میں کیوں جھوٹ بولوں گی۔ میری زبان جل جائے، جسم میں کیڑے پڑ جائیں۔ مجھے تو تابندہ بی بی نے پانچ سو روپے دیئے تھے کہ میں فوزیہ بی بی اور بے جی کے خلاف باتیں کروں۔ پر میری ہمت نہیں پڑی۔ میں نمک خوار بھلا ایسی جرأت کیسے کر سکتی ہوں؟'' کانپتے ہاتھوں سے دوپٹے کے کونے سے بندھا مڑا تڑا سا پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے وہ فرمانبرداری کا ایک نیا باب لکھ رہی تھی۔

فوزیہ کی نگاہوں میں جیت کی چمک اتر آئی۔ اس کی خاموش نگاہوں سے جھلکتی شاباشی ثریا نے خاموشی ہی سے وصول کر لی تھی۔

''تم ...... تم گھٹیا ذلیل عورت، اتنا بڑا کھیل کھیلا ہے تم نے میرے ساتھ۔'' چکراتے سر کے ساتھ وہ ثریا پر الٹ پڑی تھی جو بے جی کے پیروں پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ مگر کیا کیا جائے کہ بازی ہی اُلٹ چکی تھی۔

’’بس کرو بہو! وقار علی! اسے کمرے میں لے جاؤ۔‘‘ بے جی کا انداز بے حد سرد مہری لئے ہوئے تھا۔
’’یہ کیا تماشہ تھا تابندہ؟‘‘ وقار علی ابھی تک محوِ حیرت تھا۔ کمرے میں آ کر اس سے الجھنے لگا۔ مگر وہ کیا کہتی۔ ہر بات تو ریت کی طرح ہاتھ سے پھسلتی چلی گئی تھی۔
’’میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ ثریا نے مجھے خود بتایا تھا کہ کس طرح فوزیہ نے اس روز......‘‘ اس کے لب و لہجے میں کوئی کمزوری، کوئی ناطاقتی نہیں تھی۔ مگر وقار علی کا جتانے والا انداز اسے بے ہمت کر گیا۔
’’میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں ثریا کو پانچ سو روپے دیتے دیکھا ہے اور بس۔‘‘
پھر اس روز تابندہ نے جھوٹ، سچ کے ہر دروازے کو بند کر دیا تھا۔

میرے چارہ گر
میرے درد کی تجھے کیا خبر
تُو میرے سفر کا شریک ہے
نہیں ہم سفر
میرے چارہ گر میرے ہم سفر
تیرے ہاتھ سے میرے ہاتھ تک
وہ جو ہاتھ بھر کا تھا فاصلہ
کئی موسموں میں بدل گیا
اسے ناپتے اسے کاٹتے
میرا سارا وقت نکل گیا
یہ جو ریگِ دشتِ فراق ہے
میرے راستوں میں بچھی ہوئی
کسی موڑ پر نہ رُکے کہیں
یہ جو رات ہے میرے چار سُو
مگر اس کی کوئی سحر نہیں
نہ ہی چھاؤں ہے نہ ثمر کوئی
میں نے چھان دیکھا شجر شجر
میرے چارہ گر
میرے درد کی تجھے کیا خبر

ان کے تعلق پر بدگمانی اور بے اعتباری کی گرد کی دبیز تہ جمنے لگی تھی۔

✡......✡

محبت کوشش یا محنت سے حاصل نہیں ہوتی، یہ عطا ہے، یہ نصیب ہے بلکہ بڑے ہی نصیب کی بات ہے۔ زمین کے سفر میں اگر کوئی چیز آسمانی ہے تو وہ ’’محبت‘‘ ہے۔
اس نے کہیں پڑھا تھا مگر تب سمجھا نہیں تھا۔ اب سمجھ رہی تھی تو ایک ایک لفظ سے سیراب ہو رہی تھی۔
ولیمے کی شام ان سب نے خوب رونق لگا رکھی تھی۔
اولیو گرین بھاری کام سے مزین لہنگے اور طلائی زیورات سے سجی، مہکتی، دمکتی زارا اور گرے سوٹ میں ملبوس شوخ و شریر فقرے اُچھالتا ثوبان اس محفل کی جان تھے۔ اگلی صبح وہ دونوں شمالی علاقہ جات کی طرف نکلنے والے تھے تو اس ایک دن اور رات کو آزادی سے ’’منایا‘‘ جا رہا تھا۔
بیت بازی جاری تھی۔

’’کسی کو کیا، جو قدموں میں جبینِ بندگی رکھ دی
ہماری چیز تھی، ہم نے جہاں چاہا وہاں رکھ دی
جو دل مانگا تو وہ بولے کہ ٹھہرو، یاد کرنے دو
ذرا سی چیز تھی، ہم نے خدا جانے کہاں رکھ دی‘‘

دوسرا شعر آہ بھر کر سنانے پر ان سب نے ثوبان کا ریکارڈ لگایا بلکہ ’’بجایا‘‘ تھا۔
’’کیا ضرورت ہے اس قدر زن مریدی کی۔‘‘
فرحان نے اسے شرمندہ کر دیا تھا۔ ایڈی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔
’’بالکل ...... بھئی ضرورت ہی کیا تھی اس قدر لاپروائی برتنے کی۔ کمرے میں سو جگہیں ہوتی ہیں دل رکھنے کے لئے۔ اتنی لاپرواہ مخلوق پر اعتبار کر لیا۔‘‘
وہ شرارت سے صبیرہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جھینپ گئی۔
’’چلو بھئی اب تم لوگوں کی باری ہے۔‘‘ ثوبان نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ تمام لڑکے ایک طرف ہو بیٹھے تھے۔ زارا نے مدد طلب نظروں سے صبیرہ کو دیکھا۔ ان کے گروپ میں فقط وہی شعر و شاعری کی ابجد سے واقف تھی۔ بے حد ہمت مجتمع کرتے ہوئے اس نے اعتراف کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھ دیا۔

’’یہ کس کی یاد جاگی ہے مری بے خواب آنکھوں میں
یہ کس نے ہجر ساعت کو اُتارا موسمِ گل میں
کسی کی فتح مندی تھی مرے اعزاز کا باعث
سو میں دانستہ ہر اک شرط ہارا موسمِ گل میں‘‘

اس نے پلکیں اٹھا کر نہیں دیکھا تھا کہ مقابل کی آنکھوں میں خوشنما جذبوں کا ایک جہاں اُتر آیا تھا۔
’’بس جی۔ بیت بازی ختم۔‘‘ ثوبان نے فی الفور ہاتھ اٹھا کر اعلان کیا تو لڑکیوں نے جواباً احتجاج کیا۔
’’نون سے شعر یاد نہیں آ رہا ہو گا اس لئے میدانِ جنگ چھوڑ کر بھاگ رہے ہو۔‘‘
’’ایسی بات نہیں۔ بس جس کام کے لئے بیت بازی شروع کی تھی وہ مکمل ہو گیا ہے۔‘‘ ثوبان کی شرارت نے صبیرہ کو حواس باختہ کر دیا۔ ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ اس کے رازداں ہونے کی واضح گواہی تھی۔
وہ خود کو کوس کر رہ گئی۔
ایڈی نے ثوبان کا ہاتھ کھینچ کر نیچے بٹھا لیا۔
’’ابھی تو مقابلہ شروع ہوا ہے۔ یونہی ہتھیار کیوں ڈال رہے ہو؟‘‘
’’کچھ آتا ہو گا تو بولیں گے نا۔‘‘ زارا کا بولنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر زبان پر قابو پانے کی بھی فی الحال پریکٹس نہیں تھی۔ سو پھسل پڑی۔

’’تم بہت جاذب و جمیل سہی
زندگی جاذب و جمیل نہیں
نہ کرو بحث ہار جاؤ گی
حُسن اتنی بڑی دلیل نہیں‘‘

ثوبان کی یادداشت کے ساتھ ساتھ انداز بھی کمال تھا۔ سب کی بے ساختہ ہنسی اور داد نے زارا کو جی بھر کر تپایا تھا۔
’’چلو کسی بہانے سے ہی سہی تم نے زارا کو حسین تو مان لیا۔‘‘ شفق نے زارا کے شانوں پر بازو پھیلاتے ہوئے ثوبان کو چڑایا تھا۔
’’تم نے غور سے سنا نہیں شاید۔ میں حُسن کو اتنی بڑی دلیل نہیں مانتا۔‘‘ وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا۔
’’چلو بھئی۔ نون سے شعر۔‘‘ فرحان نے یاد دلایا تھا۔
’’نیکی کر دریا میں ڈال۔‘‘ زارا کی ایک کزن دور کی کوڑی لائی تھی۔
’’یہ شعر ہے یا شیر......؟‘‘ ثوبان نے اسے گھورا تو شفق نے مصالحانہ انداز میں کہا۔
’’او کے...... تو پھر نو نقد نہ تیرہ اُدھار۔‘‘
’’یہ سب ہار کے سگنلز ہیں۔‘‘ ایڈی نے مسکراتے ہوئے کہا تو ثوبان نے کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر دیا۔ ’’دس، نو، آٹھ، سات، چھ......‘‘
صبیرہ نے بے بسی سے شانے اچکا دیئے تو ثوبان کی زیرو تک پہنچتے پہنچتے زارا کے ذہن میں جیسے جھماکا سا ہوا تھا۔

''نہ چھڑا سکو گے دامن، نہ نظر بچا سکو گے
جو میں دل کی بات کہہ دوں تو کہیں نہ جا سکو گے''

لحظہ بھر کے سکوت کے بعد اس کے یوں فراٹے سے بولنے پر سب کی ہنسی بلند ہونے لگی تھی۔

''بہت بدتمیز ہو تم لوگ۔'' زارا خجل سی ہوگئی تھی۔

''تو تمہیں کون کہہ رہا ہے اپنے کمالات دکھانے کو۔'' صبیرہ نے ہنسی روکتے ہوئے کہا تو ثوبان نے اس کا جملہ اُچک لیا۔

''جبکہ ہم بھی اس محفل میں رونق افروز ہیں۔''

''یہ کیسے خواب سے جاگی ہیں آنکھیں
کسی منظر پہ دل جمتا نہیں ہے
جو دیکھوں تو ہر اِک جانب سمندر
مگر پینے کو اِک قطرہ نہیں ہے''

فرحان کے شعر پر سب نے سر دُھنا تھا۔

''اس قدر مایوس کن شعر کے بعد نہایت عزت و احترام کے ساتھ یہ محفل برخاست کی جاتی ہے۔'' ثوبان نے شاہانہ انداز میں کہا۔

''صبیرہ بیٹا! آپ کے لئے فون ہے۔'' زارا کی امی نے اسے آکر بتایا تو وہ حیران ہوئی۔

''کس کا فون ہے آنٹی؟''

''تمہارے گھر سے ہے۔ کوئی شائنہ بات کر رہی ہیں۔'' انہوں نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے بتایا تو وہ سر ہلاتی فون سننے چل دی۔

''کیا بات ہے، خیریت؟'' ثوبان نے پوچھا تو وہ تاسف سے بولیں۔

''صبیرہ کی امی ہاسپٹلائزڈ ہیں۔''

''اوہ نو۔''

سبھی متفکر سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ شفق تیزی سے لاؤنج کی طرف بھاگی، جہاں وہ زرد پڑتی رنگت لئے بیٹھی تھی۔

''کیا ہوا صبی؟''

''میری امی۔''

شفق نے دلاسے کے لئے اسے شانے سے لگایا تو وہ بھبک کر رو دی۔ وہ گھبرا گئی۔

''کیا بات ہوئی ہے صبی؟''

''انہوں نے بس یہی بتایا ہے کہ امی ہاسپٹلائزڈ ہیں تین روز سے۔''

''کون سے ہاسپٹل میں؟'' ایڈی نے جلدی سے پوچھا تھا۔

''یہیں...... ڈاکٹرز ہاسپٹل میں۔''

''اینی تھنگ سیریس؟''

''وہ کہہ رہی تھیں کہ اب امی ٹھیک ہیں۔''

''چلو پھر ہم لوگ بھی چلتے ہیں۔'' زارا کی امی نے آکر کہا تو وہ سبھی مستعد ہو گئے۔

''میں گاڑی نکالتا ہوں۔'' ثوبان، ایڈی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ زارا کا حلیہ ساتھ چلنے والا نہیں تھا، سو ایڈی، ثوبان اور فرحان کے ساتھ آنٹی، شفق اور صبیرہ ہاسپٹل پہنچی تھیں۔

''وزیٹنگ آورز (ملاقات کے اوقات) نہیں ہیں۔ اس لئے تھوڑا ویٹ کرنا پڑے گا۔'' ثوبان نے آکر مطلع کیا تھا۔

اسے چپکے چپکے آنسو پونچھتے دیکھ کر ایڈی نے کہا۔

''میں دیکھتا ہوں جاکر، شاید صبیرہ کو جانے کی اجازت مل ہی جائے۔''

دس منٹوں کے بعد وہ کامیابی کے مژدے کے ساتھ واپس آیا تھا۔

''کسی بھی چیز کی ضرورت ہو آنٹی سے پوچھ لینا، ہم یہیں ہیں۔'' ایڈی نے کہا تو وہ تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھتی اندر چلی گئی۔

اور پھر سب خیریت ہی رہی۔ مگر وہ روئے چلی جا رہی تھی۔

''شائنہ! میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ اس لڑکی کو مت بتانا۔'' وہ خفا ہونے لگیں۔ شائنہ بھابی نے صبیرہ سے شکایت کی تھی۔

''اپنڈکس پھٹ گیا تھا، کافی پرابلم ہوگئی تھی۔ اسی لئے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرانا پڑا۔ مگر یہ تو کسی بات کو سیریس لیتی ہی نہیں ہیں۔'' انہوں نے سیب کاٹ کر پلیٹ ان کے آگے رکھی تھی۔ شائنہ کی ساس صبیرہ کو تسلی دینے لگیں۔

''بہت بہادر ہے تمہاری ماں۔ یہ سب تو چھوٹی موٹی تکلیفیں ہیں، دیکھ لو اب بالکل ٹھیک ہے۔''

مگر سنبھلنے کی بجائے اس کے دل کو ایک تکلیف سی پہنچی تھی۔

''بس، اب میں امی کے پاس ہی رہوں گی۔ بہت کر لی پڑھائی، مجھے نہیں رہنا ہوسٹل میں۔ اب میں بھی آپ کے ساتھ وزیر آباد جاؤں گی۔'' وہ رو پڑی تھی۔

''اوفوہ، ایک تو یہ لڑکی بھی نا۔'' وہ پسیج گئیں۔ پھر اس کا دھیان بٹانے کو پوچھنے لگیں۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ کس کے ساتھ آئی ہو؟''

''سب باہر ہیں، ابھی ملاقات کا ٹائم نہیں تھا اس لئے انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ ناراضگی سے بتا رہی تھی۔

اور جب ملاقات کا وقت آیا تب ایڈی غائب تھا۔

''اس کا کوئی ایڈیٹر دوست مل گیا تھا، وہی جس کے اخبار میں وہ کالم لکھتا ہے۔ زبردستی لے گیا ہے اسے۔ اسی کے کسی کالم سے شاید کوئی مسئلہ کھڑا ہوا ہے۔ ایڈی تم سے سوری بولنے کو کہہ گیا ہے۔'' شفق نے سرگوشی میں اسے بتایا تھا۔

''صبیرہ! بھئی تعارف تو کراؤ سب کا۔'' شائنہ بھابی نے بے تکلفی سے کہا تو وہ مسکرا دی۔

''یہ زارا کی امی ہیں، اور یہ جو شکل اور حلیے دونوں سے دولہا لگ رہا ہے، یہ ثوبان ہے اور یہ فرحان۔ یہ دونوں ہمارے بہت اچھے بھائی ہیں۔''

''تھینک گاڈ ایڈی غیر حاضر ہے۔'' ثوبان کی بڑبڑاہٹ نے صبیرہ کو گڑبڑا دیا۔ اس کے بری طرح جھینپ جانے کو ثوبان نے بہت انجوائے کیا تھا۔ واپسی پر وہ بمشکل اُٹھنے کو تیار ہوئی تھی۔

''ایگزیمز میں تھوڑے ہی تو دن ہیں، پھر آ جانا واپس۔ یوں درمیان میں تو پڑھائی مت چھوڑو۔'' امی نے گھر کا تو وہ منہ بسورتی ان کے گلے لگ گئی۔

اگلی صبح سبھی نے رختِ سفر باندھ لیا۔ زارا اور ثوبان منہ اندھیرے شمالی علاقہ جات کے لئے روانہ ہوئے۔ ایڈی نے شفق اور صبیرہ کو ڈراپ کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ زارا کی امی نے ان دونوں کو خوبصورت سوٹ اور نیگ کے ایک ایک ہزار روپے تھما دیئے۔ ان کے معترض ہونے پر اپنائیت سے ڈانٹ بھی دیا۔

''زارا کی بہنیں ہو تم۔ خبردار جو انکار کیا، تمہارا حق بنتا ہے۔''

صبیرہ کو بہت اچھا لگا تھا۔

شفق کو گھر ڈراپ کیا تو اس کی امی نے چائے پلائے بغیر گھر سے نکلنے نہیں دیا تھا۔

واپسی پر وہ اس کے لئے اگلی نشست کا دروازہ کھول کر کھڑا ہوگیا۔

''تم میرے برابر بیٹھو گی، یہ میرے لئے اعزاز کا باعث ہوگا۔'' بہت شائستگی سے وہ انگریزی میں بولا تھا۔

کانوں میں بج اٹھنے والی دھڑکن نے صبیرہ کو اندازہ نہیں لگانے دیا کہ وہ سنجیدہ تھا یا مذاق کے موڈ میں۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ دروازہ بند کرتا وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''یہ گاڑی فرحان کی ہے۔ اس کی فرنٹ سیٹ پر تو جانے کون کون بیٹھا ہوگا، مگر جب میں گاڑی لوں گا تو اس کی فرنٹ سیٹ پر صرف تمہیں بٹھاؤں گا۔'' گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس کی طرف سے یہ پہلا مدلل اظہار تھا۔

صبیرہ نے اپنے چہرے سے آگ کی لپٹیں نکلتی محسوس کی تھیں۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ جواب میں کس ردِعمل کا اظہار کرے۔ بے ترتیب دھڑکنیں لئے سر جھکائے انگلیاں مسلتی رہی۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''ویسے مجھے تو اسپورٹس بائیک پسند ہے، مگر تمہیں شاید اچھی نہیں لگتی۔ اسی لئے تم نے اس روز میری آفر قبول نہیں کی۔ ہوسٹل ڈراپ کرنے والی۔''

وہ دھڑ دھڑ کرتا دل لئے بے بس سی سر جھکائے بیٹھی تھی۔

ایڈی نے چہرہ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے دل میں دور دور تک بے حد اطمینان اور خوشی پھیلتی چلی گئی۔

یہ لڑکی ...... اس سے بالشت بھر فاصلے پر بیٹھی یہ لڑکی اسے کتنی عزیز تھی، یہ کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔

کبھی بھی لڑکیوں میں دلچسپی نہ رکھنے والا ایڈی جانے کب اور کیسے تقریری مقابلوں اور ان سے باہر بھی اس سے مخالفت برتنے والی اکھڑ اور بے حد جذباتی سی لڑکی کا اسیر ہوتا چلا گیا تھا۔

اسے چڑا کر، غصہ دلا کر پھر اس کی تمتمائی رنگت دیکھنا اسے ہمیشہ ہی ایک پُرلطف عمل لگا کرتا تھا۔ غصے اور جھنجلاہٹ میں وہ اسے بے نقط سنا جاتی تھی۔ جواباً اس کی مسکراہٹ دیکھ کر اس کے غصے میں مزید اضافہ ہوتا تھا۔ اس نے بمشکل خود کو دوسری نگاہ کی بے ادبی سے روکا تھا۔ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

''شاید اس سارے معاملے میں میری ہی غلطی ہے۔ میرے رویے کی وجہ سے ہی تم مجھ سے متنفر ہو گئی تھیں۔''

''نہیں، اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں تھی۔'' وہ بے ساختہ اس کی بات کاٹ گئی۔ پھر مدھم لہجے میں بولی۔ ''پتہ نہیں، میں ہی کیوں ہر معاملے میں اتنی جذباتی ہو جاتی ہوں۔''

''خصوصاً میرے معاملے میں۔'' ایڈی نے شرارت سے کہا تو وہ بےبسی سے اسے دیکھنے لگی۔

''اب تو میں تمہیں معاف کر چکی ہوں۔''

''ارے ......'' وہ اس کی بات سن کر ہنسا تو پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ صبیرہ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ سر پیٹ کر رہ گئی۔

''یعنی کہ تمام قصور میرے تھے۔ مجھے معاف کر دیا ہے۔ انٹرسٹنگ۔'' وہ ابھی تک محظوظ ہو رہا تھا۔

''میرا مطلب ہے کہ تمہارے متعلق جو غلط فہمیاں میرے دل میں تھیں وہ اب ختم ہو گئی ہیں۔ میں نے گزری باتوں کو بھلا دیا ہے۔'' روسٹرم پر بے تکان بولنے والی صبیرہ علی کی ہتھیلیاں پسیج رہی تھیں۔ کہنا کچھ چاہتی تھی اور زبان سے نکل کچھ اور رہا تھا۔

''ویری گڈ!'' اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے سر ہلایا تھا۔ پھر بظاہر بڑے سرسری انداز میں بولا۔ ''ویسے اب تمہارے دل میں میرے لئے کیا ہے؟''

اور بس ......

یہی وہ لمحہ تھا پچھلے دو دنوں سے صبیرہ علی جس کے تصور سے ہی سنسنی آمیز احساسات کا شکار ہو جاتی تھی۔ اس سوچ کو وہ نظر انداز کرتی رہی تھی کہ اگر ایڈی نے براہ راست اس سے یہ سب پوچھ لیا تو وہ کیا کرے گی۔

گزرتے لمحوں پر خاموشی کی چادر دبیز ہونے لگی تو ایڈی نے گاڑی کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جو سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ خاموش تو بیٹھی تھی مگر فارغ نہیں۔ آنسو ٹپ ٹپ کرتے اس کی ہتھیلیاں بھگو رہے تھے۔ اس نے خالی سڑک کے کنارے پر گاڑی روک دی۔ صبیرہ کے اس احساسِ پشیمانی نے اسے کوئی خوشی نہیں دی تھی۔

''میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا صبیرہ! ہر مشکل لمحہ انسان کو تجربہ سکھانے کی خاطر آتا ہے۔ چاہے وہ اچھا ہو یا برا۔ یہ تو قسمت کے سلسلے ہیں۔ لیکن اگر تم میرے اس اظہار سے خوش نہیں ہو تو بھی میں تم سے معذرت کر سکتا ہوں۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا اپنے حق میں کہ میری نظر سے دل تک پہنچنے والی تم پہلی اور آخری لڑکی ہو۔ میں ان معاملات میں کبھی بھی جذباتی نہیں رہا۔ پھر بھی جانے کیوں تمہارے معاملے میں خود میرا دل میرے مدمقابل ڈٹ گیا ہے۔ بہر حال فیصلہ تمہارا اور تمہاری خوشی کا ہوگا۔''

وہ پھر بھی خاموش رہی تھی۔

اس خاموشی نے ایڈی کے اعصاب پر کافی اثر ڈالا۔ دل کے کسی کونے سے افسردہ سی لہر اٹھی تھی۔

''اگر ہم کہیں اور وہ مسکرا دیں
ہم ان کے لئے زندگانی لٹا دیں!
سزا دیں، صلہ دیں، بنا دیں، مٹا دیں
مگر وہ کوئی فیصلہ تو سنا دیں''

اس کی بوجھل سی آواز صبیرہ کے دل کے تاروں میں زبردست سا ارتعاش پیدا کر گئی تھی۔

یکلخت ہی یوں لگا جیسے زنداں میں کئی کھڑکیاں کھل گئی ہوں جن سے صبح بہاراں پوری آب و تاب کے ساتھ دکھائی دے رہی ہو۔ ساتھ بیٹھا یہ شخص جو بےتابی کے ساتھ اس کے جواب کا منتظر تھا، اس کی تمام بے وقوفیوں کا گواہ، اس کی پے در پے حماقتیں برداشت کرنے کے باوجود پورے خلوص اور محبت کے ساتھ اس کا ساتھ چاہ رہا تھا۔ اور وہ انکار کر کے خود کو گناہ گار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

چند لمحوں کے بعد اس نے چہرہ صاف کرتے ہوئے بہت ہمت جمع کر کے اس کی طرف دیکھا جو آنکھوں میں اشتیاق سموئے اس کے فیصلے کا شدت سے منتظر تھا۔

''میں ...... خوش ہوں۔ بہت خوش۔'' اپنی تمام تر دلی و ذہنی آمادگی کے ساتھ کہتے ہوئے اس کی آواز بھیگ گئی مگر ایڈی کو تو جیسے ازسرِنو زندگی مل گئی تھی۔

''تھینکس صبیرہ! تم نہیں جانتیں کہ تم نے مجھے کتنی بڑی خوشی دے دی ہے۔'' اس کی آواز میں چھپی خوشی صبیرہ کو اچھی طرح محسوس ہو رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں ایڈی! کیونکہ آج اس فیصلے نے مجھے بھی اتنی خوشی دی ہے۔'' سوچتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی آسودہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

اسے ہوسٹل ڈراپ کرتے وقت بہت سی نصیحتوں کے ساتھ ساتھ اس نے خاص طور پر اسے ہدایت کی تھی۔

''اول تو شہباز گردیزی اب کوئی مزید بدمزگی نہیں کرے گا اور اگر ایسا کچھ ہوا بھی تو تم سیدھی آ کر مجھے بتاؤ گی۔ ٹینشن لینے کی کوئی ضرورت نہیں، ویسے میں نے اس کو اچھی طرح سبق سکھا دیا تھا۔''

''اوکے ......'' اس نے بہت فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا تو وہ ہنس دیا۔

''آج ویسے تم اپنے جنگجو اسٹائل سے زیادہ اچھی لگ رہی ہو۔''

''خدا حافظ۔'' وہ جھینپ کر گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ ایڈی کی نظر نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

واپسی پر اس کے دل و دماغ بہت خوشنما سے خیالات کی گرفت میں تھے۔

✡......✡

جانے سے پہلے امی اسے ملنے ہوسٹل آئی تھیں۔ انہیں وزیٹرز روم میں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی تھی۔

''شائنہ بھابی یقیناً اپنے میکے سدھار گئی ہوں گی۔'' ان کے گلے لگتے ہوئے اس نے شگفتگی سے کہا۔ شائنہ بھابی کا میکہ لاہور ہی میں تھا۔

''وہ تو میرے ساتھ جانا چاہ رہی تھی۔ میں نے ہی کہا کہ اب آئی ہی ہو تو دو دن رہ جاؤ۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔

''اور آنٹی کدھر ہیں ......؟'' اس نے شائنہ کی ساس کے متعلق استفسار کیا جو کہ ان کی بہترین سہیلی تھیں۔

''وہ بھی اس کے ساتھ ہی ہے۔ ابھی واپسی پر میرے ساتھ ہی جائے گی۔'' انہوں نے اطمینان سے کہا تو وہ بھی مطمئن ہو گئی۔ مگر ساتھ ہی دل کو ہلکی سی آزردگی نے بھی اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔

''کتنی اچھی ہیں ناں آنٹی بھی اور شائنہ بھابی بھی۔ زندگی کے کسی بھی موڑ پر انہوں نے ہمیں اپنوں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔'' اس کی آنکھوں سے جھلکتے احساسِ محرومی نے ہمیشہ کی طرح ان کی رنگت پھیکی کر دی تھی۔

بچپن سے اب تک انہوں نے اسے ہر سہولت مہیا کی تھی۔ ہر آسائش، پیار، محبت مگر پھر بھی ایک کمی سی رہ گئی تھی۔

''جو اپنوں سے بڑھ کر ہوں، ان کے ہوتے ہوئے تو اور کسی کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔'' انہوں نے اس سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔ آج سے پہلے صبیرہ علی بھی یہی کیا کرتی تھی۔ مگر کسی کے زندگی میں آتے ہی جیسے زندگی کا مفہوم ہی بدل گیا تھا۔ بہت سے رشتوں کی کمی کا احساس شدت سے ہونے لگا تھا۔

''دنیا میں کتنے خوب صورت رشتے ہوتے ہیں امی! نانا، نانی، دادا، دادی، ماموں، چچا اور ڈھیر سارے کزنز۔ پتہ نہیں کیوں خدا نے ہمیں اتنا تنہا کر دیا ہے اس دنیا میں۔''

وہ اتنی اُداس کبھی نہیں ہوئی تھی۔ انہیں اس کے اندر محسوس کن تبدیلی کا احساس ہوا تھا۔ اور کچھ یاسیت بھرے انداز و الفاظ نے بھی اندر ہلچل سی مچا دی تھی۔

''اتنے خوش تو ہیں ہم صبی! تم بھی نا بہت ناشکری ہو۔'' خود کو سنبھالتے ہوئے انہوں نے اسے ڈپٹنے والے انداز میں کہا اور پیار کے ساتھ اس کی پیشانی پر آئے بال ٹھیک کرتے ہوئے بولیں۔

''تم یہ بتاؤ کہ زارا کی شادی کا فنکشن کیسا رہا؟''

وہ پُرجوش سی انہیں بتانے لگی۔

''بہت مزہ آیا۔ اتنا انجوائے کیا ہم سب نے، صحیح معنوں میں ایک فیملی کا سا احساس پایا ہے میں نے۔'' وہ کہہ رہی تھی اور وہ عجیب سنسناہٹ بھرے احساس میں گھری اس کے جگمگاتے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔

''اور پتہ ہے آنٹی نے مجھے اور شفق کو نیگ کے روپے اور ایک ایک بہت پیارا سوٹ بھی دیا ہے۔ میں نے تو بہت منع کیا مگر ......''

''صبی! میری جان! تمہیں کب سے فیملی کی کمی کا احساس ہونے لگا ہے؟'' انہوں نے اتنی تفصیل کے جواب میں یہ سوال کیا تو وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ پھر ان کی پھیکی پڑتی رنگت دیکھ کر فوراً ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اسے اپنی غلطی کا بہت شدت سے احساس ہوا تھا۔ وہ انجانے ہی میں ان کے زخم کرید رہی تھی۔

بھلا قسمت پر بھی کبھی کسی کا زور چلا ہے؟

''میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ بس یونہی سب کو اپنی مکمل فیملی کے ساتھ دیکھ کر یونہی خیال آیا تھا۔ کاش میرے ابو بھی ہمارے ساتھ ہوتے تو ہم کتنا انجوائے کرتے زندگی کو۔''

اس کے انداز میں خودبخود ایک حسرت اُمڈ آئی تو انہوں نے اسے تھام کر خود سے الگ کر دیا۔

''میں نے تم سے کہا تھا صبیرہ، میرے سامنے اس شخص کا ذکر مت کیا کرو۔'' ان کی آنکھوں میں خفیف سا گلابی پن اتر آیا تھا۔ سختی سے کہا تو وہ افسردہ سی ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام گئی۔

''آئی ایم سوری، پتہ نہیں کیوں میں ان کا ذکر تو نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔'' اسے نادم دیکھ کر انہوں نے گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے خود کو نارمل کیا تھا۔

''اٹس اوکے۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟'' وہ معتدل لہجے میں پوچھنے لگیں تو صبیرہ کی بھی سانس میں سانس آئی۔ اس نے انہیں اپنی پڑھائی کے متعلق بتانا شروع کر دیا تھا۔

واپسی پر ان کا دل بے حد افسردہ تھا۔

عجیب سی آزردگی اور تھکن انہیں اپنے حصار میں لئے ہوئے تھی۔ ثائنہ کی ساس نے پوچھا تو وہ ان سے کچھ بھی چھپا نہیں پائی تھی۔

''تم نے بھی تو انتہا ہی کر دی تھی۔ میں تو تمہیں سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں۔ اپنے لئے نہ سہی، صبیرہ ہی کے لئے، اس بے چاری کا اس سارے قصے میں کیا قصور ہے؟ اتنے سارے رشتوں کے ہوتے ہوئے وہ خود کو بے سہارا سمجھتی ہے۔ باپ کے سائے کو محسوس کرنے کو ترستی ہے۔ کم از کم اس کے ساتھ تو یہ ظلم مت کرو۔''

''جو لوگ میرے نہیں بن سکتے وہ میری بیٹی کو کیا سہارا دیں گے؟ میں صرف اس بات سے پریشان ہوں کہ صبیرہ نے یہ سب کب اور کیوں سوچنا شروع کر دیا۔ اس نے تو کبھی اپنے باپ کو اُس کے جرم سے بری نہیں کیا تھا۔ کچھ تو ہوا ہے جس نے اس کے سوچنے کا انداز بدل دیا ہے۔'' انہوں نے پُرسوچ انداز میں کہا تو وہ ناصحانہ انداز میں بولیں۔

''ہر انسان کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا دور ضرور آتا ہے کہ جب اسے ان سب باتوں کا احساس ہونے لگتا ہے۔''

ان کی بات نے کتنی ہی دیر تک آکٹوپس کی طرح ان کے دل کو جکڑے رکھا تھا۔

آج کتنے ہی عرصے کے بعد دل کے خوابیدہ زخموں سے ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ ''خونی رشتے قدرت کی طرف سے بنتے ہیں۔ انسان آپس میں ایک دوسرے کے درمیان چاہے نفرت، اکتاہٹ اور بے زاری کی جتنی بھی دیواریں کیوں نہ کھڑی کر لے، اس کے توڑنے سے یہ رشتے نہیں ٹوٹ سکتے۔ یہ دائمی رشتے ہیں، یہ ازلی وابستگیاں ہیں، ان کے جوڑ توڑ میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں۔'' رات بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے ان کی سماعتوں میں وہی الفاظ دستک دے رہے تھے۔

اب آخری سطروں میں کہیں نام ہے اس کا
احباب کی فہرست میں پہلا تھا جو اک شخص

ان کا دل قطرہ قطرہ پگھلنے لگا تو پلکوں سے کئی آنسو گر کر بے مول ہونے لگے۔

آج کتنے ہی سالوں کے بعد انہیں یکا یک سر پر کڑی دھوپ کا احساس ہوا تھا۔

کتنا سارا رو لینے کے بعد بھی دل کو تسلی نہیں ملی تھی۔ ماضی پر نگاہ ڈالی تو پھر سے تلخ یادوں کے ناگ پھن پھیلائے اٹھ کھڑے ہوئے۔

غصے سے پھنکارتے، انہیں ڈسنے کو بے قرار۔ اور مجبوری سی مجبوری تھی کہ بچنے کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔

جب سینے اندر سانس کے دریا ڈولتے ہیں
جب موسم سرد ہوائیں
چپ سی گھولتے ہیں
جب آنسو پلکیں رولتے ہیں
جب سب آوازیں اپنے بستر پر
سو جاتی ہیں تب آہستہ آہستہ
آنکھیں کھولتے ہیں
دُکھ بولتے ہیں

اور آج پھر دُکھوں کے بولنے اور خوابیدہ زخموں کے جاگ اُٹھنے کی رات تھی۔

۞......۞

محبت کے سودے میں عورت ہمیشہ گھاٹے میں رہتی ہے۔ مٹ جاتی ہے، فنا ہو جاتی ہے مگر بہت آگے تک جاتی ہے۔ مرد ہمیشہ فائدے میں رہتا ہے۔ اپنی جگہ پر واپس آ جاتا ہے مگر عورت اپنے پیچھے واپسی کا ہر نشان مٹاتی چلی آتی ہے۔ سو اس ریگزار میں اترنے کے بعد واپسی کا خیال سوائے موت کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔

کچھ ایسا ہی تابندہ ضیاء نے بھی کیا تھا۔

تابندہ ضیاء سے تابندہ وقار علی تک کا سفر طے کرنے کے دوران وہ بہ راضی و رضا واپسی کا ہر دروازہ اپنے ہاتھوں بند کرتی چلی آئی تھی۔ رنگوں، روشنیوں اور پھولوں کی بارش میں آنکھیں موندے وہ من چاہے ہم سفر کی ہمراہی میں سرشار تھی۔

آنکھیں کھلیں تو احساس ہوا کہ وہ لق و دق صحرا میں تنہا کھڑی تھی۔

اور اب وہ وقت آ گیا تھا جب صحیح معنوں میں اس کا پیچھے کی طرف سفر شروع ہو گیا تھا۔

ضمیر کی خلش دن رات ان دیکھی آگ میں جلا رہی تھی مگر بچ نکلنے کی کوئی صورت دکھائی نہیں پڑ رہی تھی۔ سود و زیاں کا حساب کرنے بیٹھی تو تمام زیاں اپنے ہی حصے میں پایا۔ اور جس کی خاطر یہ زیاں سہا تھا وہ کس قدر اطمینان بھری زندگی گزار رہا تھا، اپنے چاہنے والوں کے درمیان۔

قربانی تو اس نے دی تھی، لیکن قربانی کی تو قدر کی جاتی ہے۔

یہ کیسی رسم چلی تھی کہ اس قربانی کے صلے میں پھر سے دار ہی اس کا مقدر بن گیا تھا۔

اس نے اپنی انا کے سر پر پاؤں رکھتے ہوئے تمام تلخیوں کو دل میں دبا کر اپنی فطرت کے برخلاف وقار علی کی پیش قدمی کا مسکرا کر خیر مقدم کیا تھا مگر حالات ہر بات جیسے پلٹ کر اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر رہے تھے۔

یہ زعم تھا کہ کون و مکاں دسترس میں ہیں
آنکھیں کھلیں تو ذات کی منزل بھی طے نہ تھی

یہ غم کا سفر تھا، پچھتاوے کا سفر تھا۔

یہ واپسی کا سفر تھا۔

جب انسان پر کوئی افتاد آن پڑے اور اسے آگے کچھ دکھائی نہ دے رہا ہو تو ایک بار پیچھے مُڑ کر ضرور دیکھنا چاہئے۔ کہیں نہ کہیں اس افتاد کا محرک ضرور مل جاتا ہے۔

تابندہ بھی اس دور کے کنارے پر آ کھڑی ہوئی تھی جہاں سے پیچھے مڑے بغیر اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

اور پھر انہی دنوں جب وہ دنیا سے بیزار ہو چلی تھی اور وقار علی کی محبت بھی اسے کسی رنگینی کی طرف متوجہ نہیں کر پا رہی تھی، خدا نے جیسے اس کی آدھی خطائیں معاف کر کے خوب صورت اور مہکتا پھول اس کی جھولی میں ڈال دیا۔

وقار علی خوشی سے سرشار فوراً ہی سجدۂ شکر بجا لایا تھا۔ صدقہ، خیرات نکالی جانے لگی مگر وہ ساکت سی تھی۔

بیٹی، ایک اور بیٹی ...... ایک اور آزمائش۔

اسے یوں لگا جیسے وہ ایک اور تابندہ کی ماں بن گئی ہو۔ اس نے اپنی بیٹی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ مگر جب وقار علی اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھائے اس کے پاس لایا تو وہ اسے سینے سے بھینچ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

گلابی رنگت لئے خوب صورت آنکھوں کو کھولے وہ حیران سی ماں کو تک رہی تھی۔ جیسے پوچھ رہی ہو کہ یہ سواگت کا کون سا انداز ہے۔ اور پھر وہ بھی چلا چلا کر رونے لگی، جیسے اسے یہ انداز قطعی پسند نہ آیا ہو۔

وقار علی کو اپنی نادانیوں اور تابندہ کے دُکھے دل کا پوری طرح سے احساس تھا۔

''ہم اس کا نام صبا رکھیں گے۔ بادِ صبا۔ بے اعتنائی کے سلگتے صحرا میں کھڑی ہماری زندگی کے لئے یہ بادِ صبا ہو گی تابندہ! ہمارے جذبوں کو پھر سے گلستاں کرنے والی صبا۔''

وہ بچی کی پیشانی چومتے ہوئے آزردگی سے کہہ رہا تھا۔

تابندہ کی خاموشی سے وہ لاعلم تو نہیں تھا مگر اس کا ہر چارہ بے کار گیا تھا۔ وہ پتہ نہیں ذات کی کس کال کوٹھڑی میں اپنا آپ مقید کر کے بیٹھ گئی تھی کہ ہزار ڈھونڈنے پر بھی اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔

پوری حویلی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

تقریباً ڈیڑھ ہفتے کے بعد اعزاز علی بھی ایک خوبصورت اور گل گوتھنے سے بیٹے کا باپ بن گیا تھا۔ وقت کا کام گزرتے چلے جانا ہے۔ تابندہ بھی شوخ و شریر سی صبا کی حرکتوں میں اُلجھی اپنے تمام تر پاگل پن کو کہیں پسِ پشت ڈال چکی تھی۔

اور پھر انہی دنوں وقار علی کے فیصلے نے اسے سرتاپا جھنجھوڑ ڈالا۔ کتنے اطمینان سے وہ صبا کو گود میں لئے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر رہا تھا۔

''میں نے سوچا ہے بلکہ میں نے اور اعزاز نے فیصلہ کیا ہے کہ صبا اور نوروز کی شادی کر دی جائے۔''

تابندہ کے وجود پر جیسے بم بلاسٹ ہوا تھا۔

وہ آنکھیں پھاڑے کئی لمحوں تک ششدر سی وقار علی کو دیکھے گئی تھی۔ پھر ایک دم سے صبا کو اس کی گود سے چھینتی پھٹ پڑی۔

''دماغ تو خراب نہیں ہو گیا آپ کا؟ اتنے سے بچوں کے لئے آپ ایسے فضول فیصلے، پاگل ہو گئے ہیں آپ؟'' وہ بے یقینی کی گرفت میں تھی۔

''اس میں ایسی عجیب تو کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی بچوں کا نکاح ہو جائے گا تو شروع ہی سے ایک مضبوط رشتے اور انڈر اسٹینڈنگ کا احساس رہے گا۔''

''خاموش رہیں وقار! میں آپ کو اپنی بیٹی کے لئے ایسا کوئی فیصلہ کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گی۔'' وہ ضبط کرتے ہوئے بھی درشتگی کا مظاہرہ کر گئی تھی۔

مگر وہ نرم انداز میں اسے سمجھانے لگا۔

''دیکھو تابی! اس طرح کے رشتوں سے آپسی تناؤ اور اختلاف کو ختم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ دلوں کی دُوریاں دُور ہوتی ہیں۔''

''مگر میں اپنی بیٹی کو قربان نہیں کر سکتی۔ وہ بھی ان خودغرض لوگوں کے لئے جن کے لئے میری کوئی اہمیت نہیں۔ وہ میری بیٹی کو کیا سمجھیں گے؟'' اس کی بات کاٹتے ہوئے تابندہ نے تلخی سے کہا تھا۔

مگر بڑھتے گھریلو تناؤ اور تلخیوں نے شاید وقار علی کے دل میں اپنوں سے بچھڑنے کا خوف پیدا کر دیا تھا۔ تبھی تو وہ اپنے فیصلے پر اڑ گیا تھا۔

''دیکھ رہی ہیں بھابی آپ۔ کس قدر سنگ دل ہو رہے ہیں وقار۔ وہ جانتے ہیں کہ فوزیہ نے کبھی بھی مجھے دل سے قبول نہیں کیا ہے پھر بھی اس فضول سی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔'' وہ رو دی تھی۔

اور فوزیہ نے تو ایک زمانے میں تماشہ لگا دیا۔

''میں تو اس عورت کو منہ لگانا بھی پسند نہیں کرتی اعزاز علی! پھر آپ کی ہمت کیسے ہوئی میرے نوروز کے لئے اس کی بیٹی کا نام لینے کی؟''

''بکواس بند کرو جاہل عورت! ان کی بیٹی سے میرا بھی خون کا رشتہ ہے۔ بھتیجی ہے میری وہ۔''

''آپ کے دل میں چاہے اس عورت کی کوئی بھی جگہ ہو، مگر میرے لئے وہ کسی سوتن سے کم نہیں ہے۔''

وہ بہت گھٹیا پن پر اتر آئی تھی۔ ایک دم ہی جیسے حشر برپا ہو گیا ہو۔ اعزاز علی کا ہاتھ بے ساختہ ہی اٹھ گیا تھا۔

اتنے پاکیزہ اور معتبر رشتوں کو وہ زبان کی دھار سے دھجی دھجی کر گئی تھی۔

مگر وہ اس کے اشتعال سے دبنے کی بجائے آتش فشاں کی طرح اُبل پڑی۔ اس قدر طوفان کھڑا ہوا کہ خدا کی پناہ۔

مقدمہ ابا جی کی عدالت میں جا پہنچا۔

''گھر کے حالات بھی آپ دیکھ رہے ہیں، جب یہ لوگ دل ہی سے اس رشتے پر رضامند نہیں ہیں تو پھر منہ زبانی ایسے فیصلے کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' تابندہ نے بہت ضبط و برداشت کا مظاہرہ کر رکھا تھا۔

مگر فوزیہ پر ایسی کوئی پابندی لاگو نہیں تھی۔

اس نے کوئی بھی کمزوری دکھائے بغیر بڑوں کے سامنے بھی اسی تنفر اور گراوٹ کا مظاہرہ کیا تھا۔

''میں تو ایک فیصد بھی اس رشتے کے حق میں نہیں ہوں۔ ہمارے یہاں تو مثالیں موجود ہیں عبرت حاصل کرنے کی۔ اور بچے تو والدین ہی کا پرتو ہوتے ہیں۔ کیا فائدہ کل کو میرا بیٹا بھی سر پر ہاتھ رکھ کر روئے۔ نہ تو صبا کے باپ کو رشتے نبھانے کا گُر آتا ہے اور نہ ہی ماں کو۔'' لبوں پر کڑوی سی مسکراہٹ سجائے وہ سب کے بیچ تابندہ کو بری طرح رگید گئی تھی۔

اپنی ذات سے باہر رہنے والا شخص ہمیشہ دوسروں کی غم خوشی میں ہنستا روتا ہے۔ مگر اپنی ذات کے اندر رہنے والا شخص کچھ اس قدر حساس ہوتا ہے کہ خود پر آنے والی ہر بات اس کی جڑوں تک کو ہلا دیتی ہے۔

اور تابندہ تو ہمیشہ سے اپنی ذات میں قیدی بن کر رہی تھی۔ اسے فوزیہ کا یہ جملہ سراسر اپنے کردار پر کیچڑ اچھالنے کے مترادف لگا تھا۔ اور برا تو وقار کو بھی بہت لگا تھا مگر بے جی نے اپنے اٹل لہجے میں بات ہی ختم کر دی۔

''یہ میرا فیصلہ ہے۔ میں اپنی زندگی میں تم لوگوں کو بکھرتے اور بچھڑتے نہیں دیکھ سکتی۔ ان کے والدین نے تو جو من مانیاں کرنا تھیں کر لیں، مگر میں اپنی نسل کو اس بے راہ روی کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ انہیں ایسے شرعی رشتے میں باندھا جائے کہ جسے توڑنے سے پہلے یہ ہزار دفعہ سوچیں۔''

تابندہ کا ہر واویلا بے کار جا رہا تھا۔

اور تب

ہاں تبھی شاید خدا کو ایک بار پھر اس پر رحم آ گیا۔ اس وقت بھی صدیقہ بھابی ہی نیکی کے فرشتے کی طرح اس کی مدد کو آگے بڑھی تھیں۔

''اگر ایسی ہی بات ہے بے جی! تو پھر پہلا حق میرا بنتا ہے، میرے عدیم کا۔ میں صبا کا رشتہ اس کے لئے چاہتی ہوں۔ اگر خاندان کو جوڑ کر ہی رکھنا ہے تو سب کی رضا سے کیوں نہیں۔''

بھایا تشکر اور فخر سے اپنی دل نواز بیوی کو دیکھ کر رہ گئے۔ وہیں وقار علی کے ساتھ ساتھ اعزاز علی بھی نم آنکھوں سے مسکرا دیا تھا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔ سب سے پہلا حق نواز علی کا ہے۔ صبا اسی کی بہو بنے گی۔'' ابا جی کا فیصلہ بھی پتھر پر لکیر کی مانند ہوا کرتا تھا۔ فوزیہ فاتحانہ نظروں سے اعزاز علی کو دیکھنے لگی جو اس وقت خود کو بہت ہارا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ محبت کی بساط پر، زندگی کی بساط پر اور آج شاید رشتوں کی بساط پر بھی۔

''اور میں ...... میرا کوئی حق نہیں اپنی بیٹی پر؟ میں اس کی ماں ہوں اور میرا کسی نے نام ہی نہیں لیا اس قصے میں۔'' تابندہ صدمے کی گرفت میں تھی۔

''مجھ پر بھی یقین نہیں ہے تابندہ؟'' بھابی کی محبت اسے امتحان میں ڈال گئی تھی۔ وہ ان کے گلے لگ کر رو دی۔

''اب ان آنسوؤں کو خدا حافظ کہہ دو تابندہ! تم نے تو انہیں مستقل مہمان ہی بنا لیا ہے۔ سمجھو تمہاری آزمائش کا وقت ختم ہوا۔ اور دیکھو ذرا، میرا بیٹا ابھی سے ہی تمہاری بیٹی کا کس قدر دیوانہ ہے۔'' انہوں نے پیار سے کہتے ہوئے اس کی توجہ عدیم کی طرف مبذول کرائی جو ننھی سی صبا کو گود میں لینے کی پُرزور کوشش کر رہا تھا اور وہ بھی خوب ہاتھ پیر چلا کر خوش ہو رہی تھی۔ مگر وہ اس منظر سے محظوظ ہونے کی بجائے خوب روئی تھی۔

یہ پچھتاوے کا سفر۔ واپسی کا سفر۔

اور اگلے ہی ہفتے نہایت دھوم دھام سے تین سالہ عدیم اور ایک ماہ کی صبا کا نکاح ہو گیا۔ لڑکی کی طرف سے وقار علی اور لڑکے کی طرف سے نواز علی نے ایجاب و قبول کے مراحل طے کیے تھے۔

خوشیاں، ہنگامے، بے فکری۔

مگر لرزتا کانپتا تابندہ کا دل۔

یونہی تو والدین کی نافرمانی کو گناہ کبیرہ نہیں کہا گیا۔ یہ تو وہ پچھتاوا ہے جو عمر بھر انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اور تابندہ کا تو محض آغاز سفر تھا۔

اس نے نہایت عاجزی کے ساتھ بھابی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''بھابی! کبھی میری سیاہ بختی کا الزام میری بیٹی کو مت دینا۔ کبھی میری نادانیوں اور کم ظرفیوں کا طعنہ اس کے سر مت رکھنا۔ میں تو اپنی سزا بھگت رہی ہوں بھابی! مگر میری بچی، اسے تابندہ مت بننے دیجئے گا۔''

صدیقہ بھابی نے اسے بہن اور بیٹی کہا ہی نہیں، مانا بھی تھا۔ اس کے ہاتھ کھول کر اسے شانے سے لگا لیا۔

''کب تک دُکھ کی سرزمین پر سفر کرتی رہو گی تابندہ! اب اس خودساختہ ملامت کو خود سے جدا کر دو۔ ورنہ یہ تمہاری زندگی کے ہر خوبصورت احساس اور جذبے کو زنگ آلود کر دے گی۔ اپنی زندگی کی تمام خوشیاں اپنی بیٹی سے جوڑ لو۔ ابھی ایک خوشی دیکھی ہے، آگے تو پوری عمر پڑی ہے۔ اور ہر راستے پر خوشیوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔''

اس کا دل ٹھہرنے لگا تھا۔

اور واقعی زندگی ایک جگہ ساکت و منجمد ہو جانے کا نام ہرگز نہیں ہے۔

پیاری سی صبا اور شوخ و شریر عدیم اسے بہت جلد قنوطیت کے اس حصار سے باہر کھینچ لائے تھے۔

مگر تنہائی اب بھی عذاب تھی اور وقار علی کے لئے وہ سرتاپا برفاب۔

وہ اکثر اس کی بے اعتنائی اور خودساختہ مصروفیات سے ناخوش رہتا تھا مگر اب تابندہ نے اس کی پرواہ کرنا چھوڑ دی تھی۔ جانے کیوں وہ اپنے دل کو اس کی طرف سے پہلے کے سے انداز میں مائل ہی نہیں کر پاتی تھی۔ کرنا بھی چاہتی تھی مگر قربت کے لمحات کو جیسے گنبد میں گونجتی بازگشت آلودہ کرنے لگتی تب وہ اس سے بھاگنے لگتی تھی۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ میرے نزدیک آنا اب تمہیں گناہ لگنے لگا ہے۔''

وہ تیار ہو کر آئینے کے سامنے سے ہٹی تو آنکھوں پر بازو رکھے بظاہر لاپرواہ لیٹے وقار علی نے اٹھ کر اس کی راہ روک لی تھی۔

''جب لگنا چاہیے تھا تب نہیں لگا، اب کیا فائدہ؟ ہر بات کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔'' وہ اس سے نظر ملائے بغیر پھیکے لہجے میں بولی تو وہ جیسے اپنی ذات کے گہرے نقصان سے آزردہ سا پوچھنے لگا۔

''اور میں؟ میری محبت کے لئے کون سا وقت رکھا ہے تم نے؟''

''محبت؟'' وہ حیران سی اسے دیکھنے لگی تھی۔ ان خوب صورت ہونٹوں کا دلکش ساخم اور سرمگیں آنکھیں روزِ اول کی طرح وقار علی کو مسحور کرنے لگیں۔

''مجھ سے پوچھ رہے ہیں آپ؟ میں تو خود آپ کی زندگی میں آنے کے بعد اس لفظ کے ہجے تک بھول گئی ہوں۔''

''ایسا مت کہو تابی! ابھی تو زندگی کی رنگین شاموں اور حسین صبحوں کا آغاز ہے۔''

تابندہ نے اپنے شانوں پر اس کے آنچ دیتے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کیا تھا۔

''بعض لوگوں کے لئے آغاز ہی اصل میں اختتام ہوتا ہے وقار!''

''یہ بے اعتنائی کب تک تابی؟ تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی اس کڑی سزا کا شکار بنا رہی ہو۔''

''آپ اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہیں وقار! میں نے تو آپ پر کبھی بھی کوئی پابندی نہیں لگائی۔'' وہ بہت تحمل سے بولی تھی۔

وقار علی نے اسے شانوں سے تھام کر جھنجھوڑ ڈالا۔

''کہونا، تابی! کچھ تو کہونا۔ کیوں تم نے زندگی کو پچھتاووں کی رہ گزر پر ڈال دیا ہے؟ ابھی تو گلاب چننے کے موسم ہیں اور تم خزاں کو اپنے دل میں ڈیرہ ڈالنے کی اجازت دیئے بیٹھی ہو۔''

''گلاب چنتے چنتے ہی تو اس کانٹوں بھری رہ گزر پر نکل آئی ہوں وقار! پتہ نہیں کیوں..... کیوں میں نے یہ نہیں سوچا کہ گلاب کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ بعض اوقات گلاب تو صرف ایک سراب ہوتا ہے، اصل حقیقت تو اس کانٹے کی ہوتی ہے جو روح تک گڑ جاتا ہے اور پھر ساری عمر تکلیف دیتا رہتا ہے۔ پچھتاوے کی، ملامت کی۔''

اس نے کہا بھی تو کیا۔

وقار علی نے بے تابانہ اسے خود میں سمو لیا۔

''ایسا مت کہو تابی! میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ میں نے تو زندگی کا ہر خواب تمہارے ہمراہ دیکھا ہے۔ تمہارے بغیر تو میں کچھ بھی نہیں ہوں، کچھ بھی نہیں۔'' اس کے مُشک بُو بالوں پر ہونٹ رکھے وہ بے بسی سے کہہ رہا تھا۔

تابندہ کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔

اب دل نے ایک محبت پر خوش ہونا چھوڑ دیا تھا۔ بچھڑی محبتوں کی صدائیں سماعتوں پر اس قدر شور برپا کئے ہوئے تھیں کہ وقار علی کے تو صرف ہونٹ ہی ہلتے دکھائی دیئے تھے۔

صبا کے رونے کی آواز پر وہ فوراً پلٹ گئی تھی۔

وقار علی خالی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

آج وہ ویک اینڈ گزار کر واپس لاہور جا رہا تھا۔ صدیقہ بھابی اپنے بھائی کی شادی میں شرکت کے لئے گئیں تو اب اطلاع ملی کہ ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ ان دنوں وہ بھی ایک نئی زندگی کی تخلیق کے مراحل سے گزر رہی تھیں۔ بے جی نے فوراً تابندہ کو ان کی خیر خبر لینے جانے کا آرڈر دیا۔

فوزیہ نے تو صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔

''ہم سے تو یہ ٹکے ٹکے کی جی حضوریاں نہیں ہوتیں۔ یوں بھی ایسے وقت میں سو اونچ نیچ ہو جاتی ہے، سب کا دوڑے چلے جانا ضروری تو نہیں۔ ان کے میکے والوں کا حق بنتا ہے ان کی تیمارداری کرنا۔''

بے جی اس کی زبان داری پر ہق دق رہ گئیں مگر فوزیہ سے منہ ماری کرنے کا مطلب تھا رہا سہا بھرم بھی گنوانا۔ وہ چپ چاپ تابندہ کی طرف پلٹ آئیں جس نے بہت خوشی کے ساتھ جانے کی ہامی بھر لی تھی۔

لاہور جاتے ہوئے وہ تابندہ اور اعزاز علی کو نہ صرف صدیقہ بھابی کے ہاں ڈراپ کر گیا بلکہ جاتے جاتے بھابی کا حال احوال بھی دریافت کر لیا جو تابندہ کو سامنے پا کر ازحد خوش تھیں۔

''میری تو آدھی بیماری اسے سامنے دیکھ کر دور ہو گئی ہے۔''

''ہاں بھئی، سمدھن جو ہوئی۔'' وقار ہنسا تھا مگر بھابی نے فوراً اس کی تردید کر دی۔

''یہ سب سے پہلے میری بہن ہے، باقی ہر رشتہ بعد میں آتا ہے۔''

وہ جاتے ہوئے تابندہ کی گود میں خوابیدہ صبا پر جھکا اور اس کا رخسار چوم لیا۔ پھر مدھم آواز میں بولا۔

''میں بہت شدت سے انتظار کروں گا تابی! اس دن کا جب ہم دونوں کے درمیان کوئی غلط فہمی، کوئی بداعتمادی نہیں رہے گی۔ بس تم پہلے جیسی بن جاؤ، مجھ پر اعتبار کرو، میں تم سے دغا نہیں کروں گا۔''

اس کی آزردگی اور دل گرفتگی تابندہ سے مخفی نہیں تھی۔ پگھلتے دل کے ساتھ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا، وہ مطمئن سا پلٹ گیا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ آپ نے یہ سارا ڈرامہ مجھے یہاں بلوانے کے لئے ہی رچایا تھا۔ آپ تو کہیں سے بھی بیمار نہیں لگ رہیں۔'' تابندہ نے قہقہے لگاتی بھابی پر فقرہ کسا تو بھایا نے بھی اس کی تائید کی تھی۔ وہ مصنوعی خفگی سے بولیں۔

''تو کیا بیماری میں انسان خوش ہونا بھی بھول جائے؟''

''تو پھر بیماری میں خوش ہونے والی ٹپ چھوٹی بھابی کو بھی بتا دیں تاکہ یہ بھی ٹرائی کر کے دیکھیں۔'' اعزاز علی نے مسکراتے ہوئے تابندہ کی طرف اشارہ کیا تو وہ آزردگی سے مسکرا دی۔

(اور جس کی روح ہی بیمار ہو گئی ہو اعزاز علی۔ اسے خوشی سے کیا نسبت؟) وہ چار روز صدیقہ بھابی کے پاس رہی تھی۔ ان کے گھر والے بھی بہت خوش مزاج اور ملنسار تھے۔ اس قدر اپنائیت کے مظاہرے نے تابندہ کو بھی بہلا دیا تھا۔ اگلے روز بگڑتے موسم کے تیوروں کی پرواہ کئے بغیر اعزاز علی اسے لینے چلا آیا تھا۔

''کوئی ضرورت نہیں جانے کی۔ موسم کا حال دیکھو، بہت تیز بارش ہو گی آج۔'' صدیقہ بھابی نے تابندہ کے فوراً اٹھ کر تیاری پکڑنے پر قطعی انداز میں کہا تو اعزاز علی ان کا مذاق اُڑانے لگا۔

''آپ تو جیسے محکمہ موسمیات میں جاب کرتی ہیں۔ مگر بے فکر رہیں، وہ لوگ بھی آپ کی طرح تکے ہی لگاتے ہیں۔''

''واقعی، رحمتِ باری تعالیٰ تو اس کی مرضی اور اشارے پر ہی برسے گی نا۔'' صبا کو پیک کرتی تابندہ نے بھی مسکرا کر کہا تو وہ انہیں گھورنے لگیں۔

''یوں کہو کہ بس شکل دکھانے آئے تھے تم دونوں۔''

''پھر آؤں گی بھابی! انشاء اللہ۔ بس خدا سے خیر و عافیت مانگئے۔'' اس نے خلوصِ دل سے کہا تو وہ بھی مسکرا دیں۔ پھر اعزاز سے کہا۔

''اگر واپس ہی جانا تھا تو ذرا ٹائم پر آتے۔ پانچ تو یہیں بج گئے ہیں۔''

''یہ بے جی کا حکم تھا۔ میں تو کسی کام سے گیا تھا، انہوں نے کہا واپسی پر بھابی کو بھی لیتا آؤں۔ آپ بے فکر رہیں۔ گاڑی لے کر آیا ہوں میں۔'' اس نے جواباً انہیں مطمئن کیا تھا۔

''یہ تو صحیح کیا تم نے۔'' انہوں نے کہا اور تابندہ کے ہاتھوں سے صبا کو لے لیا جو اپنی اس جبری تیاری پر منہ بسور رہی تھی۔ صبا کو ان کی گود میں دیکھتے ہی عدیم بھاگتا چلا آیا تھا۔

''صبا کدھر جا رہی ہے؟''

اس کے تفتیشی انداز پر ان تینوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''یہ اپنے گھر جا رہی ہے۔'' اعزاز علی نے بھتیجے کو گود میں لیتے ہوئے اس کا سیاہ بالوں والا سر چوم لیا۔

''یہ نہیں جائے گی۔ خالہ کہتی ہیں اسے اب ہم نے لے لیا ہے۔''

''ابھی تو بیٹا جی ریزرویشن ہوئی ہے۔'' اعزاز بے ساختہ ہنسا تھا۔

''دیکھو تابندہ! کس قدر عقل مند ہے تمہارا داماد۔'' بھابی نے چھیڑنے والے انداز میں کہا تو وہ بھی ہنس دی۔

''تابی چچی! آپ بھی جا رہی ہیں؟'' وہ منہ بسور رہا تھا۔ حقیقتاً وہ تابندہ اور صبا کا والہ و شیدا تھا۔

''کیا کروں، نہ جاؤں؟'' تابندہ نے اس کے رخسار پر چٹکی بھرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا تو وہ مدبرانہ انداز میں بولا۔

''نہ جائیں۔ ابھی تو صبا کو گیمز بھی سکھانی ہیں۔''

''بیٹا جی! دل تھوڑا مت کریں تھوڑے دنوں میں آپ کو بھی وہیں آنا ہے۔'' اعزاز اسے اٹھائے ہوئے تسلی دینے لگا۔ پھر تابندہ کی طرف پلٹ کر بولا۔

''میں انتظار کر رہا ہوں۔ آپ تسلی سے تیاری پکڑیں۔''

وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

صبا کے تمام کپڑے اس نے سمیٹ کر بیگ تیار کر لیا تھا۔

''اپنا خیال رکھئے گا بھابی! میں آپ کے لئے بہت دعا کروں گی۔ خدا آپ کے لئے خیریت کا وقت لائے۔''

''میری فکر چھوڑو۔تم اپنا دھیان کرو، تمہاری ہم سب کو بہت ضرورت ہے۔خصوصاً صبا اور وقار کو۔ان خود ساختہ دکھوں اور پچھتاووں کے جال سے باہر نکل آؤ تابی! زندگی تو یوں بھی ہر کس و ناکس سے خراج وصولنے پر تیار رہتی ہے اور تم خود کو اتنی لاپروائی سے اس کے تند و تیز دھارے پر چھوڑے بیٹھی ہو۔''

انہوں نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے ہمیشہ کی طرح خوشیوں کی طرف بلا لیا تھا۔وہ مسکرا دی۔

پچھلی تین راتیں...... ان گزری تین راتوں میں سے کوئی بھی رات ایسی نہیں تھی جب وقار علی کی دل گرفتگی نے اسے بے چین نہ کیا ہو۔وہ خود مخمصے میں پڑ گئی تھی۔اپنے تئیں وہ خود کو ایک بہت مضبوط بے حسی و بے اعتنائی کے خول میں بند کر چکی تھی مگر حیران رہ گئی کہ اب بھی وقار علی کی بے بسی اسے بے چین کر جاتی تھی۔رات کو سونے سے پہلے اسے سوچنا جیسے روٹین کا ایک حصہ بن گیا تھا۔عورت کی مٹی میں شاید سب سے زیادہ معاف کر دینے اور محبت کرنے کا جذبہ گندھا ہوا ہے تبھی تو وہ ہر ظلم سہہ کر، ہر ستم برداشت کر کے بھی محبوب کی ایک نگاہ سے پگھلتی چلی جاتی ہے۔اولاد کا ایک آنسو اسے موم کر دیتا ہے۔شاید اسی لئے حالات کی چکی میں سب سے زیادہ پستی بھی عورت ہی ہے۔

وہ سب سے مل کر گاڑی میں آ بیٹھی۔صدیقہ بھابی کے تمام گھر والوں نے انہیں بے حد اپنائیت سے رخصت کیا۔بہت سے تحفے تحائف دے کر اپنی محبتوں کا اظہار کیا تھا۔

عدیم بے چارہ صبا کو جاتے دیکھ کر روہانسا ہو رہا تھا۔گاڑی چلنے تک اعزاز اسے تسلی دیتا رہا۔

''موسم تو واقعی خراب ہو رہا ہے۔'' صبا کو گود میں سنبھالتے ہوئے تابندہ نے تبصرہ کیا تو وہ لاپروائی سے بولا۔

''سو واٹ؟ اپنی گاڑی ہے تو پھر ڈر کیسا؟''

''پھر بھی راستہ تو خطرناک ہی ہے نا۔ذرا سی بارش ہو گئی تو سمجھیں گئے کام سے۔'' اس نے شام کے بڑھتے سایوں کو رات سے گلے ملتے دیکھ کر کہا مگر وہ مطمئن تھا۔

صبا کی قلقاریاں گاڑی میں گونج رہی تھیں۔باہر کی سردی سے لاپرواہ ہیٹر سے گرم ہوتے ماحول میں وہ کافی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔

''بچے کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں بھابی! نہ کسی غم کا احساس، نہ کسی خوشی کی پرواہ۔بس اپنے موڈ کے تابع۔جب جی چاہا ہنس لئے، جب جی چاہا رو دیئے۔دنیا کی کچھ فکر، کچھ پرواہ نہیں۔'' وہ رشک آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''میں نے تو زندگی سے وہ سبق پایا ہے اعزاز بھائی! کہ میرے نزدیک انسان کی بچہ رہنے ہی میں عافیت ہے۔چاہے زندگی میں اور کوئی رشتہ نہ ملے مگر والدین کا پُر شفقت سایہ تو برقرار رہے۔پھر تو کوئی دکھ، کوئی پریشانی نہ ہو کہ ماں باپ تو اولاد پر دکھوں کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیتے۔''

''یہی تو قدرت کا کھیل ہے بھابی! انسان کو زندگی میں ہر رشتے اور ہر رویے کو برتنا پڑتا ہے۔کسی سے فقط محبت ہی کی اُمید باندھ لینا تو خود غرضی ہی کہی جا سکتی ہے۔کیونکہ ہر انسان کی فطرت مختلف رنگوں سے گندھی ہوتی ہے۔مختلف رویوں کے اظہار میں فطرت کے رنگوں کی جھلک بھی ویسی ہوتی ہے۔'' وہ بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔اس کی باتیں تابندہ کے دل کو لگی تھیں۔

''میں تو اس دور سے گزر چکی ہوں۔مجھ سے اچھی طرح تو شاید کوئی بھی انسانی فطرت کے ان رنگوں سے واقف نہ ہوا ہو گا۔'' وہ آزردگی کی لپیٹ میں آ گئی۔

ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تو اعزاز علی نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا کر وائپر چلا دیئے جو تیزی سے ونڈ اسکرین پر بہتے قطروں کو سمیٹنے لگے۔

''یہ رنگ تو محبتوں کے رنگوں کو اور پکا کرتے ہیں بھابی! چھوٹی موٹی رنجشیں تو محبتوں کو بڑھاوا دیتی ہیں۔'' اس نے اپنی بات کا تسلسل جاری رکھتے ہوئے کہا تو وہ دل گرفتگی سے مسکرا دی۔

''رنجشیں بھی تب ہی محبتوں کو بڑھاوا دیتی ہیں جب تک کہ آپسی اعتماد و اعتبار کی فضا قائم رہے۔خصوصاً میاں بیوی کے رشتے میں۔کیونکہ جب فضاؤں میں بداعتمادی کا زہر پھیل جائے تو پھر سب سے پہلے محبت ہی کا سانس بند ہوتا ہے۔''

''آپ وقار کو بالکل غلط سمجھ رہی ہیں بھابی! وہ صرف جذباتی ہے، خصوصاً آپ کے معاملے میں اور بس۔اپنی جان سے بڑھ کر وہ آپ پر اعتماد کرتا ہے۔رنجشوں کو غلط فہمیوں میں تبدیل کرنا ازدواجی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہوتی ہے بھابی! یہ کوئی خونی رشتہ تو نہیں ہوتا نا۔یہ تو انسان کو جاننے، سمجھنے اور......'' وہ وقار علی کی حمایت میں بول اٹھا تھا مگر گاڑی کے بیچ سڑک میں ایک دم بند ہو جانے پر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''شٹ۔'' اس نے جھنجھلا کر اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا تھا۔

باہر بارش اپنے پورے عروج پر تھی اور سردیوں کی اس بارش نے ہر مکین کو اپنے مسکن میں دبے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

گاڑی اسٹارٹ کرنے کی ہر ممکن کوشش کے بعد وہ ذرا جھک کر ایریے کا اندازہ کرنے لگا۔پھر مسکرا کر بولا۔

''شکر کریں کہ کمرشل ایریا ہے تھوڑی دیر ہم اس ہوٹل میں بیٹھ سکتے ہیں۔اور شاید گاڑی بھی کوئی مکینک ٹھیک کر ہی دے۔''

تابندہ نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ ابھی قدرت نے اسے معاف نہیں کیا ہے۔

☆......☆

اس کی آنکھوں میں محبت کا ستارہ ہوگا
ایک دن آئے گا وہ شخص ہمارا ہوگا
جس کے ہونے سے مری سانس چلا کرتی ہے
کس طرح اس کے بغیر اپنا گزارا ہوگا
یہ اچانک جو اجالا سا ہوا جاتا ہے؟
دل نے چپکے سے تیرا نام پکارا ہوگا؟
عشق کرنا ہے تو دن رات اسے سوچنا ہے
اور کچھ ذہن میں آیا تو خسارہ ہوگا
کام مشکل ہے مگر جیت ہی لوں گا اس کو
میرے مولا کا وصی جوں ہی اشارہ ہوگا

وہ بہت زیادہ دیر کے لیے اٹھ کر شفق کے ساتھ لائبریری سے باہر نہیں گئی تھی مگر جب لوٹی تو فائل اٹھاتے اس کے ہاتھ ساکت ہو گئے۔

شفاف سی ہینڈ رائیٹنگ اور خوب صورت الفاظ شفق کاغذ پر جھکی تھی۔جب کہ صبیرہ نے بے ساختہ دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے گرد و پیش میں نگاہ دوڑائی۔

''یہ ایڈی ہی کا کام ہے۔'' شفق پر یقین تھی۔

''کوئی اور بھی تو شرارت کر سکتا ہے۔'' صبیرہ نے اس سے متفق ہونے کے باوجود اعتراض کیا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''وہی نیا نیا عشق میں پڑا ہے۔ابھی دیکھ لینا تم۔''

وہ دونوں لائبریری سے باہر نکل آئیں۔

ابھی انہوں نے کینٹین میں آ کر سیٹ سنبھالی ہی تھی کہ اسی وقت ایڈی کا گروپ بھی اندر داخل ہوا۔صبیرہ ارادتاً رخ موڑ کر شفق کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''ابھی تم بالکل خاموش رہنا جیسے پتہ ہی نہیں کہ یہ سب کس نے لکھا ہے۔'' شفق نے سرگوشی میں کہا تھا۔

وہ سب اپنی ٹیبل کے گرد بیٹھ گئے جب کہ ایڈی ان دونوں کی طرف چلا آیا۔

''ہیلو گرلز۔'' اس کے شگفتہ انداز پر صبیرہ نے فقط سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا جب کہ شفق نے ہائے ہیلو کے بعد حال احوال بھی پوچھ ڈالا۔

''اور کیا ہو رہا ہے آج کل؟'' وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔بے حد فریش اور پر سکون صبیرہ اسے فقط ایک نظر ہی دیکھ پائی تھی۔

''بس اب تو ہر وقت ایگزیمز کی ٹینشن سوار ہے ذہن پر۔'' شفق نے ٹھنڈی سانس بھری تو وہ سرسری انداز میں بولا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اب لائبریری کو باقاعدگی سے رونق بخشی جا رہی ہے؟'' اس کے سوال کے جواب میں شفق نے یوں چونکنے کی اداکاری کی جیسے اچانک کچھ یاد آیا ہو۔

''ارے ہاں، لائبریری سے یاد آیا۔ابھی کچھ دیر پہلے کیا تم بھی لائبریری میں تھے؟''

''کہاں، صبح سے ٹائم ہی نہیں ملا۔'' وہ مکر گیا تھا۔صبیرہ نے بے ساختہ شفق کی طرف دیکھا جس نے بہ مشکل اپنی مسکراہٹ دبائی تھی۔پھر قدرے آگے جھکتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولی۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہم دونوں بالکل صحیح بندے تک پہنچی تھیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ ناسمجھی کی سی کیفیت میں بھنوؤں کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے پوچھنے لگا تو وہ صبیرہ کی آنکھوں کے اشارے سے بے نیاز بڑے مدبرانہ انداز میں بولی۔

''کسی نے صبیرہ کی فائل میں بہت اچھی غزل لکھی ہے۔میں نے تو یہی سمجھا کہ تم نے لکھی ہوگی۔مگر صبیرہ نے کہا کہ ایک بلیک بیلٹ ہولڈر کا اس نازک صنف سے کیا

واسطہ۔ اور تمہارے بعد اس ڈیپارٹمنٹ میں ایک ہی بندہ رہ جاتا ہے۔ ابھی ابھی صبیرہ اس کا شکریہ ادا کر کے آرہی ہے۔

''کیا مطلب؟ کس کا شکریہ ادا کیا ہے اس نے؟'' وہ اچھل ہی پڑا تھا۔

''شہباز گردیزی کا۔'' شفق نے اطمینان سے کہا تو لمحہ بھر میں جہاں صبیرہ کے حواس گڑبڑائے وہیں ایڈی بھی ساکت رہ گیا۔

''تم شہباز گردیزی کا شکریہ ادا کر کے آرہی ہو؟'' وہ بے یقینی کے حصار میں تھا۔ بے ساختہ صبیرہ کو بھی اس شرارت نے لطف دیا تھا۔ کچھ کہے بنا خاموشی سے سر جھکا لیا۔

''اوہ مائی گاڈ۔'' ایڈی نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

''تمہیں کیا ہوا؟'' شفق نے معصومیت کی حد کردی تھی۔ وہ سر اٹھا کر کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر دانت پیس کر بولا۔

''میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ ہر وقت اس قدر حواس باختہ کیوں رہتی ہو؟'' وہ بات کرتے کرتے دفعتہً صبیرہ کی طرف پلٹا جو ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ پڑ رہی تھی۔

''اور تم، بے حد بے وقوف لڑکی ہو۔ سمجھ نہیں سکتی تھیں کہ وہ غزل میں نے لکھی ہے۔''

''ایکسکیوز می۔'' شفق کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ پھر شرارت سے بولی۔ ''میں ذرا آرڈر پلیس کر آؤں۔''

اس کے جاتے ہی وہ پوری طرح صبیرہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ جو فائل کور پر اپنی مخروطی انگلیاں پھیر رہی تھی۔

''ابھی تو تم نے کہا کہ تم لائبریری گئے ہی نہیں۔'' اس کے ہونٹوں میں دبی مسکراہٹ ایڈی کو زچ کرنے لگی۔

''تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ تم بھاگتی ہوئی اس خبیث کے پاس چلی جاؤ۔ یونیورسٹی میں ایک سو ایک باذوق آدمی ہیں۔ تمہیں اس اود بلاؤ کے علاوہ اور کوئی نہیں سوجھا؟ اور مجھے تو تم کسی گنتی میں لاتی ہی نہیں ہو۔''

اس کی جھنجھلاہٹ، جھنجھلاہٹ اور خفگی۔ بہت دلچسپ سے روپ تھے اس کی طبع کے۔ جنہیں صبیرہ نے بہت انجوائے کیا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی مضطرانہ کیفیت پر ترس بھی آگیا۔ یونہی نظریں جھکائے مدھم سروں میں بولی۔

''بہت غلط بات ہے یہ، لیکن آئندہ اگر کبھی تم نے اپنا نام نہیں لکھا تو میں ضرور شہباز گردیزی کا شکریہ ادا کرنے چلی جاؤں گی۔''

''سن ...... سنن۔'' اس کے جلتے ابلتے دل پر کسی نے سرد پانی کے چھینٹے مار دیے تھے۔ بے اختیار اس کی طرف دیکھا جو ہونٹوں کی تراش میں دلکش سی مسکراہٹ دبائے یقیناً اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ گہری سانس اندر کھینچتا وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اندر مچلتا انتشار یکلخت ہی سبک روی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

''بہت بری بات ہے صبیرہ علی۔'' اس نے متاسفانہ انداز میں سر ہلایا تھا۔ صبیرہ کی مسکراہٹ ڈھل گئی۔

''اور جو خود جھوٹ بول رہے تھے اس کا کیا؟''

''میں تو یونہی تنگ کرنے کے لیے مگر تم نے تو میرے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔'' وہ جیسے پھر اسی کیفیت کی گرفت میں آکر جھنجلایا تو وہ سنجیدہ ہوگئی۔

''آئی ایم سوری۔'' یہ شفق کی شرارت تھی۔

''شرارت؟'' وہ بھنویں اچکا کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر مدھم لہجے میں بولا۔

''بہت جان لیوا شرارت تھی۔ جان بھی جاسکتی تھی میرے رقیب کی۔'' قدرے توقف کے بعد اس نے کہا تو صبیرہ کی بھی ہنسی آگئی۔

''تھینک گاڈ مطلع صاف ہے۔'' شفق نے آتے ہی سکھ کا سانس لیا تھا۔

''بہت بری بات ہے شفق، تم تو سراسر بی جمالو کا رول ادا کر رہی ہو۔'' ایڈی نے اسے شرم دلائی تھی۔ جواباً وہ دونوں ہنسنے لگیں۔

''ثمین کو دیکھا ہے تم نے؟'' شفق کو یاد آیا تھا۔ ایڈی سنجیدہ ہوگیا۔

''فارگیٹ اٹ شفق۔''

''میں نے صبح اسے صباحت علوی کے گروپ کے ساتھ دیکھا تھا۔''

صبیرہ بھی آزردگی کا شکار ہونے لگی۔

''وہ ہماری دوست رہی ہے ایڈی۔'' شفق نے تاسف سے کہا تھا۔

''دوست وہ ہوتا ہے جو دوستی جیسے رشتے کو نبھانا جانتا ہو اور ثمین میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ سو فارگیٹ اٹ۔ اسے صباحت علوی جیسی دوست ہی کی ضرورت تھی۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

شفق کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ویسے ایڈی! تم انجوائے کرو گے ہی۔ تمہاری فینز کا گروپ جو بنتا جا رہا ہے۔ پہلے صباحت علوی کیا کم تھی کہ اوپر سے ثمین بھی ......''

''بی ہیو یو شفق۔'' صبیرہ نے اسے گھورا تو وہ سانس اندر کھینچتے ہوئے ایڈی کو دیکھنے لگی۔

''اب تم جا کر کچھ کھانے کو لے ہی آؤ تو بہتر ہوگا۔ اس سے پہلے کہ تمہاری صبیرہ بیگم مجھے کچا چبا جائیں۔''

''اف۔'' جہاں صبیرہ اس کے لڑھکتے پھسلتے جملے سے گڑبڑائی وہیں ایڈی نے بے ساختہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر داد دی تھی۔ خود شفق نے کرسی کھسکا کر خود کو صبیرہ کے جھانپڑ سے بچایا تھا۔

''بہت بے ہودہ ہوگئی ہو تم۔'' ایڈی کے جاتے ہی صبیرہ نے اس کی خبر لی تو وہ شرارت سے بولی۔

''شکر کرو بیٹھے بٹھائے تمہیں اس کی بیگم بنا دیا۔''

''شفق!'' اس کی رنگت سرخ ہو چلی تھی اور شفق اسے دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

ڈیپارٹمنٹ کی لابی میں ایڈی سے ٹکراؤ ہوگیا تو وہ اپنے گروپ کو آگے بھیجتا خود اس کی طرف چلا آیا۔

''اب کیا رہ گیا ہے کیمپس میں۔ سب ہی فری ہو گئے ہیں۔ ایگزیمز کی تیاری چل رہی ہے اور تم ......''

''مجھے لائبریری کی کچھ بکس واپس کرنا تھیں۔'' صبیرہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے وجہ بتائی تو وہ مسکرا دیا۔

''یا شاید خدا کو مجھے موقع دینا مقصود تھا کہ میں اور تم پورا دن کسی ظالم سماج کے خوف کے بغیر گپیں لڑا سکیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہوئی تھی۔ سبز و سیاہ پرنٹ کے لباس میں وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔ سادگی اور حیرت سے اس کی طرف دیکھتی وہ اسے اپنی روح سے بھی قریب تر محسوس ہوئی تھی۔

''مطلب یہ کہ آج شفق بھی نہیں آئی۔ سو مابدولت تمہیں کمپنی دینے کا شرف حاصل کریں گے۔'' اسے سامنے پا کر دل و ذہن پر مسحور کن سی آسودگی چھا رہی تھی۔ دماغ و دل معطر ہو چلے تھے۔

اور اس ایک دن نے ان دونوں کے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑے تھے۔ دلوں کا بندھن کچھ اور مضبوط ہوا تھا۔ جذبوں نے ایک دوسرے کی مزید پذیرائی کی تھی۔

''ویسے تو مجھ سے چھوٹی دو بہنیں بھی ہیں مگر میرے جیسی محبت کسی کو نہیں ملی۔'' ایڈی نے اسے بتایا تو وہ بے ساختہ اسے دیکھنے لگی۔

''میری تم سے متنفر ہونے کی سب سے بڑی وجہ تمہارا لڑکیوں کی آزادی پر تنقید میں آگے آگے ہونا تھا۔'' قدرے توقف کے بعد وہ سنجیدگی سے بولی تو وہ اس کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے ہنس دیا۔ پھر تصحیح کرتے ہوئے بولا۔

''آزادی نہیں صرف بے جا آزادی۔ خود میری ایک سسٹر پری میڈیکل اور دوسری پری انجینئرنگ میں ہے۔''

''ڈونٹ ٹیل می، ثمین تو کہہ رہی تھی کہ ......'' وہ تحیر آمیز انداز میں کہتے ہوئے رک سی گئی پھر گہری سانس لے کر درخت کے تنے پر پھدکتی گلہری کو دیکھنے لگی۔

''اس کائنات میں عورت کا بہت معتبر مقام ہے صبیرہ! میں اس کو ڈی گریڈ کرنے کا سوچ بھی کیسے سکتا ہوں۔ ہاں، مگر فطرت اور احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرنے والی عورتوں کو ضرور پوائنٹ آؤٹ کرتا رہوں گا۔ مگر یہ کبھی سوچنا بھی مت صبیرہ کہ میں نے کبھی بھی کسی لمحے میں تمہیں ڈی گریڈ کر کے سوچا ہو۔ میری صرف ایک ہی سوچ ایک ہی چاہت ہے۔ خود سے وابستہ تمام عورتوں کو جس میں میری ماں، بہنیں اور تم شامل ہو۔ اپنی پروٹیکشن میں رکھنا ہے۔

زمانے کا سامنا کرنا، گرم و سرد سہنا تو مرد کا کام ہوتا ہے۔ مجبوری کی بات الگ ہے۔ ورنہ میں کسی طور بھی عورتوں کے جاب کر کے خود مختار ہونے کے شوق کو پسند نہیں کرتا۔'' وہ سنجیدگی سے اپنا مطمع نظر واضح کر رہا تھا۔ اسے لگا جیسے تا عمر کڑی دھوپ میں چلتے رہنے کے بعد یکلخت ہی وہ گھنے سائے تلے آگئی ہو۔

تب اس نے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ مردوں کے حوالے سے اپنے باپ کے حوالے سے تمام محرومیاں اسے بتا دیں۔

''تمہاری امی ایک بے حد حوصلہ مند عورت ہیں۔'' اس نے کھلے دل سے سراہا تھا۔ وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرا دی۔

''اب تم یہ بتاؤ کہ میں اپنی امی کو تمہارے متعلق کب بتاؤں؟'' آزردہ سی فضا میں اس کے سوال نے جلترنگ سی بجا دی تھی۔

''کیا، کیا بتانا ہے میرے متعلق؟'' ناسمجھی کا تاثر دیتے ہوئے بھی وہ اپنی جلد تلے اٹھنے والے دیوں کی روشنی کو چھپا نہیں پائی تھی جس نے اس کی سنہری رنگت میں سرخی گھول دی تھی۔ وہ لحظہ بھر اس کو دیکھنے کے بعد ہنس دیا۔

''تمہیں ٹیوشن رکھنے کی بات تو نہیں کروں گا۔ آف کورس ہماری آئندہ زندگی کی۔''

''مجھے نہیں پتہ۔'' وہ عجیب سی حیا کے حصار میں آ گئی تھی۔ گھاس کے قطعے سے اٹھتی کپڑے جھاڑنے لگی۔

''او کے۔ یعنی گیند اب میرے کورٹ میں ہے۔'' وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

کام مشکل ہے مگر جیت ہی لوں گا اس کو
میرے مولا کا وصی جونہی اشارہ ہوگا

اس کی دھیمی سی گنگناہٹ نے صبیرہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

✡......✡

خوش قسمتی سے انہیں سنگل بیڈ والے دو کمرے مل گئے تھے۔ ابھی اعزاز علی انہیں کمرے میں پہنچا کر گیا تھا۔

تابندہ نے غوں غاں کر کے ہاتھ پاؤں چلاتی صبا کو بستر پر لٹا کر اس کے ارد گرد کمبل اس طرح پھیلا دیا کہ وہ بستر سے نیچے نہ گر جائے۔

''اس موسم کو بھی آج ہی خراب ہونا تھا۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئی بیگ کی زپ کھول کر اپنا نائٹ سوٹ نکالنے لگی۔ کپڑے چینج کر کے وہ بستر پر آئی تو کتنی ہی دیر صبا کے ساتھ کھیلتی رہی۔ بے معنی سی آوازیں نکال کر اس کی گفتگو کا حصہ بنتی رہی۔ جانے کب دونوں ہی نیند کی وادیوں میں اتر گئی تھیں۔

صبح وہ لوگ ہوٹل سے ناشتہ کر کے روانگی کو تیار ہوئے تھے۔ رات کی موسلا دھار بارش کے بعد اب مطلع بالکل صاف تھا۔

''یوں تو سورج نکل آیا ہے مگر راستہ ابھی بھی خراب ہوگا۔'' اعزاز علی نے تبصرہ کیا تھا۔ وہ صبا کو سنبھالتی فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھی۔

''گھر فون کیا تھا آپ نے؟''

''موبائل کے تو سگنلز ہی نہیں آ رہے تھے اور سٹیشن سے لائن ہی نہیں ملی گھر کی۔ شدید بارش کی وجہ سے شاید لائن ڈیڈ ہو گئی ہے۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔ تابندہ باہر چمکتی دھوپ اور نکھری سڑک کو دیکھنے لگی۔ پھر قدرے توقف سے بولی۔

''گھر میں سب پریشان ہوں گے۔''

''ڈونٹ وری بھابی! اور یوں بھی ہم نے کون سا آنے کی اطلاع کر دی تھی انہیں، جو وہ ہمارے نہ پہنچنے سے پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' وہ لاپروائی سے کہہ رہا تھا۔

تابندہ بھی مطمئن ہو گئی۔

مگر حویلی کے اندر قدم رکھتے ہی اس کے حواس جواب دے گئے تھے۔ فوزیہ شیرنی کی طرح اس پر جھپٹی تھی۔

''آ گئی ہے بے غیرت عورت، شرم نہیں آئی تمہیں ایسی گری ہوئی حرکت کرتے ہوئے۔ دیور کے رشتے کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ جانے کہاں کی خاک چھان کر یوں بے غیرتوں کی طرح منہ اٹھائے چلی آئی۔''

اس کے وجود میں حرکت کرنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔

اعزاز علی اس کا بیگ اور سامان لے کر پیچھے آ رہا تھا۔ یوں لڑکھڑاتے دیکھا تو بے ساختہ آگے بڑھ کر سہارا دے بیٹھا۔

''دیکھ لیں بے جی۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں آپ۔ میری تو دنیا اجڑ کر رہ گئی ہے۔'' فوزیہ چیخی تھی۔

''اعزاز علی! چھوڑ دو اسے۔'' بے جی کی سرد مہری نے کچھ نہ سمجھنے کے باوجود اعزاز علی کو خائف کر دیا تھا۔ وہ تابندہ کا بازو چھوڑتا دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''کیا ہوا ہے بے جی؟''

''ان سے کیا پوچھتے ہو ارے مجھ سے پوچھو۔'' بی جان نے جلبلا کر کہا تھا۔ پھر ماتھا پیٹتی ہوئی بولیں۔

''لعنت پڑے مجھ پر۔ میں نے بڑی بہن کی محبت میں اپنی نازوں پلی بیٹی تمہارے حوالے کر دی۔ ارے مجھے کیا خبر تھی کہ کیسی غلطی کرنے چلی ہوں میں اور یہ حرام خود جادوگرنی۔ ایک کو پھانسنے کے بعد دوسرے پر بھی نظر رکھ کر بیٹھ جائے گی۔ آج کھل گئی ساری حقیقت۔''

اعزاز علی پوری جان سے کانپ اٹھا۔

''بی جان......''

اس کی دہاڑ سے حویلی کے در و دیوار لرز اٹھے تھے۔

''اپنے حواس میں تو ہیں آپ کیسی فضول باتیں کر رہی ہیں؟''

اس کے چہرے پر ہی نہیں آنکھوں میں بھی خون اتر آیا تھا۔

''اب ہی تو عقل آئی ہے سب کو۔ تم دونوں کا اصلی چہرہ دیکھنے کے بعد۔'' فوزیہ نے تلخی سے بھرپور لہجے میں کہا تو ناطاقتی کا شکار بنی تابندہ پر جیسے وحشت طاری ہونے لگی۔

''بکواس بند کرو۔ خبردار جو ایک لفظ بھی کسی نے مزید کہا تو۔''

''دیکھ رہی ہیں بے جی۔ پوری رات ایک غیر مرد کے ساتھ گزارنے کے بعد بھی کیسی دیدہ دلیری کا مظاہرہ کر رہی ہے۔'' فوزیہ نے زہر خندہ لہجے میں کہا۔

نہ آسمان سر پر گرا تھا نہ زمین شق ہوئی تھی مگر پھر بھی اعزاز علی اور تابندہ نے قیامت کا غدر مچتے محسوس کیا تھا۔

''خبیث عورت۔'' اعزاز علی نے آگے بڑھ کر دہاڑتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ فوزیہ کے منہ پر تھپڑ مارا تو وہ اچھل کر دور جا گری۔

''ہا...... ہائے...... میری بچی۔'' بی جان تڑپ کر دہائیاں دیتی فوزیہ کی طرف لپکی تھیں جو اس وقتی صدمے سے ساکت پڑی تھی۔

''آپ بھی بے جی ان لوگوں کی باتوں میں آ کر یوں الٹا سیدھا بول رہی ہیں۔''

اعزاز علی کی آنکھوں میں سرخی اتری ہوئی تھی۔ صدمے اور بے یقینی نے اس کے بھی حواس معطل کر دیئے تھے مگر ان لمحات میں گھبرانے کا مطلب تھا ہر الزام کو سر لینا۔ جو اسے کسی طور منظور نہیں تھا۔

''کل صدیقہ کا فون آیا تھا کہ تم دونوں وہاں سے واپسی کے لیے نکل چکے ہو۔ نواز علی سے میری خود بات ہوئی تھی۔'' بے جی نے سرد و سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ تلخی سے بولا۔

''میرے ساتھ میری ماں جیسی بھابی تھی بے جی۔ انہیں بحفاظت گھر تک لانے کی ذمے داری میرے سر تھی۔ راستے میں گاڑی خراب ہو جانے کی وجہ سے ہمیں رات ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا۔ صبح ہوتے ہی ہم وہاں سے چل پڑے۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ یہاں اس قدر گری ہوئی سازش رچائی جائے گی۔''

''سب جانتی ہوں میں، ماں بہن کے رشتوں کے پردے پیچھے کون سے کھیل کھیلے جا رہے ہیں۔ اسے تو عادت ہے مردوں کو لبھانے کی اور تم جو اس کے پیچھے دم ہلاتے پھرتے ہو وہ بھی کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔'' فوزیہ چیخی تھی۔ جواباً اعزاز علی پھر سے اسے مارنے کو لپکا تو بے جی اور بی جان اسے روکنے لگیں۔

وہ ٹوٹتی جان کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی آئی اب تو یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے کند چھری سے ذبح کر دیا ہو۔ تکلیف کا احساس ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

یہ میں ہوں تابندہ ضیاء۔

ہر پل، ہر لمحہ اپنی عزت نفس کی حفاظت کرنے والی۔

اپنی انا کا جھنڈا بلند رکھنے والی۔ کس قدر بلندی سے بار بار گرا کر یہ لوگ مجھے چور چور کر رہے ہیں۔

کیا بن گئی ہے میری زندگی۔ ذلت و بے شرمی کا ایک نشان۔

وہ بے حس سی بن کر اندھیرے کمرے میں تکیے میں منہ چھپائے لیٹی تھی۔ کیا مجھے اس قدر شرمناک الزام کی صفائی پیش کرنی چاہیے؟

نہیں مر مٹنے کا مقام ہوگا میرے لیے۔

تقدیر کا یہ رخ بھی دیکھ لو تابندہ ضیاء! اس کے پہلو میں مسلسل ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ شدت گریہ سے نہ صرف اس کا گلا رندھ گیا تھا بلکہ آنکھیں بھی سوج گئی تھیں۔

''تابندہ بی بی! آپ کا فون آیا ہے۔'' اندھیرے کمرے کا دروازہ کھلا اور ملازمہ کی آواز گونجی۔ اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وہ وضاحتاً بولی۔

''چھوٹے صاحب کا فون ہے۔'' اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ تو یہ امتحان ابھی باقی ہے۔ یہ قیامت ابھی آنی ہے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر باہر آ گئی۔ ٹیوب لائٹس کی روشنی نے اس کی دکھتی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔ وہ کسی بے جان اور بے حس لاشے کی طرح فون کے پاس آئی تھی۔ فوزیہ کی آواز مسلسل اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔

''ایک ایک بات کھول کر بتا دی ہے میں نے وقار کو۔ اس بدکردار عورت کو وہ ٹھوکریں مار کر گھر سے نکالے گا۔ اب تو ایک ہی بات ہوگی بے جی، طلاق کی۔ میرے شوہر کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی تھی اور اس کے رنگ ڈھنگ تو وقار علی بھی دیکھ چکا ہے۔ آتے ہی فیصلہ ہوگا۔''

ملازمہ نے فون ہولڈنگ ٹیون پر لگا رکھا تھا۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا تو لیا مگر ہونٹوں سے ایک بھی لفظ نہیں ادا ہو سکا تھا۔ ہولڈنگ ٹیون ختم ہوتے ہی وقار علی کو اس کے آن لائن ہونے کا پتہ چل گیا تھا۔ سو اس کے بولنے کا انتظار کیے بغیر وہ بول اٹھا۔

''تابندہ۔''

''وقار۔''

جانے کیا تاثیر تھی۔ اس کے لہجے میں کہ وہ بے حسی کے لبادے سے باہر نکلتے ہوئے بلک اٹھی۔

''میں بہت تکلیف میں ہوں وقار، مر رہی ہوں میں، یہ لوگ مجھے جینے نہیں دے رہے وقار! میں بہت تکلیف میں ہوں۔'' اسے ایک مضبوط سہارے کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی پر تحفظ بانہوں کے حصار کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ جن میں سمٹ کر ہمیشہ ہی اس نے خود کو بہت محفوظ کیا تھا۔ مگر اس کی سماعتوں پر

جیسے بجلی سی گر گئی۔

''مجھے فوزیہ اور بے جی نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں صبح گھر واپس آ رہا ہوں اور آتے ہی سب سے پہلے میں تمہارا فیصلہ کروں گا۔''

پتہ نہیں لائن کٹ گئی تھی یا اسی نے فون رکھ دیا تھا۔

وہ کتنی ہی دیر بے جان ریسیور کو تھامے بیٹھی رہی۔ صدمے کی شدت نے اسے رونا بھلا دیا تھا۔

تو یہ تھی تمہاری کہانی ...... تابندہ وقار علی بننے کی کہانی۔

ایک سال اور دو ماہ۔

جن میں سے وہ گن کر خوشیوں بھرے پل بتا سکتی تھی۔

اور اس ایک سال اور دو ماہ کے لیے وہ اپنے ماں باپ کی تئیس برسوں کی محبت کو ٹھوکر مار آئی تھی۔

ان ظالم اور بد ذہنیت لوگوں کے لیے اس قدر چاہنے والوں کو چھوڑ آئی تھی۔

'اور اب تم فیصلہ کرو گے۔ وقار علی! تم ...... تم میرے ماتھے کو کلنک کے داغ سے سیاہ کرو گے۔'

وہ ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں اپنے کمرے میں آ گئی۔

''کتنی ہی دیر وہ غائب دماغی کی حالت میں ادھر اُدھر پھرتی رہی تھی۔ اس کا ذہن جیسے ایک ہی منظر پر اٹک گیا تھا۔ جب وہ سب اسے اور اعزاز علی کو مجرم ٹھہرا رہے تھے اور سماعتوں میں ایک ہی لفظ گونج رہا تھا۔ فیصلہ، فیصلہ وہ ٹوٹ کر روئی تھی۔

شاید آخری بار۔

پھر کبھی نہ رونے کے لیے۔

پھر کبھی نہ ٹوٹنے اور ٹوٹ کر بکھرنے کے لیے۔

'میں یہ ذلت کی سیاہی اپنی پیشانی کا مقدر بننے نہیں دوں گی وقار!'

اس نے اپنے اور صبا کے کچھ کپڑے ایک بیگ میں ڈالے۔ اپنے زیورات اور کچھ نقدی بھی ساتھ رکھ لی۔

پھر وہ کاغذ اور پین سنبھال کر بیٹھ گئی۔

سکون بے حد سکون۔

جانے کیسے ایک دم سے تمام جذبات میں ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔

وقار علی۔

میں نے تمہاری محبتوں کے بہت سے روپ دیکھے ہیں مگر تمہاری نفرت کا ایک بھی روپ دیکھنے کی مجھ میں تاب نہیں ہے۔ تم نے تو بہت آسانی سے فیصلہ کرنے کی بات کر ڈالی۔ اتنی آسانی سے تو ہمارا ملن بھی نہیں ہوا تھا۔ جس پیشانی پر تم ہمیشہ مہر محبت ثبت کرتے رہے ہو میں اس پر طلاق کا دھبہ برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ اس لیے تمہارے نام کو سدا کے لیے اپنے نام کے ساتھ لیے جا رہی ہوں۔ تم میری طرف سے ہر وعدے سے آزاد ہو مگر میں تاعمر تمہاری پابند رہنے کی سزا کاٹنا چاہتی ہوں۔

فقط

تابندہ وقار علی۔ جس نے کبھی صرف تمہاری چاہ میں ہر چاہت کو ٹھکرا دیا تھا اور آج دنیا نے اسے اپنی ٹھوکروں میں رکھ لیا ہے

دوسرا خط اس نے صدیقہ بھابی کے نام لکھا تھا۔

پیاری بھابی!

اس گھر میں واحد ہستی، جس نے مجھے بے غرض محبت دی۔ مگر آج میں اس دوراہے پر کھڑی ہوں جہاں آپ بھی میری کوئی مدد نہیں کر سکتیں۔ سو یہاں سے باعزت طریقے سے چلے جانے ہی میں میری بھلائی ہے۔ (اور حویلی والوں کی خوشی بھی) مگر میں کبھی بھی نہیں بھولوں گی کہ میری گود میں آپ کی امانت ہے۔ اس کا آپ سے رشتہ اٹوٹ ہے۔ یہ سدا عدیم ہی کے نام سے منسوب رہے گی اور مناسب وقت آنے پر آپ کی امانت آپ تک پہنچانے کی ذمے داری میرے سر ہے۔ مجھ سے بدگمان مت ہوئیے گا۔ میرے لیے آسانیوں کی دعا کیجیے گا بھابی! کیونکہ میرے لیے دعا کرنے والے لب تو خاموش ہو چکے ہیں۔

بدنصیب

تابندہ وقار علی۔

اس نے دونوں پرچے تکیے کے پاس رکھ دیے۔ بڑی سی گرم چادر لپیٹے صبا کو شانے سے لگائے دوسرے ہاتھ میں بیگ تھامے وہ کمرے سے نکلی تو لحظہ بھر کو اسے لگا جیسے بدن سے روح نکلنے لگی ہو۔

آنسوؤں نے پھر جانے کہاں سے نکاسی کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔

وہ جو اپنے تئیں اس غم اس بربادی پر تمام آنسو بہا چکی تھی۔ خود کو بے حسی کے خول میں قید کر چکی تھی۔

''بار بار کیا مرنا تابندہ، ایک ہی بار مکمل موت کیوں نہیں۔'' اس نے بارہا خود کو مضبوطی کا درس دینے کے بعد ہی جدائی کی اس راہ پر قدم رکھا تھا۔

مگر یہاں تو ہر قدم پر پیروں تلے دل آ رہا تھا۔

تمام وفائیں، تمام خواب۔

تمام محبتیں، تمام مان۔

آج ان سب کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

یہ پچھتاوے کا سفر تھا۔ واپسی کا سفر۔

حویلی کی سرد دیواروں میں خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔

جیسے تیسے وہ گیٹ سے باہر نکل آئی تھی۔

سرد رات کی دہشت اس کے اعصاب کو کشیدہ کرنے لگی۔ ذہن پہلے ہی پراگندہ ہو رہا تھا۔ اس پر مستزاد بچی کے ساتھ ساتھ بیگ کو بھی سنبھالنا رکشہ اسٹینڈ پہنچنے تک وہ نڈھال ہو چکی تھی۔

ایک ایک قدم پر وقار علی کی چاہتیں، محبتوں کی جنوں خیزیاں اور دلربائیاں یاد آتی رہیں۔

وہ جو ہر پل اس کی پازیبوں کی کھنک کو آس پاس محسوس کرنے کی دلکش خواہش رکھتا تھا۔

اڈے پر پہنچ کر اس نے وزیر آباد کی کوچ کا ٹکٹ لیا تھا۔

تن تنہا اتنی رات کو اکیلی عورت کا سفر کرنا بہت معنی خیز تھا مگر وہ اپنے ہی دکھ میں ڈوبی چادر میں چہرہ چھپائے نڈھال سی بیٹھی تھی۔

واپسی کے اس سفر میں ہر روزن وہ خود بند کرتی آئی تھی۔ سو اب کسی بھی طور ماں کے در پر واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

آدھی رات کو وہ منزل مقصود پر پہنچی تھی۔ رکشہ میں بیٹھ کر بوگن ویلیا سے ڈھکی دیواروں والے اس گھر کے سامنے اتر کر کتنی ہی دیر وہ یونہی کھڑی رہی تھی۔

پھر اپنی تمام تر ہمت مجتمع کر کے اس نے ڈور بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک تو اتر کے ساتھ بجنے والی بیل نے مکینوں کو یقیناً ہراساں کر دیا تھا۔

''کون ہے؟'' مردانہ آواز نے بارعب انداز میں پوچھا تو وہ آنسوؤں بھری آواز میں بولی۔

''میں تابندہ ہوں۔ تابندہ وقار۔''

چند لمحوں کے لیے دوسری جانب خاموشی چھا گئی تھی پھر کسی نے بہت بے تابی سے گیٹ کھول دیا۔ مرد کے پیچھے کھڑی عورت تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ ٹٹولنے لگی۔

''تابی ...... تابندہ ......''

وہ حیرت و بے یقینی کے سمندر میں غرق تھی۔ پھر وہ تابندہ سے لپٹ گئی۔

یہ سمیرا تھی، اس کی بہترین سہیلی۔

خدا کے بعد اس کی آخری امید اور آخری سہارا۔

''آپ بیڈروم میں جائیں۔ میں تابندہ کے پاس ہوں۔'' سمیرا نے اپنے شوہر کو آنکھ کا اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ وہ تابندہ کو دوسرے بیڈروم میں لے آئی تھی۔

''یہ سب کیا ہے تابی۔ تم اتنی رات کو ایسی بے سروسامانی کے عالم میں؟'' سمیرا کی پریشانی دیدنی تھی۔

اور تمام راستے بہت بہادری کا مظاہرہ کرتی آنے والی تابندہ یوں ٹوٹ کر روئی جیسے تمام عمر کے آنسو ابھی بہا دینے کا ارادہ ہو۔ حالانکہ وہ خود سے اب کبھی نہ رونے کا عہد کر چکی تھی۔ مگر یہ احساس تو ابھی ابھی جاگا تھا کہ جب جب زندگی میں وقار علی کی یاد آئے گی۔ اس کے دل کی بنجر دھرتی میں یونہی غدر مچے گا۔ لہروں کی شوریدہ سری یونہی اپنا زور دکھائے گی اور آنکھوں کی دھرتی پر ساون کا موسم اترا کرے گا۔

اس کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی۔ منہ سے ایک بھی لفظ ادا نہیں ہو رہا تھا۔

"میرے خدا۔" سمیرا پریشانی کے عالم میں بھاگتی ہوئی کچن میں گئی۔ جلدی سے دودھ گرم کر کے گلاس میں ڈالا اور لے آئی۔ اس کے انکار کے باوجود سمیرا نے اسے دودھ کے ساتھ نیند کی ٹیبلٹ بھی کھلا دی۔

"صبح بات کریں گے۔ ابھی تمہیں ایک اچھی اور فوری نیند کی سخت ضرورت ہے۔" اس نے کمبل میں لیٹی معصومیت سے سوئی صبا کو اپنی گود میں لے لیا تھا۔ تابندہ کی شدت گریہ سے سرخ ہوتی سوجی آنکھوں کو دیکھ کر خود اس کا دل جیسے کوئی مٹھی میں بھینچ رہا تھا۔

ان کہی، ان سنی ہر بات سمجھ میں آ رہی تھی۔

⁂ …… ⁂

اور پھر سمیرا نے دوستی کے تمام تقاضے نبھائے تھے اس کے شوہر جاوید نے بڑے بھائیوں جیسا مان دیا۔ اسے اسٹیبلش ہونے کے مواقع دیئے۔ جس روز اسے ایک بہترین انگلش میڈیم میں جاب ملی اسی روز اس نے سمیرا کو انیکسی کا کرایہ تھما دیا۔

"بہت بری ہو تم تابی۔" وہ خفا ہونے لگی تھی۔

"پلیز سمیرا، ورنہ میری انا گوارہ نہیں کرے گی یوں تمہارے ہاں رہنا۔" وہ بے حد سنجیدہ تھی اور پھر سمیرا کو ہار ماننا ہی پڑی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ تابندہ کو سمجھانے کا کام بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔

"اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے سمیرا۔ میں ماضی کے صفحات کو پھاڑ کر کتاب زندگی سے الگ کر چکی ہوں۔" اس نے سختی سے کہا مگر دل میں اٹھنے والی ٹیسیں ابھی تک زخم تازہ کا پتہ دے رہی تھی۔

"یہ مت بھولو تابندہ کہ تمہارا ہی نہیں بلکہ تمہاری بیٹی کا نصیب بھی اسی چوکھٹ سے جڑا ہے۔" سمیرا نے بہت دلخراش حقیقت اس کے سامنے لا رکھی تھی جس کے خیال نے اسے لحظہ بھر کے لیے ساکت کر دیا۔

"اپنے اس سفر میں تم کہیں بھی پہنچ جاؤ تابی مگر صبا کے لیے واپسی کا دروازہ کھلا ہی رکھنا۔" اس نے بہت خلوص کے ساتھ مشورہ دیا تھا۔ جسے تابندہ نے اپنے پلو سے باندھ لیا۔

رشتوں کی تمام زنجیریں توڑ کر وہ پوری طرح صبا میں گم ہو گئی تھی۔

اور پھر وہ وقت بھی آیا جب وہ ساڑھے تین سالہ صبا کو اپنے ہی اسکول میں داخل کرانے لے گئی۔

تب ہاں تبھی اس کے قلم کی خفیف سی جنبش نے صبا علی کو صبیرہ علی میں تبدیل کر دیا۔

صبیرہ علی، وقار علی کی بیٹی اور نواز علی کی بہو۔

بھلا کاتب تقدیر کے لکھے کو کوئی پڑھ سکتا ہے کبھی؟

⁂ …… ⁂

آج پھر حویلی کے در و دیوار میں تئیس برس پہلے والی آوازیں گونج اٹھی تھیں۔ بس کردار تبدیل ہو گئے تھے۔

"حد ہوتی ہے اس قدامت پرستی کی والدہ صاحب۔" وہ غصے میں یونہی طنزیہ ادب پر اتر آیا کرتا تھا۔ اب بھی جھنجلا کر کہتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

صدیقہ بھابی نے نظر بھر کر اپنے اونچے لمبے خوبرو بیٹے کو دیکھا اور ہاتھ تھام کر پھر سے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"یہ ہماری خوب صورت روایتیں ہیں بیٹا جی۔ جن کی پاسداری کرنا ہمارا فرض ہے۔"

"چاہے اس فرض کی ادائیگی میں کسی کی زندگی کی پونجی لٹ جائے۔" وہ حد درجہ خفا تھا۔

"عدیم۔" وہ ماں تھیں۔ لمحہ بھر ہی میں پگھلنے لگیں۔

"یہ کوئی انکشاف تو نہیں ہے تمہارے لیے۔ تم تو اسی حقیقت کے ساتھ بڑے ہوئے ہو کہ تم شروع ہی سے کسی سے منسلک ہو چکے ہو۔ اس دنیا میں کوئی ہے جو تمہارے نام سے وابستہ ہے۔"

"مگر کہاں ہے امی جان؟ ایک ہیولا، ایک یاد اور بس۔ قدموں کے نشان تک تو نہیں ہے کہ کوئی سراغ ہی مل جائے۔ اگر انہیں ایسی ہی اس رشتے کی چاہ ہوتی تو وہ کبھی نہ کبھی زندگی میں ایک بار ہی سہی ہم سے رابطہ ضرور کرتیں۔" وہ تلخی سے کہہ رہا تھا۔

"تابندہ نے خط لکھا تو تھا میرے نام، اس نے صاف لفظوں میں لکھا تھا کہ وہ چاہے جہاں کہیں بھی رہے۔ صبا کے ساتھ ہمارا رشتہ اٹوٹ ہے۔ مناسب وقت پر وہ خود ہم سے رابطہ کر لے گی اور ہماری امانت ہم تک پہنچا دے گی۔" انہوں نے اطمینان سے کہا تو وہ بے اطمینان ہونے لگا۔

"اٹس اینف والدہ صاحب؟ یعنی نہ جان نہ پہچان بی خالہ سلام۔ ایسے ہی کیسے ہم اتنے سالوں کے بعد کسی انسان کو آنکھیں بند کر کے قبول کر سکتے ہیں؟"

"تابندہ اور اس کی بیٹی کو کر سکتے ہیں۔" وہ بے لچک انداز میں بولیں تو وہ سنجیدہ سا اٹھ کھڑا ہوا۔

"مگر میں نہیں کر سکتا۔ اپنی زندگی کے اس اہم ترین فیصلے کو میں کسی سمجھوتے کی نظر نہیں کرنا چاہتا۔ پتہ نہیں اس لڑکی کے ہم سب کے متعلق کیا خیالات ہیں اور شاید اچھے بھی ہوں مگر میں اس خوامخواہ کے رشتے کو تاعمر گلے کا ڈھول نہیں بنانا چاہتا۔ شادی میں اپنی پسند کی لڑکی سے کروں گا اور آپ میرے ساتھ اس کے گھر چلیں گی۔"

"فضول باتیں مت کرو عدیم! تم کوئی چھوٹے بچے نہیں ہو جسے اس طرح کی باتیں سمجھانی پڑیں۔ تمہیں شروع ہی سے اس رشتے کے متعلق بتانے کا مقصد یہی تھا کہ تم اپنے آپ کو منسلک سمجھو۔" انہیں غصہ آ گیا تھا مگر وہ اثر لیے بغیر آرام سے بولا۔

"میں ان خیالی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ اب اگر وہ واپس نہیں لوٹتی تو میں ساری عمر کنوارہ تھوڑی بیٹھا رہوں گا۔ سو کل بھی شادی کرنی ہے۔ آج ہی کیوں نہیں۔ آپ میری پسند کی لڑکی سے ملیں گی تو داد دیں گی میری نظر کی۔"

"میں صبا سے ہٹ کر کسی اور کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی۔ وقار کو پتہ چلا تو اسے شدید دکھ پہنچے گا۔"

انہیں صدمے نے گھیر لیا تھا۔ عدیم کو ان کی طرف دیکھتے ہی ان کی حالت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے ان کے ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام کر ہونٹوں سے لگا لیے۔ پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"یہ رشتہ یوں جذباتی ہو کر طے کرنے والا نہیں ہوتا ہے۔ بہت مضبوط مگر اتنا ہی نازک بندھن ہوتا ہے۔ ہماری حویلی میں تو مثالیں موجود ہیں۔ چھوٹے چاچو اور تابی چچی ہی کو لے لیں۔ ان کی جذباتیت نے کس قدر رد کھ دینے والا رنگ دکھایا تھا اور بڑے چاچو اس قربانی دینے اور سمجھوتہ کرنے کے کھیل میں سب سے زیادہ نقصان تو انہی کا ہوا تھا۔ چھوٹے چاچو کی خوشیوں کی خاطر اپنی محبت کی قربانی دے کر وہ زندگی میں پہلی بار جذباتی فیصلہ کر گئے تھے۔ مگر اسی فیصلے نے ان کی زندگی برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ فوزیہ چچی نے ان کا جینا حرام کر دیا تھا۔ وہ بھی پچھتائے تھے اپنے فیصلے پر۔ نہ تو ان کی قربانی چھوٹے چاچو کا گھر بسا سکی اور نہ ہی وہ خاندان کو جوڑ کر رکھ پائے۔ نتیجتاً تابی چچی کے جانے کے اگلے ہی روز انہوں نے فوزیہ چچی کو طلاق دے دی۔ خود چھوٹے چاچو دل میں پتہ نہیں کیسی خلش اور ملامت لیے ملکوں ملکوں دربدر ہوتے پھرتے ہیں۔ یہ تو آپ کی اور پاپا کی کرم فرمائی ہے جو فوزیہ چچی کی دوسری شادی ہو کر آسٹریلیا جاتے ہی بڑے چاچو کے دل کی دنیا پھر سے بسا دی۔ نوشابہ چچی نے انہیں صحیح معنوں میں خوشیوں بھری زندگی دی ہے۔ نوروز نے آج تک انہیں سوتیلی ماں نہیں کہا ہے۔ مان لیں امی، مجبوری اور زبردستی کے سودوں میں کبھی بھی دل کا تعلق نہیں بندھ پاتا۔ صبا یقیناً ایک اچھی لڑکی ہوگی مگر ہر اچھی چیز ہمارے لیے تو نہیں ہوتی نا۔ میں اس اہم ترین رشتے کو بے ایمانی کی بنیاد پر استوار نہیں کرنا چاہتا کہ میرے دل میں کوئی اور بستا ہو اور زندگی میں کسی اور کے ساتھ بسا لوں۔ کم از کم میں تو اپنی لائف میں کسی خاتون کو یوں ڈی گریڈ کرنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔"

اس نے نہایت غیر جذباتی انداز میں بات ختم کی تھی۔

"اور وہ جو ساری عمر سے تمہارے نام پر بیٹھی ہے؟" انہوں نے تلخی سے کہا تو چند ثانیوں تک پلک جھپکائے بغیر انہیں دیکھتے رہنے کے بعد وہ آہستگی سے بولا۔

"مگر آپ یہ بھی تو پسند نہیں کریں گی کہ اس گھر میں ایک بار پھر فوزیہ اور اعزاز علی کی کہانی دہرائی جائے۔"

وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

⁂ …… ⁂

اگلے ایک ماہ بعد نہ صرف ایگزیمز بخیر و عافیت گزر گئے بلکہ ایک سنہری سی شام زارا اور ثوبان بھی واپس لوٹ آئے۔

زارا نے آتے ہی اسے فون کیا تھا۔

"کل تم سارا دن میرے ساتھ گزارو گی۔ شفق کو بھی فون کر دوں گی۔" اس نے بڑے رعب سے کہا تو وہ ہنس دی۔

"بڑی پریکٹس ہو گئی ہے رعب جھاڑنے کی۔"

"شادی کے بہت سے فائدوں میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے۔" وہ بے فکرے پن سے کہہ رہی تھی۔ پھر اسے متنبہ کرنے والے انداز میں بولی۔

"تم لازمی آ رہی ہو۔"

"کل تو میں گھر جا رہی ہوں یار۔ امی کو اطلاع بھی کر دی ہے۔" صبیرہ نے معذرت خواہانہ انداز اپنایا مگر اس نے بنا متاثر ہوئے ڈانٹ دیا تھا۔

"کسی قسم کی کوئی معذرت اور کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ کل تم آ رہی ہو شفق تمہیں پک کر لے گی ورنہ میں ثوبان کو بھیج دوں گی۔"

"اوکے۔" صبیرہ نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ پھر اس سے کہہ دیا۔ "شفق سے کہنا مجھے پک کر لے۔"

"اوکے، کل ملاقات ہوگی۔" چند ایک مزید باتوں کے بعد زارا نے خدا حافظ کہا تھا۔

وہ خوشگوار سے احساس میں گھری اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کوریڈور میں صباحت علوی کے کمرے کے پاس ثمین ایک اور لڑکی کے ساتھ کھڑی تھی۔ صبیرہ کو دیکھ کر تنفر سے سر جھٹکتے ہوئے اس نے جس طرح رخ موڑا تھا اس نے صبیرہ کو شدید تاسف کا شکار کیا تھا۔

زارا کی شادی سے فارغ ہونے کے بعد ہوسٹل واپس آئی تو اسے معلوم ہوا کہ ثمین اپنا روم تبدیل کر چکی ہے۔ اب صبیرہ کے کمرے میں ایک دوسری لڑکی سعدیہ گل رہتی تھی جو اس قدر کم گو اور اپنے آپ میں گمی رہنے والی پڑھاکو سی لڑکی تھی کہ صبیرہ کے ساتھ اس کی سلام دعا سے آگے کبھی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔

اس کے خوشگوار احساسات پر آزردگی کی تہہ جمنے لگی اور ایسا ہر اس وقت ہوتا تھا جب اس کی ثمین پر نظر پڑتی تھی۔

'مجھے صبح کے لیے کپڑے نکال لینے چاہئیں۔'

اس نے بہ مشکل اپنا دھیان بٹانے کی کوشش شروع کی تھی۔

'کل زارا کے گھر سے امی کو فون کر دوں گی۔ شام تک شاید واپسی ہو ہی جائے۔ بہتر ہوگا کہ اپنا سارا سامان زارا ہی کی طرف لے جاؤں وہیں سے چلی جاؤں گی۔ پتہ نہیں ایڈی، کیا پتہ وہ بھی وہیں ہو۔ اچھا ہے جانے سے پہلے اس سے ملاقات ہو جائے گی۔ ایگزیمز کے دوران تو بس اس کی شکل ہی دیکھنے کو ملی ہے۔ کوئی بات نہیں ہو پائی۔'

اگلے دن زارا کے گھر پہن کر جانے والے کپڑوں کی سلیکشن کے دوران اس کی سوچیں بہت روانی سے ایڈی کو سوچ رہی تھی۔ ثمین کا خیال ذہن سے محو ہو چکا تھا۔

اگلے روز شفق نے اسے پک کر لیا تھا۔ صبیرہ نے ڈرائیور سے کہہ کر اپنا بیگ اور سوٹ کیس ڈکی میں رکھوا دیا۔

''یہ اچھا کر رہی ہو۔ دوبارہ ہوسٹل کا چکر نہیں لگانا پڑے گا۔'' شفق نے اس کی تیاری کو سراہا تو وہ مسکرا دی۔

زارا کے گھر میں ایک پر لطف سی محفل ان کی منتظر تھی۔

''کتنی خوب صورت ہو رہی ہو تم زارا۔'' صبیرہ نے اسے گلے لگاتے ہوئے حیرت بھری سرگوشی کی تو وہ ہنسنے لگی۔ ثوبان بھی بہت فریش اور اچھا لگ رہا تھا۔

آغا جان نے ان دونوں کا خاص طور پر حال احوال پوچھا تھا۔

''زارا! میں ذرا امی کو فون کر لوں۔'' اس نے آہستگی سے پوچھا تو زارا نے اسے گھور کر دیکھا پھر سرزنش کرنے والے انداز میں بولی۔

''تمہیں آتے ہی سب سے پہلے یہی کام کرنا چاہئے تھا اور آنٹی سے یہ بھی کہہ دینا کہ تم چند روز یہیں رہو گی۔'' وہ محض سر ہلا کر اٹھ گئی وگرنہ اس کا زارا کے مشورے پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ امی کے ساتھ ساتھ اس نے ثانیہ بھابی سے بھی بات کی تھی۔ امی نے اسے تختی سے شام کے وقت سفر نہ کرنے کی ہدایت کی جسے اس نے فرمانبرداری سے مان لیا۔

''بہت اچھا، تو پھر آج میں زارا کے ہاں ہی رکوں گی۔ صبح واپس آؤں گی۔'' وہ فون رکھ کر اٹھی تو پلٹتے ہی ٹھٹک جانا پڑا۔

وہ سینے پر بازو لپیٹے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''بہت بری بات ہے یوں چھپ کر کسی کی باتیں سننا۔'' پہلے حیرت کو جھٹکتے ہوئے صبیرہ نے مسکراہٹ دبا کر کہا تو اس کی مسکراہٹ کی دلکشی اور بڑھ گئی۔

''کسی کی باتیں سننا بری بات ہو سکتی ہے مگر تم نے یہ وضاحت نہیں کی کہ اگر کوئی اپنی بات کر رہا ہو تو؟'' وہ بات کرتے ہوئے دو قدم آگے بڑھ آیا تو اس کی سیاہ آنکھوں میں کروٹیں لیتی شرارت صبیرہ کو سٹپٹا گئی۔ وہ اپنی ہی بات کا شکار بن گئی تھی۔

''تم کب آئے؟'' اس کی گھبراہٹ صاف ظاہر تھی ایڈی ہنسنے لگا۔

''اسی وقت جب کوئی کسی سے باتیں کر رہا تھا۔''

صبیرہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میں تو سوچ رہا تھا کہ شاید تمہارے جانے سے پہلے اب تم سے ملاقات ہی نہیں ہو پائے گی۔ ہوسٹل آنے کا سوچا مگر پھر اس خیال کو بھی ریجیکٹ کر دیا کیونکہ تم پسند نہیں کرتیں مگر دیکھ لو۔ مجھ سے ملے بغیر تمہارا جانا خدا کو بھی منظور نہیں تھا۔''

وہ پلکیں جھکا کر رہ گئی۔ خود اس نے بھی تو کتنی ہی دعائیں مانگی تھیں کہ جانے سے پہلے ایڈی سے ایک بار ملاقات ہو جائے۔

''امی تمہارے گھر آنا چاہتی ہیں۔ تمہاری امی سے ملنے اور تمہیں دیکھنے کے لیے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ صبیرہ ہونق سی اسے دیکھنے لگی تو اس نے وضاحت کی۔

''میں کہاں تمہارے لیے شہر میں منادی کراتا پھروں گا، کوئی اتہ پتہ کوئی کنٹیکٹ نمبر، کچھ تو دیتی جاؤ۔''

صبیرہ نے گہری سانس لی تھی پھر بظاہر بڑی لاپروائی سے بولی۔

''ڈھونڈنے والے تو سمندروں کی تہہ سے موتی نکال لاتے ہیں۔ ایک انسان کیا چیز ہے۔''

''تو پھر مان لو میری پارکھ نظر کو۔ کروڑوں کی آبادی میں سے میں نے اس لڑکی کو ڈھونڈ لیا جسے خدا نے میرے لیے ہی دنیا میں بھیجا ہے۔'' وہ دوبدو بولا تھا۔ صبیرہ کو لگا اس کے چہرے سے آگ کی لپٹیں چھو گئی ہوں۔ وہ اس کی شکل دیکھ کر آہستہ سے ہنس دیا۔ پھر شرارت سے بولا۔

''اب اگر تم اپنا ایڈریس دے ہی دو تو بہتر ہوگا۔''

''بہت فضول ہو تم۔'' وہ اپنی مغلوب سی کیفیت پر چڑ کر اسے ڈانٹ گئی پھر یونہی خفا خفا سی اس کے پاس سے گزر کر اندر جانے لگی تو وہ بلا ارادہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے روک گیا۔

''آئی ایم سوری۔''

اگلے ہی پل اس کی آنکھوں میں لدتی حیرت نے ایڈی کو خفیف سا ہو کر اس کا ہاتھ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''اٹس او کے اندر چلیں۔'' صبیرہ نے اس کی خجالت سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا تو وہ شانے جھٹکتا اس کے ساتھ چل دیا۔

''ویری گڈ، آج تم یہیں رہو گی اور صبح میں اور ثوبان خود تمہیں چھوڑ کر آئیں گے۔'' زارا نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

''اور بھئی، کیا سوچا ہے تم لوگوں نے آئندہ زندگی کے بارے میں؟'' بڑوں کے اٹھ جا بیٹھنے کی وجہ سے ثوبان پوچھ گچھ کرنے میں آزاد تھا مگر صبیرہ یوں براہ راست نشانہ بننے پر کٹ کر رہ گئی۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ ہم نے تم سے آئندہ کی پلاننگ پوچھی ہے؟'' ایڈی نے بہت اطمینان سے اس کا سوال اسی پر الٹ دیا تھا مگر وہ ثوبان ہی کیا جو شرمندہ ہو جائے۔ آرام سے بولا۔

''تو پوچھ لو۔ میں بتانے کو تیار ہوں۔''

زارا جزبز سی اسے گھورنے لگی تو وہ دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس دیئے۔

کھانا کھاتے ہی شفق اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''ڈرائیور آچکا ہے اگر آج خالہ کو رہنا نہیں ہوتا تو میں بھی یہیں رک جاتی۔'' اس نے اپنی مجبوری بیان کی تھی گھر میں آئے مہمانوں کی وجہ سے اسے جانا پڑ رہا تھا۔

''صبی پلیز اچھی سی چائے، تم سے اچھی تو کوئی بھی نہیں بناتا۔'' ثوبان نے زارا سے فرمائش کی اور اس نے صبیرہ کی طرف شفٹ کر دی۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے اٹھ گئی اور ساتھ ہی شگفتہ انداز میں کہا۔

''ضرور بناؤں گی، مگر اس کے بعد ڈاکٹر یقیناً تم لوگوں کو چائے پینے سے منع کر دے گا۔''

''چہ...... چہ...... تیرا کیا بنے گا ایڈی؟'' ثوبان نے ہمدردانہ انداز میں ایڈی کی طرف دیکھا تو وہ بھی تاسف سے سر ہلانے لگا۔ صبیرہ جھینپ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

''کیا سوچا ہے تم نے صبیرہ کے متعلق؟'' ثوبان نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے پوچھا تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

''سوچنے کی کیا ضرورت ہے جب ہر بات پہلے سے طے ہے۔ میں اسے زندگی بھر کے لیے ہمسفر بنانا چاہتا ہوں۔''

''صبی نے کیا کہا۔ اقرار کیا ہے اس نے؟'' زارا کے اشتیاق سے پوچھنے پر وہ مسکرا کر بولا۔

''انکار بھی نہیں کیا۔''

''بات تو وہی ہے نا، نہ انکار نہ اقرار۔ آدھے میں لٹکے ہوئے ہو۔'' ثوبان نے اس کا مضحکہ اڑایا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ اگر اجازت ہو تو تمہارے کچن میں جھانک لوں؟'' اس نے زارا سے پوچھا تو اس نے ہنستے ہوئے اجازت دے دی۔

وہ فریج میں سے دودھ کا پیکٹ نکالنے کو پلٹی تو اسے دروازے کے فریم کے ساتھ ٹیک لگائے سینے پر بازو لپیٹے کھڑا دیکھ کر ڈر سی گئی۔

''تم نے تو ڈرا ہی دیا مجھے۔''

''ارے اور میں خوامخواہ اپنی ڈیشنگ پرسنالٹی کے قصے سن کر خوش ہوتا رہا۔'' وہ چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہنس دیا۔ سیاہ جینز اور سفید ٹی شرٹ کی ہاف سلیوز میں اس کا ورزشی سراپا نمایاں ہو رہا تھا۔ چہرے پر چھائی بےفکرے پن کی لالی اور سیاہ آنکھوں کی صحت مندانہ چمک دیکھنے لائق تھی۔ وہ بےخیالی میں اسے دیکھے گئی۔ ایڈی نے کھنکارتے ہوئے اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی تھی۔

''پھر تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں؟'' وہ بےحد شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

صبیرہ کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ یکلخت ہی شدید شرمندگی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ فریج میں سے پیکٹ نکال کر وہ فی الفور پٹ کر ساس پین میں ابلتے ہوئے قہوے میں دودھ انڈیلنے لگی۔ اس کے ہاتھ کی خفیف سی لرزش ایڈی سے مخفی نہیں رہ سکی تھی۔ وہ اس کے برابر آکھڑا ہوا۔

”صبیرہ! مجھ سے شادی کروگی۔“

کائنات کی نبض تھم سی گئی تھی۔

یوں لگا لحظہ بھر کو ہر آواز خاموش ہوگئی ہو۔ وقت کی دوڑ رک گئی ہو۔

صبیرہ نے اپنی دھڑکنوں کو کانوں میں بجتا محسوس کیا تھا۔

”پلیز صبیرہ، کیا میں سمجھ لوں کہ تم بھی زندگی کے سفر میں میرے ساتھ کی متمنی ہو؟“ وہ منتظر تھا۔

صبیرہ کے حواس جواب دینے لگے۔ اب اس سوال کا کیا اور کیسے جواب دیتی؟

وہ مگوں میں چائے انڈیلنے لگی اور پھر ٹرے میں چاروں مگ رکھ کر پلٹی تو تھکی آنکھوں کے ساتھ پہلے ٹرے اس کے سامنے کی۔ وہ اس کی ادا پر مسکرا دیا۔

”تو کیا میں سمجھ لوں کہ اب سے لے کر آئندہ تمام زندگی تک تم مجھے یونہی چائے پیش کیا کروگی؟“

”بہت فضول ہو تم۔“ وہ بہ مشکل کہتی خفگی سے اسے ایک نظر دیکھ کر کچن سے باہر نکلنے لگی تو ایڈی نے ہنستے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اپنا مگ اٹھا لیا۔

اندر داخل ہوتے ہی ثوبان نے اشارے سے کامیابی کا ماجرا پوچھا تو وہ الٹے ہاتھ سے کان کی لو چھونے لگا۔

ثوبان نے متاسفانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے چائے کا مگ اٹھا لیا۔ زارا کو چائے کا مگ تھما کر وہ خود اپنی چائے لیے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

یہ مہمان نوازی ہے یا کچھ اور ہے
میرے لیے وہ چائے بنا کر لائی ہے

ایڈی کی رگ ظرافت یکلخت ہی پھڑکی تھی۔ وہ چائے کا گھونٹ صبیرہ کے حلق ہی میں اٹک گیا۔

شعر کی ذومعنویت صرف اسی نے تو محسوس نہیں کی ہوگی باقی لوگ بھی اتنی ہی عقل سے مالا مال تھے۔

”واہ.....واہ.....ویری گڈ کچھ اور ہو جائے میرے یار۔“ ثوبان نے پھڑکتے ہوئے داد دی تھی۔

جان دینے کی اجازت بھی نہیں دیتے ہو
ورنہ مر جائیں ابھی مر کے منالیں تم کو

وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

صبیرہ بے عنوان سی شرمندگی کا شکار ہونے لگی۔ وہ یقیناً اس کے ہر تاثر کو نگاہ میں رکھے ہوئے تھا۔

”دیکھو ایڈی، اب تم جان بوجھ کر لڑائی والی بات کر رہے ہو۔“ زارا نے اسے تنبیہ کی تھی مگر وہ ان سنی کرتے ہوئے مزے سے بولا۔

”ویسے ابھی تمہارے کچن میں دوبارہ جا کر بہت اچھا لگا۔ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔“ صبیرہ کے ذہن میں جھماکا سا ہوا وہ یقیناً بہت پہلے والی اس لڑائی کا ذکر کر رہا تھا۔

زارا نے اسے بتایا تھا کہ وہ فلم ایڈی کے پاس تھی۔

”وہ لڑائی بھی تمہاری وجہ سے ہوئی تھی۔ تم مسلسل مجھے چڑا رہے تھے۔“ صبیرہ سے رہا نہیں گیا تھا۔

وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

”تھینک گاڈ میں تو سمجھا تھا کہ آج سے تم نے چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا ہے۔“

رات گئے تک وہ چاروں باتیں کرتے رہے پھر ثوبان ایڈی کو اپنے کمرے میں لے گیا جب کہ زارا اس کے ساتھ دوسرے بیڈروم میں آگئی تھی۔

”تم نے ایڈی سے کہا نہیں۔ پروپوزل بھجوانے کو؟“ سونے سے پہلے زارا نے اس سے پوچھا تو وہ آرام سے بولی۔

”منع بھی تو نہیں کیا ہے۔“

”بس تم شرما شرمی میں ہی سوہنا منڈا ہاتھ سے گنوا دینا۔ کل میں خود آنٹی سے بات کروں گی۔ اتنا خوب صورت میرا دیور بے چارا۔ کیوں خوامخواہ اسے خوار کر رہی ہو۔“

زارا نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔ وہ خاموشی سے مسکراتی رہی۔

اگلے روز ثوبان اور زارا اسے ڈراپ کرنے جا رہے تھے۔ ایڈی نے بھی ساتھ جانے کی پیشکش کی جسے صبیرہ نے مسترد کر دیا۔

”اوکے، اللہ حافظ اینڈ ٹیک کیئر، ہم جلدی آئیں گے۔“ وہ کھل کر مسکرا دیا تھا۔ صبیرہ بے ترتیب دھڑکنیں سنبھالتی رہ گئی۔

تابندہ نے زارا اور ثوبان کی بے حد آؤ بھگت کی تھی۔

”دیکھ لیں آنٹی، ثابت و سالم بیٹی پہنچا دی ہے ہم نے آپ تک۔“ ثوبان شریر انداز میں بولا تو وہ ہنس دیں۔

”بہت شکریہ بیٹا۔“

دوپہر کا پرتکلف سا کھانا اور زبردست سی چائے نے ان کا دل خوش کر دیا تھا۔

واپسی سے ذرا پہلے جب ثوبان، ثانیہ بھابی کے ساتھ گپیں لڑا رہا تھا تب زارا نے ہمت باندھ کر تابندہ کے کمرے کا رخ کیا۔ جو زارا اور ثوبان کے لیے سوٹ کیس میں سے سوٹ پیس نکال رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر مسکرا دیں۔

”تم پہلی بار مجھے ملنے آئی ہو یہ سوٹ میری طرف سے تمہارے اور ثوبان کے لیے ہے۔“ انہوں نے ایک مردانہ اور ایک خوب صورت سا زنانہ سوٹ اس کے آگے رکھا تھا۔

”ارے نہیں آنٹی اس کی کیا ضرورت تھی۔ اتنا تکلف؟“ وہ ان کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئی تھی۔

”تم صرف یہ بتاؤ کہ تمہیں دونوں سوٹ پسند آئے یا نہیں؟“ انہوں نے اپنائیت بھرا رعب استعمال کیا تو وہ سچائی بھرے لہجے میں بولی۔

”بہت خوب صورت ہیں آنٹی اور سب سے بڑھ کر وہ پیار جو ان سوٹوں کے ساتھ منسلک ہے۔“

وہ اس کی بات پر ہنس دی تھیں۔

”آنٹی! مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا تھی۔“ وہ ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں بولی تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

”ہاں کہو بیٹا، اس میں اجازت لینے والی کیا بات ہے۔“ انہوں نے کہتے ہوئے بستر پر اپنے سامنے اس کے بیٹھنے کی جگہ بنائی تھی۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گئی اور جوڑ توڑ سے بات شروع کی۔

”ایکچوئیلی آنٹی! میں صبیرہ کے لیے پروپوزل لائی ہوں۔ ہمارا بہت اچھا دوست ہے ایڈی۔“

وہ اس کی بات سے کچھ یاد کر کے اچانک ہی مسرت بھرے لہجے میں بولیں۔

”دو پروپوزلز اور بھی آ چکے ہیں صبیرہ کے۔ مگر بیٹا! میں کسی کو بھلا کیسے ہاں کر سکتی ہوں۔ صبیرہ تو انگیجڈ ہے۔ ابھی سے نہیں، بچپن ہی سے اپنے کزن سے منسلک ہے اور یہ تو طے شدہ بات ہے کہ رخصتی بھی اسی کے ساتھ ہوگی۔ بس اب تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر انشاء اللہ تم لوگوں کو خوش خبری دوں گی۔“

زارا کو لگا کمرے کی چھت اس کے سر پر آن گری ہو۔

یہ کون سا راز کھلا تھا۔ صبیرہ نے تو کبھی کسی رشتے کا ذکر نہیں کیا تھا اور یہاں بات رخصتی تک پہنچ چکی تھی۔

”مگر صبیرہ نے کبھی بتایا ہی نہیں۔“

”اسے بھی کہاں معلوم تھا، بس بیٹا حالات ہی کچھ ایسے تھے مگر اب انشاء اللہ سب بہتر ہو جائے گا۔“ وہ بہت خوش لگ رہی تھیں۔

زارا کا سر چکرانے لگا۔ ایڈی کا مسکراتا چہرہ ذہن میں گھومنے لگا تھا۔ کتنے مان کے ساتھ آتی دفعہ اس نے زارا سے کہا تھا۔

”اپنی امانت بھیج رہا ہوں تمہارے ساتھ اس یقین کے ساتھ کہ تم اپنی وکالت سے اسے ہمیشہ کے لیے میری خاطر پابند کر کے آؤ گی۔“ اور یہاں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

واپسی پر اس نے صبیرہ سے کوئی بات نہیں کی تھی مگر اس کا مرجھایا ہوا چہرہ اور پژمردہ سا انداز اسے کھٹک گیا تھا۔ ان کی گاڑی نکلتے ہی وہ تابندہ کے پاس آ بیٹھی۔

”زارا کو پتہ نہیں کیا ہوا ہے۔ اتنی چپ چاپ سی چلی گئی؟“ تابندہ نے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شاید وہ میری کسی بات کو مائنڈ کر گئی ہے۔“

”آپ نے اس سے ایسا کیا کہہ دیا؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”وہ اپنے کسی دوست کا تمہارے لیے پروپوزل لائی تھی۔“

”تو پھر؟“ صبیرہ کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا تھا۔ تابندہ نے اطمینان سے کہا۔

”تو پھر کیا؟ میں نے صاف انکار کر دیا۔“ وہ اس کی امیدوں کے پرخچے اڑا گئی تھیں۔ ”کیوں“ اس کے ہونٹوں میں پھڑپھڑا کر رہ گیا۔

”شاید میں نے تم سے یہ سب چھپا کر اچھا کیا یا شاید مجھے ساری حقیقت بہت پہلے ہی تمہیں بتا دینی چاہیے تھی۔“ انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں کہتے ہوئے رک کر گہری سانس خارج کی تھی۔

”شاید تم فی الوقت یہ سب سن کر مجھ سے متنفر ہو جاؤ۔ لیکن اگر میں تمہیں ساری حقیقت بتا دوں تو وہ یہ ہے کہ نہ صرف تمہارا باپ زندہ سلامت، اسی ملک میں ہے بلکہ تمہاری ننھیال اور ددھیال بھی۔ اور زارا کا لایا ہوا پروپوزل ریجیکٹ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ تمہارا نکاح بچپن ہی میں تمہارے تایا زاد سے ہو چکا ہے۔“

صبیرہ کو لگا جیسے کسی نے اس کے وجود کو بم کے ساتھ اڑا ڈالا ہو۔ وہ بے حد صدمے اور بے یقینی میں گھری پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔ جو اب آہستہ آہستہ تمام رازوں سے پردہ اٹھا رہی تھیں اور صبیرہ کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

پوری حویلی میں خوشیوں کی لہرسی دوڑ اٹھی تھی۔

اعزازعلی خوشی سے بے حال، بے جی کے اپاہج وجود کے پاس جا بیٹھے جو کتنے ہی سالوں سے نچلے دھڑ اور دائیں بازو کے فالج کی وجہ سے بستر سے لگ چکی تھیں۔ فالج کے شدید جھٹکے نے ان کی زبان کو بھی متاثر کیا تھا جس کی وجہ سے ان کی کوئی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

''بے جی! تابندہ بھابی کا فون آیا ہے۔ وہ اور صبا دونوں بالکل خیریت سے ہیں۔'' بے جی کا ہاتھ تھام کر سہلاتے ہوئے انہوں نے پر جوش انداز میں خوش خبری سنائی تو ان کے وجود کو جھٹکا سا لگا۔ ان کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی تھی۔

''اللہ......اللہ......'' ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اعزازعلی کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''ہاں بے جی، یہ سب اللہ کی مہربانی ہے۔ اب میں خود بھابی کے پاس جاؤں گا۔ صدیقہ بھابی جائیں گی۔ انہیں ساری اصلیت بتائیں گے کہ اس روز وہ وقار علی کو بالکل غلط سمجھ بیٹھی تھی۔ حویلی میں پھر سے خوشیاں اتریں گی بے جی۔'' وہ انہیں تسلی دے رہے تھے۔

''و......وقا......وقا......ر......'' بے جی کی آنکھوں کے کونوں سے آنسو نکل کو کنپٹیوں کے سفید بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

''میں نے وقار کو فون کر دیا ہے بے جی، کل شام کی فلائٹ سے وہ مسقط سے آ رہا ہے۔ اب آپ کے اوپر کسی کا حساب نہیں رہا بے جی۔ کسی کا بھی۔'' وہ بھاری ہوتے لہجے میں بولا تو بے جی سرگوشی میں بلانے لگیں۔

''مم......میں......ما......معا......فی......''

''نہیں بے جی۔'' انہوں نے بے ساختہ ان کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔ ''ہر کوئی یہاں اپنی قسمت کا لکھا پاتا ہے۔ اگر آپ سے غلطی ہوئی ہے تو ہم سب سے بھی کیا غلطیاں نہیں ہوئیں۔ خدا نے ہماری زندگیوں میں جو نشیب و فراز لکھ رکھے تھے ان سے بہر طور گزرنا تو تھا ہی۔ بس اب آپ یہ دعا کریں کہ سب بخیریت حویلی میں جمع ہو جائیں اور پھر سے یہاں خوشیاں ہی خوشیاں اور بہاریں ہی بہاریں ہوں۔''

بے جی نے طمانت سے آنکھیں موند لیں۔

اعزازعلی اٹھ کر صدیقہ بھابی کے پاس چلے آئے جو نوشابہ کے ساتھ گزری یادیں شیئر کر رہی تھیں۔

''مبارک ہو بھابی جان بھئی اب تو آپ کا رینک بڑھ رہا ہے۔ ساس کے بارعب عہدے پر فائز ہو رہی ہیں۔'' انہوں نے لطیف سا مزاح کیا تو وہ آزردگی سے بولیں۔

''خدا نہ کرے جو میں دکھاوے کا بھی رعب دکھاؤں اعزاز۔ نہ تو مجھے ایسی ساس ملیں اور نہ ہی میں اپنی بہو پر ایسا تجربہ کرنے کی سوچ رکھتی ہوں۔''

اعزاز بھی سنجیدہ ہو گئے۔

''واقعی، بے جی ہر لحاظ سے ایک بہترین ماں اور اچھی ساس رہی ہیں مگر سب سے بڑی اور اہم بات ہوتی ہے۔ خود پر یقین رکھنا۔ دوسروں کی بات سن کر بھی پہلے اپنے دل و دماغ سے رجوع کرنا۔ آیا کہ یہ بات صحیح ہے یا غلط۔ پھر اس کی تحقیق کرنا اور پھر کوئی دفعہ فریق ثانی پر لاگو کرنا مگر بے جی نے بھی اپنی سادگی میں اس ملک کی ننانوے فیصد عورتوں کی طرح دوسروں کی آنکھوں سے دیکھا اور دوسرے کے کانوں سے سنا۔ فوزیہ نے انہیں کسی مہرے کی طرح استعمال کیا تھا ورنہ کوئی ماں اپنی اولاد کا گھر کیسے برباد کر سکتی ہے؟ اسی لیے تو ہر قدم پھونک کر اٹھانے کا حکم دیا گیا ہے۔ جلد بازی کو شیطانی عادت قرار دیا گیا ہے۔ خدا ہم سب پر رحم کرے۔ ہم لوگوں نے خود ہی اپنی زندگیوں کو اس قدر مشکل بنا لیا ہے۔ ایک دوسرے کا سامنا کرتے ہوئے ڈرتے رہتے ہیں کہ اگر کہیں سے اسے پتہ چل گیا تو کیا ہوگا۔ مگر یہ بد عادت پھر بھی ترک نہیں کرتے۔'' وہ متاسفانہ لہجے میں کہہ رہے تھے۔

''اور سب سے زیادہ غیبت کرنے کی عادت ہم عورتوں میں ہوتی ہے۔ سوری اعزاز۔ ابھی میں بھابی سے آپ کی شکایتیں لگا رہی تھی۔'' نوشابہ نے ماحول کی سنجیدگی کو ختم کرنے کی خاطر سادگی بھری شرارت سے کہا تو وہ ہنس دیے۔

''اب یہ بتائیں کہ بھابی اور صبا کو لینے کون کون جا رہا ہے؟'' انہوں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا تو صدیقہ بھابی نے بے ساختہ اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ پھر دھیمے لہجے میں بولیں۔

''بس چپکے ہی سے پروگرام بنالیں۔ ورنہ یہ بچہ پارٹی ہم سے پہلے تیاری پکڑے بیٹھی ہے وزیر آباد کی۔''

''چلنے دیں ان کو بھی۔ ظاہر ہے وہ بھی جذباتی ہو رہے ہیں۔'' اعزازعلی نے ہمیشہ کی طرح بچوں کی حمایت کی تھی۔ جن میں خود ان کے بڑے بیٹے نوروز اور نوازعلی کی دو خوب صورت اور چلبلی سی بیٹیاں میرب اور مہراب شامل تھیں۔

''ابھی نہیں اعزاز۔'' صدیقہ بھابی نے منع کرتے ہوئے کہا۔

''پہلے ہمیں جا کر تابندہ سے بہت سی غلط فہمیاں دور کرنی ہیں۔ وقار کی بے گناہی ثابت کرنی ہے۔ پتہ نہیں کیسا ماحول بنے۔ بچوں کے ذہن پراگندہ ہوں گے۔ ان کا اس سارے معاملے سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔

''اور مون؟'' انہوں نے عدیم کے متعلق استفسار کیا تو وہ ان سے نظریں چرا گئیں۔

''اس سے تو تم خود ہی بات کرنا۔ پتہ نہیں سیدھی راہ پر چلتے چلتے اس لڑکے کو کیا ہو گیا ہے۔'' صدیقہ بھابی ان کے کانوں میں پہلے بھی یہ بات ڈال چکی تھیں سو اب بھی وہ متفکر سے ہو گئے۔

''ایک یہی رشتہ تو سبیل بنا ہے بچھڑوں کے ملن کا۔ اسے گنوانا کسی بھی طور دانشمندی نہیں ہوگی بھابی!''

''اسی لیے تو کہتی ہوں کہ تم براہ راست عدیم سے بات کرو۔ میرے لیے تو اس کے دلائل کا جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے۔'' وہ بے چارگی سے کہہ رہی تھیں۔

''فی الحال تو آپ بھایا سے کہیے کہ کل صبح وزیر آباد جانے کے لیے تیار رہیں۔ ساتھ میں آپ اور نوشابہ ہو جائیں گے۔ بچوں کے جاگنے سے پہلے ہی ہم لوگ نکل جائیں گے۔'' انہوں نے ہر فکر کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے مسکرا کر کہا تو وہ بھی خوش ہو گئیں۔

''پتہ نہیں صبا کیسی ہوگی؟'' ''بچے تو ماں پر جاتے ہیں یا باپ پر اور صبا کے تو ماں باپ دونوں ہی خوب صورت ہیں۔'' نوشابہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو اندر داخل ہوتے نوروز نے اس کا جملہ اچک لیا۔

''آپ کی غلط فہمی ہے والدہ حضور اور بھی بہت سی سواریاں ہیں انسان رکشہ یا ٹیکسی پر بھی جا سکتا ہے۔'' اعزازعلی اور صدیقہ بھابی اس کی جملہ بازی پر ہنس دیے۔ مگر نوشابہ نے مسکراہٹ سمیٹ کر اسے خفیف سا گھور کر دیکھا۔

''میں نے تو آج تک کسی انسان کی شکل ٹیکسی یا رکشہ سے ملتی جلتی نہیں دیکھی ہے۔''

''اوہ۔'' وہ جیسے بات کی تہہ میں پہنچ گیا تھا۔ ''تو یہاں صبا بھابی کا ذکر چل رہا ہے۔''

''ایک تو یہ پکا جاسوس ہے۔'' نوشابہ کے لہجے میں اس کے لیے پیار رچا ہوا تھا۔

''ممی ڈیئر، آپ کیا ہمیں ابھی تک بچہ ہی سمجھ رہی ہیں؟ جناب ہم سب نے اپنے بیگز تیار کر رکھے ہیں۔ جیسے ہی اذن سفر ملا ہم بھی آپ کے ساتھ ہی وزیر آباد کوچ کر جائیں گے۔ آخر ہم بھی تو دیکھیں کہ صبا بھابی اپنے ڈیشنگ مون برادر کے جوڑ کی ہیں بھی یا گزارہ ہی ہیں۔'' وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔

''منہ دھو رکھو اپنے چہیتے مون برادر کا۔ وہ تو چاند کا ٹکڑا ہوگی تم دیکھ لینا۔'' صدیقہ بھابی کے ذہن میں تابندہ کا دلنواز و دلکش سراپا زندہ تھا۔

''چاند کا ٹکڑا یعنی اپنے مون بھائی کا بقیہ حصہ۔ یعنی کہ ان کی نصف بہتر۔''

''بیٹا جی! آپ کی ہاؤس جاب کیسی جا رہی ہے؟'' اعزازعلی نے بڑے تحمل کے ساتھ اس کی زبان کی ریل کو پٹڑی پر ڈالنے کی سعی کی تھی۔ وہ مسکراہٹ دباتا ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''بہت اچھی پاپا مریض تو میری شکل دیکھ کر ہی صحت یاب ہونا شروع ہو گئے ہیں۔''

''کیونکہ انہیں اچھی طرح پتہ ہے کہ دوسری صورت میں ڈاکٹر نوآموز ان کا علاج شروع کر دیں گے۔'' مہراب چائے اور دیگر لوازمات سے بھری ٹرالی گھسیٹتی اندر داخل ہوئی۔ نوروز نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

''ایک تو یہ جیلس طبقہ کسی روز جل کر سیاہ ہو جائے گا۔'' وہ مصنوعی خفگی سے کہہ رہا تھا۔ جب کہ باقی سب نوروز کے نام کی گت بنتے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

''واقعی یار ابھی تم ڈاکٹر نوآموز ہی تو ہو۔'' اعزازعلی کو مہراب کا فقرہ بہت بھایا تھا۔

''پاپا آپ بھی۔'' وہ ترچھی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

''بیٹا جی! اچھے فقرے کی داد نہ دینا بھی تو زیادتی ہے نا۔'' انہوں نے اپنی صفائی پیش کی تھی۔

مہراب سب کو چائے سرو کر کے ہونٹوں پر چڑانے والی مسکراہٹ لیے باہر نکل گئی تو وہ بھی اس کے پیچھے لپکا تھا۔ کچن سے باہر کوریڈور ہی میں اسے جا لیا۔ ایکدم سے اس کے آگے آ گیا تو مہراب کو اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر بریک لگانا پڑی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' مہراب نے خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ جواباً دانت کچکچا کر بولا۔

''یہی سوال ابھی میں وہاں کمرے میں تم سے پوچھنے والا تھا۔ شرم نہیں آتی ہونے والے شوہر کا مذاق اڑاتے ہوئے؟'' اس کی رنگت لال پڑ گئی مگر وہ دبی ذرا بھی نہیں تھی۔

''منہ دھو رکھو۔ ابھی تین ماہ ہوئے ہیں منگنی کو یہ ہونے والا شوہر کہاں سے آ گیا؟ شوفر کہو تو بات بھی بنے کیونکہ مجھے کالج ڈراپ کرنا تمہاری ڈیوٹی ہے۔'' لاپروائی سے کہا

تو وہ سنہرے بالوں کی بکھری لٹوں کے حصار میں شرارت سے دمکتا چہرہ دیکھے گیا۔ بھوری آنکھوں کے چمکتے کانچ سیدھے دل پر شعاعیں پھینک رہے تھے۔ وہ کیوں نہ پگھلتا؟

''او کے، تم کچھ بھی کہہ سکتی ہو۔ بنادو، مٹادو، بگاڑ دو یا سنوار دو۔ حق رکھتی ہو مجھ پر۔'' لب و لہجے کی ہلکی سی تبدیلی ہی مہراب کو الرٹ کرنے کو کافی تھی۔ وہ کچن میں جانے کی بجائے وہیں سے پلٹ کر بے جی کے کمرے کی طرف بھاگ اٹھی۔

''اسی لیے تو کہتی ہوں کہ تم نوروز نہیں نو آموز ہو۔'' دہلیز تک جا کر وہ پلٹی تو نوروز چہرہ موڑے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

''محبت میں بھی۔'' شرارت سے کہتی وہ غڑاپ سے کمرے میں گھس گئی تھی۔ دھیرے دھیرے نوروز کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''کبھی فرصت میں مل جاؤ مہراب نواز علی تو......'' اپنی سوچ کی لگاموں کو کستا سر جھٹک کر وہ واپس پلٹ گیا مگر دل و دماغ فرحت بخش احساسات سے لبریز تھے۔

☆☆☆

چلو اس خواب کو ترک کر دیں
اور آنکھوں کو یہ سمجھا دیں
کہ ہر تصور میں ہلکا گلابی رنگ
بہت سے نقش، نقاش ازل ایسے بناتا ہے
کہ جن کا حاشیہ گہرا سیاہ
اور نقش ہلکا سرمئی رہتا ہے
اور جن پر کسی بھی زاویے سے چاند اترے
یہ کبھی روشن نہیں ہوتے

وہ مسلسل اذیت کے حصار میں تھی۔ دل کی دنیا بسنے سے پہلے ہی اجڑ گئی تھی۔ بچ نکلنے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ صبیرہ علی کا صبا علی ہونا کس قدر پر اذیت اور تکلیف دہ تھا یہ کوئی اس سے پوچھتا۔ خوشیاں ملیں بھی تو غموں کے لبادے میں لپٹی ہوئی۔ وہ سدا ہی سے بہت سی محبتوں کے لیے ترستی رہی تھی۔ ماں کی دل شکنی کے خیال سے ہونٹوں سے نہ کہا ہو مگر دل میں وہ ہمیشہ بہت سے رشتوں کے لیے ہمکتی رہی تھی۔

مگر اب

یہ کیا ہو رہا ہے؟

یہ دل کیوں ڈوبتا جا رہا ہے۔ دھڑکنیں کیوں تھمتی جا رہی ہیں؟ جب اتنی بہت سی محبتیں مل رہی ہیں تو...... تو پھر کیوں؟

اک شخص کے کھو جانے کا غم نہیں جاتا
یہ بوجھ میرے دل سے اتر کیوں نہیں جاتا

تابندہ کی سرخوشی، ان کی طمانیت کچھ بھی تو نظر انداز کر دینے والا نہیں تھا۔ اتنے عرصے کے بعد ان کی آنکھوں کی دھرتی سوکھی تھی کہ نئی خوشیوں میں مگن صبیرہ کی آنکھوں میں چمکتی نمی کی تحریر وہ دیکھ ہی نہیں پائی تھیں۔ برسوں پرانی تلخ حقیقتوں پر سے پردے ہٹے تو اسے احساس ہوا کہ اس کی ماں نے آبلہ پائی کا سفر کس طرح تن تنہا طے کیا تھا۔ کس قدر ہمت اور حوصلے سے اپنی مرضی کی اپنی غلطی کی سزا کاٹی تھی۔ وہ اپنے اندر حوصلہ ہی نہیں جمع کر پائی تھی کہ وہ انہیں بتا پاتی کہ ماں میرے دل میں اب کسی اور کی جگہ نہیں رہی۔ اس دل کا مکین تو پورے طمطراق کے ساتھ براجمان ہے۔ ماں مجھے اور کسی کی چاہ نہیں کہ ایک ہی چاہت نے مجھے مکمل کر دیا ہے۔

کڑی دھوپ میں اف تک کیے بغیر سدا اس پر چھتر چھاؤں بن کر رہنے والی آبلہ پا ماں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی خوب صورت سی چمک اس کی آواز کو حلق ہی میں توڑ گئی تھی۔ وہ ان کی آغوش میں اپنی سسکیاں دباتی رہ گئی۔ مگر دل پر تو کسی کا بھی زور نہیں چلا ہے۔

رات کی خاموشی چھاتے ہی دل کے تمام درد، تمام سود و زیاں اسے رلانے لگے۔ آج تابندہ کس قدر مطمئن اور پرسکون نیند سو رہی تھیں۔ ورنہ اس سے پہلے تو وہ ہر کروٹ پر ضرور جاگ اٹھتی تھیں مگر آج وہ چپکے چپکے روتے ہوئے انہیں دیکھتی رہی وہ ایک بار بھی بے چین ہو کر نہیں جاگی تھیں۔ آج ہی تو انہوں نے حویلی والوں کو فون کیا تھا اور ملنے والی پذیرائی نے انہیں کتنا ہی رلایا تھا۔ مگر اب وہ خوش تھیں، بے حد خوش۔ ان کی آبلہ پائی رائیگاں نہیں گئی تھی۔

اور میں، اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ ایں ایک مرد کی محبت کے لیے رو رہی ہوں۔ ایسی مخلوق کے لیے جسے میں نے کبھی درخور اعتنا نہیں جانا۔ آنسو کو پوروں سے جھٹکتی وہ استہزائیہ انداز میں ہنسنے کی کوشش کرتی پھر سے رو دی تھی۔

اگلا دن بے حد روشن اور اجلا تھا۔

صدیقہ بھابی، بھایا، اعزاز علی اور نوشابہ ان کا گھر بھر سا گیا تھا۔ تابندہ صدیقہ بھابی سے لپٹیں تو پھر سے موسم بھیگا بھیگا سا ہونے لگا۔

''اور کوئی مجھے نہ بھی بتائے تو میں پہچان لوں گا کہ یہ میری پیاری سی بیٹی صبا ہے۔'' اعزاز علی نے اجنبی بن کر بے اعتنائی سے سب کو دیکھتی صبیرہ کی طرف بڑھتے ہوئے محبت سے کہا اور اس کی صبیح پیشانی چوم لی۔ وہ بہت مضبوط بن کر کھڑی تھی۔ اپنے دکھ کے حصار میں گھری تھی مگر یہ لمس کا جادو ہی تھا جس نے اسے ان کی مشفق پناہ میں سمٹ کر آنسو بہانے پر مجبور کر دیا۔ بھایا نے بھی اس پر اپنی شفقت لٹائی تھی۔

''کتنا ظلم کیا ہے تم نے تابندہ۔ مجھے تو حسرت ہی رہی کہ میں اس کے ننھے وجود کو بانہوں میں کھلاتی۔ اس کی ننھی ننھی قلقاریاں سنتی، اس کی شرارتوں پر ہنستی۔'' اس پر محبتوں کی بارش کرتے ہوئے صدیقہ بھابی نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا تو تابندہ پھر سے رو دیں۔

''میں کیا کرتی بھابی جس گھر میں، میں ایک مان اور بھروسے کے ساتھ گئی تھی وہاں سے ذلت کے ساتھ نکلنا اس دل کو گوارا ہی کہاں تھا۔ اس نے ایک بار بھی تو مجھے صفائی کا موقع نہیں دیا۔ ہر بار کی طرح دوسروں کی سن کر خود ہی فیصلے کی کرسی پر جا بیٹھا۔ میں وہاں رہ کر کس بات کا انتظار کرتی؟ اور کس قیامت کا انتظار کرتی؟''

سمیرا نے ان سب کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ ثانیہ بھابی نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کچن سنبھال رکھا تھا۔ وہ سب سمیرا کے مشکور ہو رہے تھے۔

''کوئی سگا رشتہ دار بھی اتنا ساتھ نہیں دے سکتا جتنا آپ نے اپنی دوست کا دیا ہے۔'' اعزاز علی ان کے خلوص کے معترف ہو چلے تھے اور سمیرا عاجزی سے کہہ رہی تھیں۔

اس میں شکریے والی تو کوئی بات ہی نہیں اعزاز بھائی۔ دوستی صحیح معنوں میں تبھی کہلاتی ہے جب اس کے تمام تقاضوں کو نبھایا جائے اور میں نے تو صرف دوستی نبھائی ہے۔''

''کتنی صحیح بات کی ہے آپ نے۔ ہر رشتہ اسی وقت معتبر ہوتا ہے جب اس کے تمام تقاضے نبھائے جائیں۔''

نوشابہ نے ان کی بات کو سراہا تھا۔

''زندگی کو جذباتی انداز میں گزارنے والے ہمیشہ ہی نقصان اٹھاتے ہیں بھابی! میں آپ کی غلطیاں نہیں گنوا رہا۔ صرف آپ کو ان کا احساس دلا رہا ہوں۔ زندگی کے اتنے خوب صورت سال آپ نے غلط فہمیوں کی عینک پہن کر گزار دیے۔'' اعزاز علی رنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

''اگر اس رات وقار کا فون سنتے ہی آپ وہاں سے چلی نہیں آتیں تو آپ کو احساس ہوتا کہ دوسروں کی سننے والا ہر بار ہی غلط فیصلہ نہیں کرتا۔ وقار علی اگلے دن آیا تھا۔ آپ کو اپنے ساتھ لاہور لے جانے کے لیے۔ وہ روز روز کے ان جھگڑوں سے تنگ آ چکا تھا۔ اپنی محبت کو بچانے کے لیے اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ آپ کو اور صبا کو اپنے پاس ہی رکھے گا مگر جب وہ گھر پہنچا تو اس کی دنیا ہی لٹ چکی تھی۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکے تھے۔

ہفت آسمان بھی تابندہ کے سر پر آ گرتے تو انہیں اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی اس وقت شدید احساس زیاں سے پہنچی تھی۔

''اس نے آپ دونوں کو پاگلوں کی طرح ہر جگہ ڈھونڈا۔ آپ کی والدہ کے گھر، دوسرے رشتے داروں کے ہاں، اخبارات میں اشتہار بھی دیے، گزرے بائیس برسوں سے وہ دل میں خلش اور اضطراب لیے جانے کن صحراؤں کی خاک چھان رہا ہے۔'' وہ بتا رہے تھے اور تابندہ کے احساسِ زیاں کا اندازہ کون کر سکتا تھا۔ زندگی کے بائیس برس اتنا لمبا عرصہ انہوں نے وہ سزا کاٹی تھی جو ان کی خود ساختہ تھی۔ جو انہیں کسی نے بھی نہیں سنائی تھی۔

وہ ٹوٹ کر روئیں، بکھر بکھر گئیں۔

''اپنی خوشی کو دوسروں کی خوشی پر مقدم سمجھنا اور دوسروں کے جذبات سے بالکل بے پرواہ ہو کر صرف اپنے جذبات کی آسودگی کا سوچنا اس سے بڑی خود غرضی کیا ہو سکتی ہے۔ یونہی تو والدین کی نافرمانی کو گناہ کبیرہ میں شمار نہیں کیا گیا اعزاز بھائی۔ اس گھر سے نکلی تو میں نے سوچا کہ خدا نے میرے آدھے گناہ معاف کر دیے ہیں جو میں طلاق کے دھبے سے اپنی پیشانی کو بچا لے جا رہی ہوں اور کل جب آپ لوگوں سے فون پر بات ہوئی تو ان بائیس برسوں میں کی جانے والی خدا کی عبادت کے قبول ہونے کا بھی یقین ہو گیا۔ دل کو قرار آ گیا کہ اب خدا نے مجھے بالکل معاف کر دیا ہے۔ مگر آج......'' وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بول رہی تھیں۔ ''مگر آج میری تمام ریاضت بے کار گئی ہے، اعزاز بھائی کتنی بڑی سزا کاٹی ہے میں نے اپنی نافرمانی کی۔ کتنی بڑی اور میں خوش تھی، میں خوش تھی کہ میں سزا سے بھاگ آئی ہوں۔ انسان کس قدر نادان ہے۔ خدا کو (نعوذ باللہ) دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ بھلا اس کے انصاف سے کوئی بچ پایا ہے کبھی۔ یونہی تو اس دنیا کو مکافات عمل نہیں کہا گیا۔ کتنی بڑی سزا کاٹی ہے میں نے۔'' وہ سر پر ہاتھ رکھے رو رہی تھی۔ صبیرہ بھی روتے ہوئے ان سے لپٹ گئی۔

وہاں موجود ہر شخص کی آنکھیں نم تھیں۔

کس قدر کڑی سزا سہی تھی تابندہ نے۔

اے خدا ہمیں کبیرہ و صغیرہ گناہوں سے بچا۔

''میں واپس جانے سے پہلے اپنی ماں کے پاس ضرور جاؤں گی۔ میں ان سے معافی ضرور مانگوں گی۔ جانے ان لوگوں کا دل میری وجہ سے کتنا دکھا ہوگا۔ کتنی راتیں انہوں نے بھی رو کر گزاری ہوں گی۔''

وہ خود بھی رو رہی تھی اور دوسروں کو بھی رلا رہی تھیں۔

رات گئے آنے والا مسافر ان کی زندگی کی نوید بن کر آیا تھا۔

دروازہ تابندہ ہی نے کھولا تھا۔

اور سامنے زندگی بانہیں پھیلائے کھڑی تھی۔ وہ کسی کا بھی خیال کیے بغیر وقار علی کی بانہوں میں سمٹ گئی تو ان کے ساتھ ساتھ گردِ سفر اور جدائی کے کرب میں گھرے وقار علی بھی رو دیئے۔

☆☆☆

وہ خواب تھا بکھر گیا، خیال تھا ملا نہیں
مگر یہ دل کو کیا ہوا، یہ کیوں بجھا پتا نہیں
ہر ایک دن اداس دن، تمام شب اداسیاں
کسی سے کیا بچھڑ گئے کہ جیسے کچھ بچا نہیں

زارا نے اسے پورے دو دنوں تک ہمت مجتمع کرنے کے بعد حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ بے یقینی سے ساکت کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا۔

''تم پاگل تو نہیں ہو گئیں زارا۔ وہ انگیجڈ ہوتی تو مجھے نہ سہی تم لوگوں کو تو پتہ ہوتا۔'' وہ بمشکل اس ابتدائی جھٹکے سے سنبھلا تھا۔

''خود صبیرہ کو بھی نہیں پتہ تھا۔ وہ بچپن ہی سے انگیجڈ ہے۔'' زارا نے آہستگی سے کہا۔ وہ بے چین سا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''بچپن کی منگنی کی کیا حیثیت ہوسکتی ہے۔ وہ اس شخص کو پسند تو نہیں کرتی نا۔ اپنا پروپوزل ضرور بھجواؤں گا۔ صبیرہ میرے لیے ضرور اسٹینڈ لے گی۔'' وہ اپنی بے چینی پر اطمینان کا پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اسے تمہاری خاطر اسٹینڈ لینا بھی چاہیے۔ پیار محبت کوئی کھیل تو نہیں کہ آدھا ادھورا چھوڑ دیا تو کوئی بات نہیں۔'' ثوبان نے سنجیدگی سے اس کا ساتھ دیا تھا۔

''تم سیدھے اپنی امی کو بھجواؤ۔ آنٹی یقیناً اس پروپوزل کو ریجیکٹ نہیں کریں گی۔ وہ بھی اس صورت میں جب صبیرہ بھی تمہارا ساتھ دے گی۔ تم اچھی طرح جانتے ہوا سے وہ ایسی لڑکی نہیں ہے جو بیچ راستے میں ساتھ چھوڑ جائے۔''

زارا نے صبیرہ کی حمایت کی تھی۔

''تو ابھی اس سے بات کرلو۔ تمام حقیقت کا پتہ چل جائے گا۔'' ایڈی نے موبائل پر صبیرہ کا دیا ہوا نمبر پریس کر کے زارا کو تھما دیا۔ اگلے چند منٹوں میں ثانیہ بھابی اس سے بات کر رہی تھیں۔

''صبیرہ تو یہاں نہیں ہے۔''

''کہاں چلی گئی وہ؟'' زارا متحیر تھی۔

''کیا بتاؤں زارا، کتنی خوشی کا لمحہ تھا۔ بائیس برسوں کی جدائی کے بعد وہ اپنوں سے ملی ہے۔ یوں سمجھو ان دونوں ماں بیٹی کے دکھوں کے دن کٹ گئے۔''

زارا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ صبیرہ اور تابندہ کی آزمائش کٹ جانے پر خوشی کا اظہار کرے یا ایڈی کے دل کی دنیا تاریک ہوجانے کا ماتم کرے۔

''صبیرہ جاتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ تمہیں فون کرے گی۔ اتنی جلدی میں یہ سب کچھ ہوا کہ وہ کسی سے بھی رابطہ نہیں کر پائی۔ تم بھی تیار رہنا۔ وہاں جاتے ہی اس کی شادی کی تیاریاں شروع ہو جائیں گی۔ بتایا تو ہوگا تمہیں آنٹی نے۔'' وہ اپنے مخصوص نان اسٹاپ انداز میں بتا رہی تھیں۔

چند ایک مزید باتوں کے بعد اس نے تھکے ہارے انداز میں موبائل آف کر کے ایڈی کی طرف بڑھا دیا۔

''صبیرہ کے ابو ان دونوں کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔'' زارا نے رنجیدگی سے بتایا تو وہ جو منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا شاکڈ رہ گیا۔

''جرمنی؟''

''ظاہر ہے وہیں لے گئے ہوں گے۔ یہاں تو ان کا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔'' زارا نے تاسف سے اسے دیکھا تھا۔

وہ خالی پن کے شدید احساس میں گھرا کھڑا رہ گیا۔

ثوبان کو اس کی دلی و ذہنی کیفیت کا شدت سے احساس تھا اسے گلے لگا کر تھپکا۔

''وہ ضرور تمہاری خاطر اسٹینڈ لے گی۔ وہ یوں چپ چاپ ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہے۔ اپنے ابو کے ساتھ جانا اس کی مجبوری سہی مگر اپنی زندگی کے اتنے بڑے فیصلے کے وقت تو وہ دغا بازی نہیں کرسکتی نا۔'' وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

''ہوسکتا ہے، ہوسکتا تھا مگر ہوا نہیں نا۔'' ایڈی اسے پیچھے ہٹاتا ہوا تلخی سے بولا۔ ''کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ ایسے کیسے چلی گئی وہ۔ ایسے کیسے جاسکتی ہے وہ چپ چاپ، بنا کچھ کہے سنے؟''

''جلد بازی مت کرو ایڈی، وہ ہم سے رابطہ ضرور کرے گی۔'' زارا کو پورا یقین تھا۔ وہ سر ہاتھوں پر تھامے بیٹھ گیا۔

☆☆☆

انہوں نے روتے ہوئے وقار علی کے بندھے ہاتھوں کو کھول دیا تھا۔

''مجھے اس قدر گناہ گار مت کریں وقار۔'' طویل بائیس برسوں کے بعد دو چاہنے والے پھر سے ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ تبھی تو یوں کہ ایک سال دو ماہ کی قربتوں پر سالوں کی گرد جم چکی تھی۔ گزرے وقت نے دونوں کے خدوخال میں اپنی واضح نشانیاں چھوڑی تھیں۔

رائیگاں مسافت، سود در سود زندگی۔

یہ نقصان اتنی آسانی سے نظر انداز کیے جانے والا تو نہیں تھا۔

وہ جتنا بھی روتے کم تھا۔

اور ان کا دکھ اس قدر اثر پذیر تھا کہ دیکھنے والی ہر آنکھ نم تھی۔

یہ قدرت کے فیصلے تھے۔ قدرت کا انصاف تھا۔ خدا اپنے انصاف کا حق کبھی بھی انسانوں کو تفویض نہیں کرتا اور جب خدا فیصلہ کرتا ہے تو دونوں پلڑے ایک برابر رکھتا ہے۔

''کوئی بھی توبہ کوئی بھی معافی میرے دل کو سکون نہیں دیتی وقار۔ میں سب سے پہلے اپنی ماں سے معافی مانگنا چاہتی ہوں اس کے بعد آپ کے ساتھ اس پاک پروردگار کے گھر میں حاضری دوں گی تبھی میرے دل کو سکون ملے گا مگر ایک اطمینان ضرور ہے کہ میں نے اپنی کرنی کا بھگتان بھگت لیا ہے۔ اب میں خدا کے حضور معافی کی اپیل کرسکتی ہوں۔''

وہ حد درجہ شکستگی سے کہتی وقار علی کو ایک بار پھر سے ندامت کی عمیق گہرائیوں میں گرانے لگی۔

''میں گزرے وقت کو کیسے واپس لاؤں تابندہ۔ میں بہت کمزور بہت وعدہ خلاف نکلا۔ اپنے وعدوں کو نبھا نہیں پایا۔ تمہیں کچھ بھی تو نہیں دے پایا سوائے دربدری کے۔''

''اب اتنی ناشکری مت کرو وقار۔ اس بزرگ و برتر کا شکر ادا کرو جس نے تم دونوں کی آبلہ پائی ختم کردی۔ اس آزمائش سے نکال دیا۔ ورنہ لوگ تو ساری عمر معافی کو ترستے رہتے ہیں مگر ان کی آزمائش ختم نہیں ہوتی۔'' اعزاز علی بھی دل گرفتہ ہو رہے تھے۔ جان سے عزیز بھائی کی دکھوں بھری زندگی نے انہیں بھی ہر پل بے چین رکھا تھا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ زمانے بھر کی خوشیاں اور سکھ لا کر اس کی زندگی کو گلزار بنا دیتے۔ مگر ہوا وہی تھا جو خدا نے چاہا اور تبھی جب اس کی مرضی بہت شدت سے دیکھنی پڑتی ہے اور تب فقط پناہ کا ایک ہی در کھلا دکھائی دیتا ہے۔

توبہ کا در جو کبھی بھی بند نہیں ہوتا۔

جو نجات کا در ہے۔

اور شاید تابندہ اور وقار علی نے اپنے حصے کی تمام سزا تمام آبلہ پائی جھیل لی تھی تبھی تو تمام مرحلے اتنے آسان ہوتے چلے جا رہے تھے۔

ملن کے، اعتماد و اعتبار کے۔

امی نے روتے ہوئے تابندہ کو گلے سے لگا لیا تو وہ بھی یوں ٹوٹ کر روئیں جیسے آج ہی ضیاء احمد کا جنازہ اٹھا ہو۔

''کس دیس میں جا بسی تھیں تابندہ، پگلی والدین کی ناراضگی میں وہ شدت نہیں ہوتی جو بچوں کی ضد میں ہوتی ہے۔ میں تو کب سے دروازے کھلے چھوڑے اس انتظار میں تھی کہ تم کب آجاؤ۔''

امی وقت سے پہلے ہی ضعیف ہو چکی تھیں۔ تابندہ کبھی ان کا منہ چومتیں اور کبھی ہاتھ۔ خالہ جان نے اسی وقت رخشی اور احسن کو فون کر دیا جو جاب کے سلسلے میں کراچی میں رہائش پذیر تھا۔

''یہ لو، عدیم بھی آ گیا ہے۔'' نوشابہ چچی نے اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر کہا تو بے جی کے کمرے سے نکلتی صبیرہ واپس پلٹ گئی۔

عدیم، یہ نام تمہارا بھی ہو سکتا تھا ایڈی۔ کتنی ہنسی آئی تھی اسے تقدیر کی ستم ظریفی پر۔ وہ بھی عدیم تھا اور یہ بھی عدیم۔ مگر دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک کے نصیب میں صبیرہ وقار علی تھی اور دوسرا صبیرہ وقار علی کا نصیب نہیں بن سکا تھا۔ اس کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ ایڈی کے نام کے آنسو تو وہ اسی گھر کے کسی کونے میں بہا آئی تھی۔ پھر یہ کیا ہے؟

اس نے اپنے رخساروں پر بہتے سیال کو انگلیوں کی پوروں سے حیران ہو کر چھوا تھا۔

''اوں ...... آں ......''

بے جی نے اس سے دوبارہ لوٹ آنے کی بابت پوچھا تو وہ دکھ چھپا کر مسکرا دی۔

''یونہی دادی ماں، آپ کے پاس بیٹھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس لیے واپس آ گئی۔

انہوں نے بایاں ہاتھ بڑھا کر اس کا سر سینے سے لگایا تو بے پایاں سکون کا احساس دل میں اترنے لگا۔ ان کی بوڑھی آنکھیں نم ہو گئیں۔ تابندہ کو سامنے پا کر ان کے دل کی کیا حالت ہوئی تھی یہ وہی جانتی تھیں یا ان کا خدا جانتا تھا۔ اگر وہ جذباتی تھی تو انہوں نے بھی معتبرانہ کردار ادا نہیں کیا تھا۔ شاید اندر سے وہ وقار علی کی فوزیہ سے شادی نہ کرنے والی زیادتی پر غصہ بھی تھیں۔ تبھی تو اتنی آسانی سے فوزیہ کی کہی فضول باتوں کو لے کر اتنی زندگیوں کو بربادی کے دہانے پر پہنچا ڈالا۔

خدا جانے غلطی کس کی تھی، مگر حقیقت تو یہ تھی کہ خدا نے سزا سب کو کڑی ہی دی تھی۔ مگر کچھ لوگ اعزاز علی جیسے بھی ہوتے ہیں۔ جن کے دل بالکل صاف اور مخلص ہوتے ہیں اور جن پر خدا اپنی نظر کرم ضرور کرتا ہے۔ تبھی تو جب سب کے لیے برا وقت چل رہا تھا تب خدا نے نوشابہ کو اس کی زندگی کا حصہ بنا کر اس کی قربانی کا صلہ دے ڈالا۔

''بے جی نے تابندہ سے معافی مانگنی چاہی تو وہ ان سے لپٹ گئیں۔

''اب تو صرف خدائے بزرگ و برتر سے معافی مانگنی ہے بے جی۔ سزا تو ہم سب بھگت چکے ہیں اپنے اپنے حصے کی۔''

اور صبیرہ کو تو انہوں نے بہت پیار کیا تھا۔

بے جی کا ہاتھ بہت نرمی اور پیار کے ساتھ اس کے بالوں میں سرایت کر رہا تھا اور اس کا دل شانت ہوتا جا رہا تھا۔

'میں بہت بزدل ہوں ایڈی۔ مجھے معاف کر دینا۔ ایک اٹوٹ بندھن میں بندھے ہونے کے باوجود میں نادانستگی میں تمہاری ہمسفری کا ارادہ کر بیٹھی مگر مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ جدائی کی آبلہ پائی اور جیون کی کڑی دھوپ برداشت کر سکوں۔ اتنے سارے چہروں کی خوشی نوچ کر اپنے ہونٹوں پر ہنسی سجانے کا کھیل مجھے نہیں آتا۔ آئی ایم سوری ایڈی۔ میں تابندہ وقار علی کی بیٹی ضرور ہوں مگر نہ تو تابندہ ہوں اور نہ ہی وقار علی۔ انہیں رشتے نبھانے کا گر آتا ہو یا نہ آتا ہو مگر میں خود پر یہ الزام نہیں لوں گی۔ جو کبھی میرے ماں باپ پر آیا تھا۔ مجھے محبت کی نہیں، محبتوں کی طلب ہے۔ چاہت کی نہیں چاہتوں کی طلب ہے۔ میں اپنے پیچھے دعا کرنے والے ہونٹوں کو کھونا نہیں چاہتی۔ مجھے ہر روزن کھلا رکھنا ہے۔ واپسی کا، دعاؤں کا، سب کی محبتوں اور اعتماد کا۔' اس نے تمام آنسو اندر اتار لیے تھے۔

جب جینا ہی تھا تو احساسِ زیاں کے بغیر کیوں نہیں؟

خوبرو اور سنجیدہ سے عدیم کو دیکھ کر تابندہ نہال ہو اٹھیں۔

''یہ کون ہیں بھلا؟'' نوشابہ چچی کے پہلے والے انداز پر وہ قدرے گڑبڑایا پھر ادب سے تابندہ کے آگے جھک گیا۔

''اتنی تصویریں دیکھی ہیں ان کی کیسے بھول سکتا ہوں۔ تابی چچی ہیں یہ۔'' اس کا انداز تخاطب اب بھی وہی تھا۔ نم آنکھوں کے ساتھ تابندہ نے اس کی فراخ پیشانی چوم کر اسے گلے لگا لیا تھا۔

''میرا بچہ، خدا نظر بد سے بچائے۔ ابھی کل کی بات لگتی ہے میری گود میں کھیلتا رہتا تھا تب بھی پیارا تھا اور اب بھی ماشاءاللہ۔'' ان کی آواز بھرا گئی۔

عدیم ان کی چاہت سے بڑا متاثر ہوا تھا۔

وہ اسے دیکھ کر سیراب ہو رہی تھیں۔

خدا کا دیا خاکی خطاکار کے لیے سنبھالنا بہت مشکل ہوتا ہے وہ بھی اپنا دامن تنگ پڑتا محسوس کر رہی تھیں۔

''اس تعریف کو دل پر مت لیجیے گا بڑے بھائی۔ ابھی کچھ دیر پہلے چچی جان میری بھی تقریباً انہی لفظوں میں تعریف کر چکی ہیں۔'' نوروز نے اسے تنبیہ کی تو وہ مسکراتے ہوئے تابندہ کے پاس بیٹھ گیا۔

''آپ سنائیں کیسی ہیں؟'' وہ مسکرا دیں۔

''بہت تھکی ہوئی اور پژمردہ تھی۔ آبلہ پائی کی تکلیف، دربدری کا دکھ شدید تھا مگر اب یوں لگ رہا ہے جیسے مالک ارض و سما نے تمام خوشیاں سمیٹ کر مجھ سوختہ ساماں کے دامن میں ڈال دی ہیں۔''

اسی وقت وقار علی اندر آئے تو وہ حیرت اور خوشی کا شکار اٹھ کر ان سے لپٹ گیا۔

''واٹ اے سرپرائز، آپ کب آئے؟''

'دیکھ لو ہم تو خوشیوں کی خبر پا کر اتنی دور سے بھی آ گئے اور تم ابھی پہنچ رہے ہو۔''

اس وقت عدیم نے ان کے لب و لہجہ کی خوشی اور طمانیت کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا۔

''بھئی بہت دکھ دیکھ لیے اس حویلی اور اس کے مکینوں نے اب تو صرف خوشیوں ہی کی بات ہونی چاہیے۔ اب بتاؤ ہم اپنی بہو کو کب لینے آئیں؟'' بھایا نواز علی خوشدلی سے پوچھ رہے تھے۔ وقار بھی ہنس دیے۔

''جب آپ چاہیں بھایا۔ مجھے تو کوئی فکر نہیں میری بیٹی کون سا مجھ سے دور چلی جانے والی ہے۔''

''اور ویسے بھی خوشیوں کا استقبال کھلے دل سے کرنا چاہیے اتنا سوچ میں نہیں پڑنا چاہیے۔''

صدیقہ بھابی کے تو دل کی مراد پوری ہو رہی تھی۔ عدیم نے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا تو وہ نظریں چرا کر تابندہ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''میں ذرا کپڑے چینج کر لوں۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں کہتا اٹھ گیا تھا۔ مگر یہ ممکن ہی کہاں تھا کہ باقی سب اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑ دیتے۔

''عدی بھائی! نیگ دینے کی تیاری کر لیں آپ۔ اپنا بینک بیلنس چیک کرنا پڑے گا اتنی ساری بہنوں کے لیے۔'' مہراب اس کے شانے سے لٹکی تو اسے بحالت مجبوری رکنا پڑا۔

''بالکل، آپ کی سالیاں تو ہیں نہیں۔ اب صبا بھابی کی طرف سے بھی تو ہمیں ہی ساری رسمیں کرنا پڑیں گی۔'' لائبہ نے جیسے بہت بڑی ذمے داری اپنے شانوں پر اٹھائی تھی۔

''جن میں سب سے پہلی رسم ہو گی جگا ٹیکس وصول کرنا۔'' نوروز نے لقمہ دیا تھا۔

''کیا ہے، جان چھوڑنے کا کیا لو گے تم سب؟'' عدیم سخت بےزار ہو رہا تھا۔ وہ سب ہکا بکا رہ گئے۔ اکتاہٹ آمیز انداز میں کہتے ہوئے اپنے کمرے میں جا کر اس نے زور سے دروازہ بند کر دیا تھا۔

''یہ تو لگ رہا ہے کہ شادی پر رضامند ہی نہیں ہیں۔''

''اتنی خوب صورت ہیں بھابی، انہیں پتہ نہیں ہو گا اس لیے خفا ہو رہے ہیں۔'' مہراب کی آنکھیں چمکی تھیں وہ ان کی طرف پلٹتے ہوئے پرجوش انداز میں بولی۔

''کیوں نہ عدی بھائی کو صبا بھابی سے ملوایا جائے؟''

''نہ بابا نہ، ابھی بھائی کے تیور نہیں دیکھے تم نے۔'' میرب کچھ کترا گئی تھی۔

''آئیڈیا تو بہت اچھا ہے۔'' لائبہ نے مہراب کا ساتھ دیا تو نوروز نے انہیں ٹوک دیا۔

''تم دونوں اپنی عقل کے لولے لنگڑے گھوڑے دوڑانے کی کوشش نہ ہی کرو تو بہتر ہو گا۔ دن میں سو باتیں ہو جاتی ہیں موڈ خراب کرنے والی۔ ضروری نہیں ہے کہ بڑے بھائی کو اچانک اس شادی پر اعتراض ہونے لگے۔ جب کہ اتنے سالوں سے وہ اس انکشاف کے ساتھ ہی بڑے ہوتے چلے آ رہے ہیں۔'' وہ طنزیہ لب و لہجے میں کہتے ہوئے رکا پھر خاص طور پر مہراب کو کلسانے والے انداز میں بولا۔

''اور جان چھوڑنے کا بھی تم لوگوں کو دے رہے تھے۔ بھابی کو تو جان و دل تڑے میں رکھ کر پیش کریں گے۔''

''ہنہ میرا بس نہیں چلتا ورنہ میں تمہیں ......'' مہراب نے دانت پیسے تو وہ دوبدو بولا۔

''تو ٹرک چلا لو۔ اس میں کیا پرابلم ہے؟''

اس کی معصومیت پر میرب اور لائبہ کو جی بھر کر ہنسی آئی تھی۔

''اگر پاپا نے بڑے چاچو کو زبان نہیں دی ہوتی تو پھر میں تمہارے مزاج ٹھکانے لگاتی۔'' مہراب کو یونہی اندھا دھند غصہ آتا تھا اور نوروز کو اس غصے کو بڑھاوا دینے کے ایک سو ایک طریقے تھے۔ اب بھی مسکراہٹ دباتے ہوئے بظاہر لاپروائی سے بولا۔

''تو واپس لے لو زبان، بڑے چاچو کون سا گن کے کھا گئے ہیں۔'' وہ مٹھیاں بھینچتی ہوئی لائبہ پر چیخ اٹھی تھی۔

''سنبھال رکھو اپنے اس حسین و جمیل بھائی کو۔''

''اونہوں، ایسے منہ بھر کے جوان جہان منگیتر کی تعریف نہیں کرتے۔ کتنی بار کہا ہے کہ ساتھ میں ماشاءاللہ بھی ضرور کہا کرو۔ میرا خون بہت ہلکا ہے۔ نظر جلدی لگتی ہے۔''

وہ فوراً ٹوک گیا تھا۔

''اوہ گاڈ۔'' لائبہ اور میرب سے ہنسی روکنا محال تھا۔

''تم دیکھ لینا نوروز، ایک دن میں خود یہ منگنی توڑوں گی۔'' اس نے جلبلا کر ہمیشہ کی طرح آخری حربہ آزمایا مگر وہ مکھی اُڑانے والے انداز میں ہاتھ ہلا کر بولا۔

''ارے جاؤ، اس منگنی کے ہونے میں نوے فیصد تمہاری مرضی کا دخل ہے۔ میں نے ہاں کرنے سے پہلے تمہاری مرضی معلوم کرنے کو کہا تھا۔ تم نے رضامندی دی تب میں نے ہاں کہی تھی۔ یعنی میرا قصور صرف دس فیصد ہے۔''

وہ سر تھام کر صوفے پر گر گئی تھی اور وہ لائبہ اور میرب کو انگوٹھا دکھاتا ہوا چلا گیا۔

''کیا جوڑی بنائی ہے خدا نے۔ دونوں کی قسمت میں ایک دوسرے پر ہی وار کرنا لکھا ہے۔'' میرب نے شرارت سے کہا تو وہ اسے گھورتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی مگر ان دونوں کی ہنسی کمرے تک اس کا پیچھا کرتی رہی تھی۔

''دیکھ لوں گی تمہیں نوروز علی۔'' اس نے سائیڈ ٹیبل پر خوب صورت سے فریم میں جڑی اپنی اور نوروز کی منگنی کی تصویر پڑی دیکھ کر بڑی دلربا سی مسکراہٹ کے ساتھ زیرِ لب کہا تھا۔

✡......✡

''دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا؟'' اعزاز علی غصے بھرے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ بھی ان کے ادب میں اٹھ گیا۔

صدیقہ بھابی نے انہیں عدیم سے شادی کی تاریخ رکھنے کے متعلق بات کرنے کا کہا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ اتنے مہذبانہ انداز میں انکار بھی کر سکتا ہے۔

''آئم سوری بڑے چاچو مگر میں نے کبھی بھی اس رشتے کے متعلق اس طرح سے نہیں سوچا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ اعزاز علی سلگتی نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں خفیف سی سرخی اتر آئی تھی۔

''کچھ بھی کہنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا عدیم کہ صبا تمہاری منگیتر نہیں بلکہ منکوحہ ہے۔''

ان کی بات پر وہ لب بھینچ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر چھانے والی سرخی اس کے ضبط کی گواہ تھی۔

''سو وات چاچو؟'' پھر وہ بڑے متحمل انداز میں گویا ہوا تھا۔

''یہ فیصلہ یوں جذباتیت کی رو میں بہہ کر کیا جانے والا نہیں ہے۔ یہ تو وقت کا طے کردہ رشتہ ہے جب نہ مجھے ہوش تھا اور نہ ہی صبا کو۔ اب ہم دونوں ہی فہم و شعور کی سیڑھیاں طے کر چکے ہیں۔ اصل حقیقت تو اب پتہ چلے گی اس فیصلے کی۔ جن دو فریقین نے ایک ساتھ پوری زندگی گزارنا ہے، ان سے تو کوئی بھی نہیں پوچھ رہا۔ یہاں تو بائیس دنوں میں دنیا بدل جاتی ہے اور آپ لوگ بائیس برسوں کو کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں ہیں۔''

''وہ تمہارے لئے بہترین لڑکی ہے عدیم! تم اس سے ملو، بات چیت کر کے دیکھو۔ وہ ہر لحاظ سے تمہارے قابل ہے۔'' اعزاز علی اس کے انداز و الفاظ پر اندر تک ہل گئے تھے۔ یہ آزمائش تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

''میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا بڑے چاچو!'' وہ بڑے کھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اعزاز علی نے غصے سے پوچھا۔

''لیکن کیوں؟ تم اسے دیکھے بغیر، ملے بغیر کیسے ریجیکٹ کر سکتے ہو؟ کیا وجہ ہے تمہارے اس فیصلے کے پیچھے، کیوں؟''

ان کے سوال کے جواب میں وہ بلا تردد و بلا ہچکچاہٹ بہت پُرسکون لہجے میں بولا۔

''وجہ بہت مضبوط اور اٹل ہے بڑے چاچو! میں کسی سے محبت کرتا ہوں اور شادی بھی اسی سے کرنا چاہتا ہوں، کسی بھی قیمت پر۔''

اعزاز علی شاکڈ تھے۔

اس وقت وہ صبیرہ کے لئے بھی ویسی ہی بے بسی سی کیفیت محسوس کر رہے تھے جیسی انہوں نے آج سے بائیس برس قبل تابندہ کے چلے جانے کے بعد وقار علی کی اجڑتی دنیا دیکھ کر محسوس کی تھی۔

مگر وہ بالکل بے بس تھے۔ مجبور اور لاچار۔

✡......✡

وہ بے حد بے یقینی سے اپنے سامنے کھڑے عدیم کو دیکھ رہے تھے۔ وہ جسے اس قدر خوب صورت، مکمل اور فرمانبردار دیکھ کر اعزاز علی ہمیشہ ہی صبا کے مستقبل کو محفوظ تصور کیا کرتے تھے۔ جسے وقار علی کو سونپ کر وہ ان کی دربدری کا قرض چکانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

جسے تابندہ کے حوالے کر کے وہ ان کی نا آسودگیوں کا قرض چکانے کا ارادہ کرنا چاہتے تھے۔

مگر یہ کیسی ہوا چلی تھی جو کتابِ زندگی کے اوراق پلٹ کر عہدِ گزشتہ دہرانے والی تھی۔

کبھی یہی انداز و الفاظ وقار علی نے بھی اپنائے تھے۔ مگر حویلی کی تاریخ گواہ تھی کہ پے در پے تابندہ، وقار علی، بے جی اور اس کے بعد اعزاز علی کے جذباتی فیصلوں نے کسی کی بھی زندگی میں خوشیوں کی بہار نہیں لائی تھی۔

''خوشیوں اور خواہشوں کی قیمت اتنی سستی نہیں ہوتی عدیم جتنا کہ تم سوچے ہوئے ہو۔ بعض اوقات ان کی خاطر پوری زندگی داؤ پر لگ جاتی ہے بلکہ زندگیاں۔'' انہوں نے خود کو سنبھال کر بڑے سبھاؤ سے کہا تو وہ قدرے ناراضگی سے بولا۔

''وہ تو آپ لوگوں کے اس فیصلے کے بعد بھی داؤ پر لگیں گی۔''

''غیر جانب داری سے سوچو عدیم تو بہت آسانی سے سمجھ لو گے کہ اپنی پسند کی لڑکی کی صورت میں تم ایک اور فوزیہ کو ریجیکٹ کر کے ایک اور تابندہ کو اس حویلی میں لاؤ گے اور ایک بار پھر سے اس حویلی کے مکینوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے تنگ دلی اور نفرت پیدا ہو گی۔ تاریخ پھر سے اپنے آپ کو دہرائے گی۔ ایک بار تو اس حویلی میں دیوار کھڑی ہو گئی ہے عدیم مگر میں کسی بھی طور اسے مزید حصوں میں تقسیم نہیں ہونے دوں گا۔'' وہ اسے وارننگ دینے والے انداز میں کہہ رہے تھے۔

اس سے پہلے ایک طرف دیوار اٹھا کر بی جان اور چچا جان کا حصہ الگ کر دیا گیا تھا۔ جس کا غم آج تک ہر مکین کے دل میں تازہ تھا۔ یہی غم اباجی کو شاید وقت سے پہلے ہی لے گیا تھا۔

پھر اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بے حد سرد مہری سے بولے۔

''اور اگر پھر بھی تم صبا کے ساتھ جڑا یہ بندھن نبھانا نہیں چاہتے تو مجبوراً مجھے ہی اپنے بھائی کا سر جھکنے سے بچانا پڑے گا اگر تم نے انتہائی فیصلہ کیا تو میں جواباً نوروز کو وقار علی کی فرزندی میں دے دوں گا۔ بہر طور مجھے اس حویلی کی اقدار بہت عزیز ہیں۔ صبا کسی صورت بھی سہی مگر اس گھر کی بہو ہی رہے گی۔''

اس بار ساکت ہونے کی باری عدیم نواز علی کی تھی۔

''آپ مجھے بلیک میل کر رہے ہیں؟'' بہت دیر کے بعد وہ بولنے کے قابل ہوا تھا۔ سرخ چہرہ لیے وہ ضبط و برداشت کی انتہائی منزل پر تھا۔

''تم جو بھی سمجھ لو مگر میں بائیس سالوں کی آبلہ پائی کے صلے میں ایک مرتبہ پھر ان ماں بیٹی کو دربدری کی نذر نہیں کرنا چاہتا۔ یہ سراسر بے ایمانی ہو گی، کیونکہ یہ رشتہ میرے ایما پر ہی طے پایا تھا مگر پھر بڑی بھابی نے اپنا حق جتا کر صبا کو تمہارے لیے مانگ لیا تھا۔ اتنے برسوں تک وہ ہماری امانت کو سنبھالتی آئی ہیں، صرف ایک اس رشتے کی آس میں۔ ورنہ اس حویلی کے مکینوں نے تو انہیں کچھ بھی نہیں دیا۔ سوائے تنگ دلی اور دربدری کے۔'' وہ انتہائی دکھ سے کہہ رہے تھے مگر مقابل کی بھی دل کی دنیا داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ اتنی آسانی سے کیسے ہار مان لیتا۔

''اور میری بہن، اس کی خوشیوں اور دکھوں کا حساب کون رکھے گا؟'' وہ انتہائی تلخی سے بولا تو اب کی بار انہوں نے اطمینان سے کہا۔

''اس کی بات اور ہے۔ مہراب نے ہمیشہ سے محبتوں کو اپنے آس پاس پایا ہے۔ اسے سنبھالنے والے سبھی ہیں مگر اس وقت ہمیں ان کا سہارا بننا ہے جو سالوں کے سفر سے صرف اس آس پر واپس لوٹے ہیں کہ یہاں ان کا استقبال کھلے دل اور کھلی بانہوں کے ساتھ کیا جائے گا۔''

وہ بے بسی میں گھرا کھڑا رہ گیا تھا۔

✡......✡

تُو ایک موج ہوا ہے تو سنسنا کے ہی چل
نظر نہ آ لیکن مجھے سنائی تو دے
کسی کے ساتھ ہی آ سامنے تو آ میرے
مجھے نہ مل تو میرے شہر میں دکھائی تو دے

شام کے بڑھتے سایوں کے ساتھ ساتھ پارک میں لوگوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ تھک ہار کر ایک طرف ایستادہ سنگیں بینچ پر آ بیٹھا۔

وہ بے حد شکست خوردہ اور ذہنی تناؤ کا شکار تھا۔

پچھلے پندرہ دنوں سے وہ صبیرہ کی طرف سے کسی رابطے کے انتظار میں تھا مگر اس کی طرف سے بالکل خاموشی تھی۔

ساکت و جامد۔ بے جان زندگی۔

وہ بارہا شفق اور زارا سے رابطہ کر چکا تھا مگر وہ دونوں خود صبیرہ کی طرف سے بہت پریشان تھیں۔ ابھی تک اس نے ان دونوں سے بھی رابطہ نہیں کیا تھا۔

''کہاں چلی گئی ہو صبیرہ؟''

وہ یونہی غائب دماغی کی کیفیت میں پارک میں ہنستے بولتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

کبھی وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہوا کرتا تھا مگر اب جانے والی جیسے بہاروں کے موسم اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی۔

محبت درد کی صورت
گزشتہ موسموں کا استعارہ بن کے رہتی ہے
یہ شام ہجر میں روشن ستارہ بن کے رہتی ہے
منڈیروں پر چراغوں کی لوئیں جب تھرتھراتی ہیں
نگر میں ناامیدی کی ہوائیں سنسناتی ہیں
گزر جاتے ہیں سارے قافلے جب دل کی بستی سے
فضا میں تیرتی ہے دیر تک
یہ گرد کی صورت
محبت درد کی صورت

اس کے دماغ کی نسیں کھنچنے لگی تھیں۔

زندگی کی تتلی وقت کے ہاتھوں سے یوں پھسلی تھی کہ بس چند خوب صورت رنگ یادوں کی صورت اس کی ہتھیلی پر رہ گئے تھے۔ چھوٹا سا خوب صورت موبائل ہاتھوں میں تھامے وہ کتنی ہی دیر اس کی اسکرین گھورتا رہا تھا۔ کوئی نام ونشان کوئی اتہ پتہ، نقش پا تک تو نہیں تھا اس کا۔ جس کو سنگ میل بنا کر وہ منزل تک پہنچ سکتا۔

محبت کی عمر اتنی چھوٹی بھی ہو سکتی ہے۔

وہ خود ہر لمحہ بے یقینی میں گزار رہا تھا۔

قسمت میرے ساتھ یہ مذاق کیسے کر سکتی ہے۔ ابھی تو محض جذبوں نے ایک دوسرے کی پزیرائی ہی کرنا شروع کی تھی۔

ابھی تو ہزاروں ان کہی، ان سنی، دلوں ہی میں رہ گئی تھیں۔

میں کن ہواؤں سے تمہارا پتہ پوچھوں صبیرہ؟ کس در پر دستک دوں کہ مجھے تمہاری خبر مل سکے؟

میں کیسے تا عمر اس دل میں کسی اور کو جگہ دے پاؤں گا جس کے ہر کونے میں تمہاری یادوں کا بسیرا ہے؟

میں جو زندگی کے ہر میدان میں کامیاب۔

محبتوں کے معاملے میں دنیا کا امیر ترین شخص۔

تو پھر اس محبت کی کمی مجھے اپنے ادھورے پن کا احساس اس قدر شدت سے کیوں دلا رہی ہے؟

کیا تھی تمہاری محبت صبیرہ علی جسے پا کر مجھے یوں لگا تھا جیسے میں بالکل مکمل ہو گیا ہوں۔

نہ آپس میں بہت وعدے تھے نہ حکایتیں، نہ بہت سی ملاقاتیں تھیں نہ بہت باتیں۔

مگر وہ تمام ان کہی، ان سنی، ہم دونوں ہی جانتے تھے۔ تبھی تو اس قدر خاموشی سے ایک دوسرے کے اندر اترتے چلے گئے۔ اس سے بڑھ کر چاہنے کی اس سے بڑھ کر ایک دوسرے کو جاننے کی اور کیا حد ہو سکتی ہے؟

یہ نام، پتے، حال احوال جاننا نہ جاننا۔

کس قدر غیر اہم لگتا تھا یہ سب اور آج؟

کچھ بھی تو نہیں میرے پاس، بجز تمہاری یادوں کے، بجز تمہارے پیار کے تو کس سہارے میں تم تک پہنچوں؟

اس نے جلتی آنکھوں سے پارک میں چلتے پھرتے ہنستے بولتے لوگوں کو دیکھا تو ایک بار دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ وہ پوری طاقت کے ساتھ صبیرہ کا نام پکارے۔

میں تمہارا نام پکاروں اور تم گھبرائی شرمائی سی میرے سامنے آ جاؤ۔ اس سے زیادہ بھی اب کبھی میں اس زندگی سے مانگ پاؤں گا؟

وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اس کا ملنا ہی مقدر میں نہیں تھا ورنہ
ہم نے کیا کچھ نہیں کھویا اسے پانے کے لیے

اسے اپنی زندگی کے اس قدر غیر یقینی موڑ پر اپنی بے بسی پر ہنسی آنے لگی مگر پہلو سے اٹھنے والی ٹیس نے اس کے لبوں کو بھینچ دیا تھا۔

⁂

وہ سب مہراب کے کمرے میں محفل جمائے ہوئے تھے۔ چونکہ بڑوں میں سے کوئی بھی اس محفل میں موجود نہیں تھا۔ اس لیے ہر موضوع پر دل کھول کر بولا جا رہا تھا۔

صبیرہ کے لاکھ بار انکار کے باوجود اسے زبردستی ساتھ گھسیٹ لیا گیا تھا۔

''یقین کریں عدی بھائی نہیں ہیں یہاں۔'' میرب نے اسے یقین دلایا تم وہ اٹھی تھی۔ مہراب نے اسے گھور کر دیکھا۔

''اٹس ناٹ فیئر بھابی، بھائی نہیں ہیں اس اطلاع پر ہماری بات ماننے کا حق بنتا ہے؟''

صبیرہ گڑبڑا گئی تھی۔

''ایسی بات نہیں ہے، ایکچوئلی یہ سب اس قدر اچانک اور غیر متوقع سا ہے۔ اوپر سے تم لوگوں نے مجھے اس رشتے سے جاننا اور سمجھنا شروع کر دیا ہے، جسے قبول کرنے میں خود مجھے ٹائم لگ رہا ہے۔'' اس نے سنبھل کر بہت سنجیدگی سے کہا تو میرب نے گھور کر مہراب کو دیکھا اور معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

''آپ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں۔ ہم لوگوں کے لیے تو یہ سب بہت تھرلنگ اور محض انجوائے منٹ ہے۔ مگر آپ کو اور عدی بھائی کو تو یہ سب قبول کرنے میں ذرا ٹائم لگے گا۔ آپ ان بے وقوفوں کی باتوں پر غور مت کیا کریں۔''

''ویسے کتنی عجیب اور کیا کہتے ہیں کہ سنسنی آمیز سی بات ہے نا کہ ایک روز آپ سو کر اٹھیں اور آپ کو پتہ چلے کہ آپ اب شادی شدہ ہیں بلکہ پہلے ہی سے۔''

مہراب پر اس کو گھورنے اور تنبیہ کرنے کا اثر کم ہی ہوتا تھا۔ اب بھی وہ بہت مزہ لیتے ہوئے بولی تو صبیرہ بجھے دل سے مسکرا دی۔

''شادی شدہ نہیں، نکاح شدہ۔'' میرب نے دانت پیس کر تصحیح کی تو لاپروائی سے بولی۔

''صرف رخصتی ہی باقی ہے نا، یوں کرالیں گے ہم۔ لڑکے والے ہیں آخر۔'' اس نے چٹکی بجائی تھی۔ پھر قدرے مایوسی سے کہا۔

''بس یہ عدی بھائی کبھی ہاتھ آ جائیں۔''

عدی، ایڈی۔ کتنی مماثلت ہے ایڈی۔ مگر قسمت میں کتنا فرق ہے۔ ایک عدیم نام کی مماثلت ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ تم عدیم تو ہوئے مگر میرا نصیب نہیں بن سکے اور یہ عدیم نواز علی میرا کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی میرا سب کچھ تھا۔

تو کیا یہ نام ساری عمر مجھے تمہاری یاد نہیں دلاتا رہے گا؟'

اسے یاد آیا جب ایگزیمز سے پہلے آخری روز وہ گئی تب سارا دن ایڈی ہی کے ساتھ گزارا تھا۔

''کس قدر اچھا نام ہے تمہارا عدیم، پھر یہ بگاڑنے کی کیا تک ہے؟ یقین کرو بعض اوقات میرے ذہن سے تمہارا اصل نام محو ہو جاتا ہے۔ ایڈی کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔'' یونہی باتوں کے دوران صبیرہ نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ قہقہہ لگا بیٹھا۔ پھر حظ اٹھانے والے انداز میں بولا تھا۔

''یہ تو یار لوگوں کے پیار کا انداز ہے۔ جو انہوں نے عدیم سے ایڈی کر دیا۔ مگر میری دلی خواہش ہے کہ تمہیں ایڈی کے سوا کچھ نہ سوجھے۔'' اس کے شرارت بھرے انداز نے صبیرہ کو کس قدر گڑبڑا دیا تھا۔

''بھابی! سچ سچ بتائیں آپ کے دل میں ایک بار بھی خواہش نہیں جاگی بھائی کی تصویر دیکھنے کی۔ بلکہ ابھی وہ دو دن رہ کے بھی گئے ہیں لیکن آپ نے کمرے سے جھانک کر نہیں دیکھا؟'' نوروز کو شرارت سوجھی تھی۔ مگر نہ تو اس کے دل میں کوئی ہلچل مچی اور نہ ہی کسی سنسنی آمیز احساس نے گھیرا تھا۔

''میرے خیال میں قسمت کے لکھے پر شاکر ہو جانا سب سے بہترین عمل ہے۔'' وہ آہستگی سے بولی تو لڑکیوں نے تالیاں بجا کر داد دی تھی۔

''بالکل صحیح کہہ رہی ہیں۔ دیکھنا اس شکر اور صبر کا انعام کتنا شاندار ملتا ہے۔'' مہراب نے ذومعنی انداز میں کہا تو وہ نوروز اور مہروز کی موجودگی کے باعث جھینپ سی گئی۔

اس کا اشارہ اتنا غیر واضح تو نہیں تھا۔

''اینی وے، اب آپس میں اتنی لاتعلقی بھی ٹھیک نہیں ہوتی۔ ہم سب آپ دونوں کو پارٹی دے رہے ہیں تاکہ آپ لوگوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا جا سکے۔''

لائبہ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا تو وہ گھبرا گئی۔

''کم آن لائبہ، کیا بچوں جیسی حرکتیں ہیں۔''

''یہی تو بڑوں والی حرکتیں ہیں سوئیٹ بھابی اس دفعہ بھائی کو آتو لینے دیں پھر دیکھیے گا۔'' نوروز بہت موڈ میں تھا۔ میرب کو عدیم کا انداز یاد آیا تو وہ گہری سانس بھر کے رہ گئی۔

کتنے ہی دنوں سے وہ زارا کو فون کرنے کا سوچ رہی تھی مگر ہر بار اس کی دیوار جاں ٹوٹ کر رہ جاتی۔

''کیا بتاؤں، کیسے بتاؤں؟''

ایڈی سے براہ راست بات کرنے کے متعلق تو وہ سوچ بھی نہیں رہی تھی۔

وہ جانتی تھی پتھر کو پگھلنے میں ایک پل بھی نہیں لگے گا۔ ہاں، اس نے دل کو پتھر ہی تو کر لیا تھا۔

بے حد غیر جانبداری سے حقیقت کو سوچا تو قبول کرنے کا آغاز بھی ہو گیا۔

کیا کسی بندھن میں جکڑے ہونے کے بعد کسی نامحرم کو سوچنا کسی کی چاہت کرنا گناہ نہیں، بدنیتی نہیں، فریب اور بے حمیتی کی انتہا نہیں؟

لاشعوری طور پر وہ ماضی کی یادوں میں گھر جاتی تو الگ بات تھی مگر شعوری طور پر وہ ہمیشہ ایڈی کی یاد کو پیچھے، بہت پیچھے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں دھکیلنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

خود کو خوش اور مطمئن ظاہر کرنا بھی تو خوش ہونے کی پہلی سیڑھی ہے۔ سو اس نے بھی اس سیڑھی پر قدم رکھ کر اس تعلق کو پروان چڑھانے کی ٹھان لی تھی۔ جس کی بنیاد میں بہت سی محبتیں، جذبات اور دعائیں شامل تھیں۔ اس خاندان کو ہمیشہ ایک بنا کر رکھنے اور محبتوں کو بڑھانے کی۔

وہ خود کو اپنی ماں کے لیے 'تم جیسی' کا طعنہ نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اس کی فرمانبرداری ہی اس کی ماں کی اتنے سالوں کی ریاضت کا پھل ہو سکتی تھی۔

بہت سوچ کر اس نے نوروز سے کالنگ کارڈ منگوایا تھا جو کہ اس نے بڑے ردوکد کے بعد لا کر دیا تھا۔

''گھر میں فون کی سہولت ہے ہر ایک کے پاس موبائل ہے بلکہ آپ کی تو ذاتی ملکیت کے پاس بھی ایک عدد موبائل موجود ہے تو پھر یہ ٹیلی کارڈ کیوں؟''

''یونہی، پاس اچھا رہتا ہے کبھی مارکیٹ وغیرہ جا کر فون کرنے ضرورت پڑ جاتی ہے تو؟'' صبیرہ نے پہلے ہی سے جواب گھڑ رکھا تھا۔

''تو محترمہ موبائل کی سہولت کس لیے ہے؟'' وہ بھی چکنا گھڑا ہی تھا۔

''بھئی جب موبائل میری تحویل میں آئے گا تب دیکھی جائے گی۔ ابھی فی الحال تم یہ کام تو کرو۔ مجھے عادت ہے کارڈ پاس رکھنے کی۔'' صبیرہ کو بھی کہنا پڑا تھا۔

''اب آئی ہیں ناں لائن پہ۔'' وہ ہنستا ہوا چلا گیا تھا۔ صبیرہ روپے لیے اسے آوازیں ہی دیتی رہ گئی مگر شام تک وہ کمال مہربانی سے مہروز کے ہاتھ اسے ہزار روپے کریڈٹ کا ٹیلی کارڈ بھجوا چکا تھا۔

''بھائی نے کہا تھا کہ اگر پیسے دینے کی کوشش کریں تو کارڈ واپس لے آنا۔''

مہروز نے سادگی سے بتایا تو وہ مسکرا کر رہ گئی۔

اور اب وہ ٹیلی کارڈ ہاتھ میں لیے فون کے پاس بیٹھی تھی۔ جسے استعمال کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے کسی کو بھی اپنا کنٹیکٹ نمبر نہیں دینا چاہتی تھی۔ جس کا حصول اب سی ایل آئی کی بدولت ہر ایک کے لیے بہت آسان ہو چکا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان لوگوں کی جذباتیت یا کوئی بھی رابطہ اس کی آئندہ زندگی کی بنیاد کو کوڈگمگا دے۔

اپنے پورے حوصلے کے ساتھ بہت سے لفظوں کا ذخیرہ اکٹھا کرتے ہوئے اس نے ثوبان کے گھر کا نمبر ملایا تھا۔

خوش قسمتی سے فون زارا ہی نے اٹینڈ کیا تھا۔ اس کی آواز صبیرہ کو ساکت کر گئی۔

کتنی پیاری تھی یہ آواز، محبت کی آواز، دوستی کی آواز مگر اب کتنی دور، کتنی اجنبی ہو گئی تھی اس لیے۔

''ہیلو'' ڈھیر سارے آنسو جانے کہاں سے اُلڈے چلے آ رہے تھے۔ اس کا گلا رندھ گیا۔

''جی کس سے بات کرنی ہے آپ کو؟'' زارا کا یہی انداز تھا۔ مقام کا نام پوچھنے سے زیادہ اسے کام اہم لگا کرتا تھا۔

''بھئی صحیح ہے نا، کون، کیوں اور کیا چکر میں ہم کیوں پڑیں۔ جس سے بات کرنی ہو وہ جانتا پھرے۔''

وہ اکثر ہنسا کرتی تھی۔

''زارا! میں صبیرہ بول رہی ہوں۔'' بدقت اس سے کہا گیا تو دوسری جانب لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد زارا کا جیسے سکتہ ٹوٹ گیا تھا۔

''صبی! تم؟ اوہ گاڈ، مجھے یقین نہیں آ رہا کہاں ہو تم؟ اتنے دنوں سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ ہم سب اتنے پریشان تھے۔ کتنے دنوں سے تمہاری کال کا ویٹ کر رہے ہیں اور ایڈی تو پاگل ہو رہا تھا بالکل۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں اور یہیں ہوں زندہ سلامت۔'' وہ بے اختیار اس کی بات کاٹ گئی تھی۔

یہاں تو یادوں سے لے کر باتوں تک کا ہر سرا اسی شخص سے جا ملتا تھا جسے بھولنے اور اپنے دماغ و دل سے نکالنے کی سعی کرنے میں وہ جتی ہوئی تھی۔

''میں نے ثانیہ بھابی کو فون کیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ تمہارے ابو، تم لوگوں کو ساتھ لے گئے ہیں۔ بہت مبارک ہو صبی مگر یہ رشتے کا کیا چکر ہے۔ اس روز آنٹی نے بھی ایڈی کے پروپوزل کو صاف منع کر دیا تھا اور اب ثانیہ بھابی بھی کہہ رہی تھی کہ تمہاری شادی طے ہو چکی ہے۔''

''زارا بے حد پریشان تھی مگر اتنا ضرور ہو گیا کہ اس کے بات مکمل کرنے کے دوران صبیرہ کو خود کو سنبھالنے کا موقع مل گیا تھا۔

''شادی ہو نہیں رہی زارا! بلکہ ہو چکی ہے۔'' اب کی بار اس کی آواز بے حد صاف اور لہجہ نارمل تھا۔

زارا کو جھٹکا سا لگا۔

''واٹ؟''

''انسان صرف کوشش کر سکتا ہے زارا! اپنی بہترین کوشش اپنی زندگی میں بہتری لانے کی۔ ہر اچھی اور خوب صورت چیز پانے کی مگر حقیقت میں ہوتا وہی ہے جو خدا نے اس کے نصیب میں لکھ دیا ہے۔ میں گزری ہوئی کسی بھی بات کو دہرانا نہیں چاہتی زارا کیونکہ یہ اب میرے لیے صریحاً گناہ ہے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اپنا ہمسفر بنانے کی کوشش کی تھی مگر نہیں بن پائے مگر میں خوش ہوں اور مطمئن بھی کہ میں اپنے خاندان کی عزت کا نشان بن کر اپنے گھر میں لوٹی ہوں میں ایڈی سے بات نہیں کرنا چاہتی زارا وہ ایک بہت اچھا اور بہت مہربان اور بہترین دوست ہے۔ اسے کہنا، وہ چاہے تو مجھے برا سمجھ سکتا ہے مگر صرف اس بات کا یقین کر لے کہ میں نے اسے دھوکا نہیں دیا۔ یہ سب قدرت کا لکھا تھا اور اسے اسی طور پورا ہونا تھا اور یہ بھی کہہ دینا کہ زندگی میں کبھی کسی موڑ پر بھی اگر مجھ سے سامنا ہو تو مجھے آواز نہ دے۔ میں اپنی زندگی بہت ایمانداری سے جینا چاہتی ہوں۔''

''مگر صبی، یہ سب ہوا کیسے؟ اور تم نے ایڈی کے لیے اسٹینڈ کیوں نہیں لیا؟''

زارا کو اس قدر پُرپیچ حالات و واقعات نے درحقیقت بہت الجھا دیا تھا۔ جواباً صبیرہ نے اسے مختصراً تمام حالات بتا دیے تھے۔ وہ سن کر خاموش رہ گئی پھر قدرے توقف کے بعد جذباتی انداز میں بولی۔

''وہ تو بچپن کی بات تھی صبی اب تم لوگوں کو اپنی مرضی سے اپنی زندگی گزارنے کا پورا حق حاصل ہے۔ تم بات تو کرتی آنٹی سے۔''

''تم نہیں سمجھ سکتی زارا، میرے لیے اس رشتے کو جوڑے رکھنے کا مطلب ہے اس خاندان کو جوڑے رکھنا۔ اپنے والدین کو سب کی نظروں میں سرخرو کرنا۔''

''اس سارے معاملے میں تمہاری خوشی کہاں ہے صبیرہ؟''

''میں اپنے والدین کی بائیس برسوں کی ریاضت کو اکارت جانے سے بچا لوں، ان کی آبلہ پائی کے لیے مرہم بن جاؤں، اس سے بڑی خوشی اور اطمینان کیا ہو گا میرے لیے؟ اور زارا پلیز مجھے کمزور مت بناؤ۔ آج اگر میں نے تم سے رابطہ کیا ہے تو اس کا مطلب اپنی صفائی یا وضاحتیں دینا ہرگز نہیں ہے۔ میں صرف کسی کی آس، کسی کے انتظار کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ میں نہیں چاہتی کہ ایڈی لاحاصل انتظار میں اپنی زندگی برباد کر لے۔ اس کے لیے خوشیوں کے ہزاروں در کھلے ہیں۔ میں جب تک اس کے ساتھ چلی بہت ایمانداری سے چلی مگر اب جب کہ زندگی ایک نئے موڑ پر مڑی ہے تو میں اپنا یہ سفر بھی بہت ایمانداری کے ساتھ شروع کرنا چاہتی ہوں۔ ایڈی سے کہنا مجھے معاف کر دے۔ نادانستگی ہی میں، میں اسے دکھ دینے کا باعث بن گئی اور اس سے یہ بھی کہنا کہ وہ ایک بہت اچھا انسان ہے اور اچھے لوگ کبھی زیادہ دیر تک تنہا نہیں رہتے۔''

اس کے بوجھل لہجے میں آنسوؤں کی نمکینی اترنے لگی تو خود سے ہار کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور ہاتھوں میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی پھر بھی دل ڈوبتا رہا تو وہ تیزی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی کہ اس وقت خود کو سنبھالنا وقت کی سب سے بڑی اور اہم ضرورت تھا۔

اور اپنی ہی رو میں چلتی وہ کوریڈور کے آخری سرے پر منجمد کھڑے عدیم نواز علی کو دیکھ نہیں پائی تھی۔ جو نجانے اسے دیکھ کر ساکت ہو اٹھا یا سُن۔

✡……✡

''بچپن میں طے کیے گئے رشتے محض ایک جذباتی قدم ہوتے ہیں اور زبردستی کا ایک بندھن، بس اور کچھ نہیں۔'' اعزاز علی ناراضگی سے کہہ رہے تھے۔

صدیقہ بھابی تڑپ کر رہ گئیں۔

''اور ہم، ہماری خوشیاں۔ ہمارا اپنے بچوں پر کوئی حق نہیں بنتا؟''

''وہ زمانے تو گئے بھابی۔'' وہ اب بھی سخت مایوسی کا شکار تھے۔ پھر متاسفانہ لہجے میں بولے۔ ''میری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت کے حالات دیکھ لینے کے باوجود وقار علی اور فوزیہ کی نسبت ٹوٹ جانے کے باوجود ہم نے صبا اور عدیم کا رشتہ جوڑنے کی حماقت کیسے کر ڈالی۔''

''میں خود بات کروں گا عدیم سے وہ کوئی بچہ تو نہیں ہے اور نہ ہی اس رشتے سے انجان ہے۔ ہم نے اس سے کبھی بھی اس حقیقت کو چھپا کر نہیں رکھا پھر اب اعتراض یا انکار کی کیا تک ہے۔'' بھایا کو غصہ آنے لگا تھا۔

‘‘آپ بھی کر دیکھیں ورنہ مجھے بھی وہ آپ سے کم عزت نہیں دیتا۔ بہت آرام سے اس نے اپنا مسئلہ ڈسکس کر لیا تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنی کمٹمنٹ نبھانا چاہتا ہے۔ جواباً میں نے اس کے سامنے صبا اور نوروز کا نام رکھا ہے۔’’

اعزاز علی نے جیسے بم بلاسٹ کیا تھا۔

دونوں میاں بیوی لحظہ بھر کو سکتے میں آ گئے۔

‘‘گھبرائیں مت۔ یہ فقط لفظی کارروائی تھی۔ صبا اور مہراب دونوں کے ساتھ میرا ایک ہی جیسا رشتہ ہے۔ میں بھلا ایک کی خوشی پر دوسری بیٹی کے سکھ کو ترجیح کیسے دے سکتا ہوں۔ میرا مطلب تھا کہ اس طرح عدیم اس لڑکی کو چھوڑ کر اپنی فیملی کے کرائسس کے متعلق سوچے گا۔’’

‘‘تم نے تو میری جان ہی نکال لی تھی اعزاز۔’’

صدیقہ بھابی کے ہاتھ پاؤں ابھی تک سنسنا رہے تھے۔ بھایا نے سنجیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور متاسفانہ لہجے میں بولے۔

‘‘اس ذرا سی بات سے تم تابندہ کے ردعمل کا اندازہ لگا سکتی ہو۔ یہاں منگنی کا ختم ہو جانا کسی قیامت سے کم نہیں ہوتا اور تمہارا بیٹا برسوں کے نکاح کو کسی گنتی میں نہیں لا رہا۔’’

‘‘ابھی آپ لوگ اس سے کچھ مت کہیں بھایا۔ اچھا ہے ذرا سوچے گا تو اسے اندازہ ہوگا کہ اگر اس کا فیصلہ صبا کے لیے تکلیف کا باعث ہو سکتا ہے تو میرا فیصلہ بھی مہراب کی خوشی کا باعث نہیں ہوگا۔’’ اعزاز علی نے انہیں سمجھایا تھا۔

‘‘یہاں کیا میٹنگ چل رہی ہے چپکے چپکے؟’’ تابندہ کے ایک دم سے صدیقہ بھابی کے کمرے میں آ جانے پر وہ تینوں خاموش ہو گئے تھے۔ تابندہ کے پیچھے ہی نوشابہ بھی تھیں۔

‘‘بھئی اور کیا ہو سکتا ہے، وہی عدیم اور صبا کی شادی کی بحث چل رہی ہے۔’’ اعزاز علی نے قدرے شگفتگی سے بات بنائی تو ان کے چہرے پر مسرتوں کے چراغ جل اٹھے۔

‘‘اتنی لمبی چوڑی بحث کی کیا ضرورت ہے اعزاز بھائی۔ گھر کی ہی تو بات ہے۔ سادگی سے رخصتی ہو جائے تو میری بھی فکر ختم ہو۔’’ تابندہ نے کہا تو صدیقہ بھابی نے انہیں ٹوک دیا۔

‘‘سادگی سے کیوں؟ میں پورے دھوم دھڑکے کے ساتھ اپنی اکلوتی اور پیاری بہو کو بیاہ کر لاؤں گی۔’’ بے ساختہ کہہ کر وہ دونوں بھائیوں سے نظر چرا گئی تھیں۔

‘‘بس بھابی، آپ کی امانت ہے جیسے چاہے لے جائیں۔’’ تابندہ بے حد خوش تھیں۔

‘‘ویسے ایک بات ہے بھابی، ایسی خوب صورت جوڑیاں کم ہی ہوتی ہیں۔ جیسی عدیم اور صبا کی ہے ماشاء اللہ۔’’ نوشابہ نے کھلے دل سے تعریف کی تھی۔

اور واقعی یہ بات جھٹلانے والی نہیں تھی اگر صبیرہ کے حسن میں سادگی اور معصومیت نے جاذبیت پیدا کر دی تھی تو عدیم نواز علی کی مردانہ وجاہت اور خوبروئی بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھی۔

‘‘دعا کریں بھابی، دونوں کی قسمت بھی اتنی ہی خوب صورت ہو۔ جو دکھ اور صعوبتیں ہم نے دیکھی ہیں۔ خدا ان کے تصور سے بھی انہیں بچائے رکھے۔’’

تابندہ کے عاجزانہ لہجے سے بائیس برسوں کے بن باس کا دکھ جھلک رہا تھا۔

‘‘دکھ کے دن ختم ہو چکے ہیں تابندہ۔ اپنے خدا پر بھروسا رکھو۔ وہ اگر کسی انسان پر آزمائش لاتا ہے تو اسے تنہا ہرگز نہیں چھوڑتا۔ بندے کے صبر اور برداشت کے ساتھ ساتھ اس کے لیے آسانی پیدا کرتا رہتا ہے اور اس کا کرم ہی تو ہے کہ آج تم دوبارہ اسی عزت و احترام کے ساتھ ہم سب کے درمیان ہو۔’’

بھایا نے انہیں سمجھایا تو وہ نم آنکھوں کو ہتھیلی سے پونچھتی ہوئی مسکرا دیں۔

‘‘بس بھایا، انسان کو ناشکرا اسی لیے تو کہتے ہیں دکھ میں بھی روتا ہے اور سکھ میں بھی، اس دکھ کو یاد کر کر کے اس درد کو برقرار رکھتا ہے۔’’

‘‘یہی تو سب سے بڑی غلطی ہے ہماری۔ میں تو کہتی ہوں کہ ماضی صرف ایک سٹور کی مانند ہونا چاہیے، جہاں پرانے ٹرنکوں میں سارے دکھ، سکھ، خوشیاں اور غم بند کر دینے چاہئیں۔ کبھی کبھا اگر کوئی یاد زور مارے تو ان کی جھاڑ پونچھ کر لینے میں کوئی حرج نہیں ورنہ انسان کو سب سے زیادہ اپنے حال میں زندہ رہنا چاہیے۔ گزرنے والا کل تو گزر گیا اور آنے والے کل کا تو کیا، آنے والے پل کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ تو پھر اہمیت کس کی ہوئی؟ آج کی، لمحہ موجود کی۔ تو اس سے پہلے کہ یہ تیزی سے بیتنے والے پل، کل کا حصہ بن جائیں، انہیں بہترین طریقے سے گزارنے کی کوشش کی جائے اور باقی سب خدا پر چھوڑ دیا جائے کہ اس کے حکم کے بغیر تو ایک تنکا بھی حرکت سے معذور ہے۔ اگر اس ساری بحث کو ایک جملے میں سمیٹا جائے تو کچھ اس طرح کہ اسی لیے ہمارا مذہب ہمیں زندگی کے ہر معاملے میں قناعت کا درس دیتا ہے، یعنی ماضی اور مستقبل کی فکروں سے زیادہ لمحہ موجود پر غور کیا جائے۔ اسے بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔ جو گزر گیا نہ تو اس پر آپ کا اختیار تھا اور نہ آنے والے کل پر مگر اس آج کو تو ہم سنوارنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔’’

نوشابہ جیسی کم گو عورت نے بے حد سنجیدگی سے عملی زندگی کا ایک نقشہ سا کھینچ دیا تو اعزاز علی انہیں توصیفی نظروں سے دیکھنے لگے جب کہ باقی سب نفوس خاموشی سے انہیں سن رہے تھے۔

‘‘بہت بہترین بات کہی ہے نوشابہ نے۔ انسان کو ہر وقت اپنے حال پر شکر ادا کرتے رہنا چاہیے۔’’ بھایا نے بھی انہیں سراہا تھا۔

‘‘آپ اس روز عدیم سے بات کرنے والے تھے کیا نتیجہ رہا؟’’ رات سوتے وقت نوشابہ کو اچانک یاد آیا تھا۔ نہ تو ان کی ہر بات کریدنے کی عادت تھی اور نہ ہی اعزاز علی خوامخواہ اس طرح کے معاملات کو پھیلانے پر یقین رکھتے تھے یہی وجہ تھی کہ نوشابہ ابھی تک صورت حال سے بے خبر تھیں لیکن اب جب کہ انہوں نے پوچھا تھا تو اعزاز علی نے انہیں ساری بات بتا دی۔

‘‘اور اگر عدیم اس کے باوجود صبا سے شادی کو نہ مانا تو؟’’ وہ متفکر ہوئی تھیں۔

‘‘تو......’’ انہوں نے گہری سانس حلق سے خارج کرتے ہوئے بے بسی سے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ‘‘میں تو بس اپنی سی کوشش کر سکتا تھا نوشابہ۔ باقی سب تو ذات باری تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس سے آگے تو حالات کے مطابق ہی کوئی قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔’’

‘‘سب کچھ جانتے بوجھتے عدیم کن راہوں پر چل پڑا ہے؟’’ نوشابہ بھی پریشان تھیں۔

‘‘وہ بھی اپنی جگہ غلط نہیں ہے نوشابہ۔ تابندہ بھابی کا تاعمر اس رشتے پر قائم رہنا طے تو نہیں تھا۔ حالات جس رخ پر جا رہے تھے، عدیم نے بھی انہی کے مطابق قدم اٹھایا۔ بہرحال یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ کس کے نصیب میں کیا لکھ دیا گیا ہے۔ یہ تو صرف خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ بعض اوقات انسان جانے کس کس ڈگر کی سیر کر آتا ہے مگر درحقیقت وہ ایک کھونٹے سے بندھا ہوتا ہے۔ رسی کی درازی تک تو اس کو آزادی ہوتی ہے مگر اس کا اصل مقام وہ کھونٹا ہی ہوتا ہے۔’’

وہ ان کے ساتھ خود کو بھی تسلی دے رہے تھے۔

نوشابہ پتہ نہیں مطمئن ہوئی تھیں یا نہیں مگر انہوں نے اثبات میں سر ضرور ہلا دیا تھا۔

✡......✡

ان دنوں گھر میں شادی کی تاریخ رکھنے کے متعلق بحث چل رہی تھی۔ اس لیے صبیرہ یا تو اپنے کمرے میں گھسی رہتی تھی یا پھر بے جی کے پاس بیٹھی رہتی۔ وہ خود کو ابھی تک عدیم نواز علی کا سامنا کرنے پر تیار نہیں کر پائی تھی۔

اور حیرت کے ساتھ اطمینان بھی ہوا تھا کہ دوسری جانب سے بھی ایسی کوئی فرمائش نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی اتفاقیہ ملاقات کی سی صورت پیدا کی گئی تھی۔

‘‘امی! آپ نانو اور رخشی خالہ کو لینے خود جائیں گی نا؟’’

اس کے پوچھنے پر تابندہ نے اطمینان سے کہا۔

‘‘اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہے۔ میں اور وقار دونوں جائیں گے۔’’

‘‘کتنے خوش قسمت ہیں ناں ہم بھی امی۔ اتنے پیار کرنے والے رشتے ہمیں بھی خدا نے دیے ہیں۔ اس روز نانو نے مجھے کتنا پیار کیا تھا اور رخشی خالہ، وہ تو ویسے ہی اتنی سوئیٹ ہیں۔ احسن انکل کے ساتھ تو اور بھی خوب صورت لگتی ہیں۔ کتنے خوش ہوئے تھے وہ سب ہمیں اچانک دیکھ کر۔’’ وہ جیسے چشمِ تصور سے پھر اسی منظر کو دیکھ رہی تھی۔

‘‘تمہیں اچھا لگا تھا نا یہ سب؟’’ تابندہ نے پیار سے اس کے رخسار پر ہاتھ پھیرا تو وہ مسکرا دی۔

‘‘میں تو دوسروں کو دیکھ کر اتنے سارے رشتوں کے لیے ترسا کرتی تھی۔ بس آپ کی دل شکنی کے خیال سے کبھی کہا نہیں تھا۔’’ تابندہ پھر سے تاسف کا شکار ہونے لگیں۔

‘‘مجھے معاف کر دینا صبی۔ میں نے تمہارے اتنے سارے رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی تمہیں ان سے اتنے برسوں تک دور کیے رکھا۔ اپنے ساتھ تمہیں بھی تنہائی اور بن باس کاٹنے کی جبری سزا دی۔’’

‘‘کیسی باتیں کر رہی ہیں امی۔’’ وہ فوراً انہیں ٹوک گئی تھی۔ پھر انہیں احساسِ ندامت سے نکالنے کی خاطر خوش دلی سے بولی۔

‘‘جتنی قدر اب مجھے ہو رہی ہے ان رشتوں کی شاید تب نہ ہوتی۔ اور پھر جو کچھ ہوتا ہے وہ کسی بہتری کے لیے ہی ہوتا ہے۔’’

ان کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دل کو بھی ان تاویلوں سے مطمئن کر رہی تھی۔

‘‘بھابی! آپ کا فون ہے۔’’

کوئی اور یہ اطلاع دیتا تو صبیرہ یہی سمجھتی کہ تابندہ کو پیغام دیا جا رہا ہے مگر یہ پیغام رسانی کرنے والی لائبہ تھی۔ صبیرہ کا تحیر میں مبتلا ہونا برحق تھا۔ اب لائبہ کی بھابی تو وہی تھی مگر یہ فون کس کا ہو سکتا ہے؟’’ وہ اسی ادھیڑبن میں چلتی فون تک آئی تھی۔

''ہیلو۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا تو ثانیہ بھر کی خاموشی کے بعد دھیمی سی آواز ایئر پیس میں ابھر کر اس کے پورے وجود میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

''کسی سے کوئی ناتا ہم کبھی جوڑا نہیں کرتے
ملالیں ہاتھ تو پھر عمر بھر چھوڑا نہیں کرتے
ہمیں معلوم ہے کہ جیت بالآخر ہماری ہے
سو ہم وقتی شکستوں پر دل توڑا نہیں کرتے''

''ایڈی!'' وہ بحر تحیر میں غرق تھی۔

''کیسی ہو تم؟'' وہ پوچھ رہا تھا اور ادھر صبیرہ بیٹھے بٹھائے پسینوں میں ڈوب گئی۔

''تم ایڈی تم، تمہیں میرا کنٹیک نمبر کہاں سے ملا؟''

اس کا ذہن سنسنا رہا تھا۔

''ڈھونڈنے والے تو خدا کو بھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ تم تو پھر اس کی ایک خوبصورت سی تخلیق ہو۔'' وہ یقیناً اس پل مسکرا رہا تھا۔ ریسیور صبیرہ کے ہاتھ سے پھسلنے لگا اس نے چور نظروں سے اپنے آس پاس دیکھا مگر کوئی بھی موجود نہیں تھا۔

''جو میں پوچھ رہی ہوں وہ بتاؤ۔'' اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ جس ماضی کا دامن جھٹک کر وہ اپنے نشان پامنا کر یہاں چلی آئی تھی۔ وہ پھر سے اس کی دہلیز پر آن کھڑا ہوا تھا۔ اس کا حال خطرے میں تھا، وہ کیوں نہ خائف ہوتی۔

''بھئی یونہی خیال آیا کہ ایک بار شائینہ بھابی سے پوچھا جائے کہ تم اصل میں گئی کہاں ہو۔ میں تو باقی سب کی طرح یہی سمجھ رہا تھا کہ تمہارے ابو تم لوگوں کو جرمنی لے گئے ہیں۔ وہ تو بھلا ہو شائینہ بھابی کا۔ انہوں نے بتایا کہ تم تو پاکستان ہی میں ہو اور جلالپور، فاصلہ ہی کتنا ہے لاہور سے۔ محض اڑھائی تین گھنٹوں کا۔'' وہ بہت اچھے موڈ میں تھا۔ مگر صبیرہ نے اپنے لب و لہجے میں کوئی لچک نہیں رکھی تھی۔

''میں نے زارا کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ کیا اس نے تم سے کچھ نہیں کہا؟''

''نہیں تو، کیا کہا تھا تم نے اسے؟'' وہ لاعلمی کا اظہار کر رہا تھا۔

صبیرہ کے شانوں پر جیسے ایک بوجھ سا آن گرا۔

اپنے تئیں وہ ساری ذمے داری زارا کو سونپنے کے بعد مطمئن وہ چکی تھی مگر یہ تو اب کھلا تھا کہ یہ طوق تو ابھی بھی اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا۔

''یہی کہ، اب ہمیں اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ دینا چاہیے۔'' بہت ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ کہہ ہی گئی تھی۔

''آں ہاں، اچھے دوستوں کی طرح نہیں بلکہ اچھی بیویوں کی طرح روزانہ صبح آفس بھیجتے وقت۔''

جواباً اس کا شرارت آمیز انداز صبیرہ کو سُن کر گیا تھا۔ وہ بے اختیار اسے ٹوک گئی تھی۔

''ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا عدیم۔''

''عدیم؟'' دوسری جانب زیر لب دہرایا گیا تھا۔ پھر جیسے وہ اسے یاددہانی کراتے ہوئے بولا۔

''تمہیں تو ایڈی کے سوا کچھ سوجھتا نہیں تھا صبیرہ۔ پھر آج یہ بے اعتنائی کا سا انداز کیوں؟''

''کیونکہ میں نے حقیقت کو کھلی آنکھوں سے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ میں ایسے بندھن میں جکڑی ہوئی ہوں کہ یہ سب اور گزرا ہوا کل میرے لیے بے معنی ہے۔''

''بہت دقتوں کے بعد وہ خود کو سنبھالنے اور پھر قطع تعلق کرنے والے انداز میں بول پائی تھی۔

''مگر میرے لیے یہ سب کچھ بہت معنی رکھتا ہے۔ میرے تمام مطلب تم سے جڑے ہیں صبی، تم کیا جانو تمہارے بغیر یہاں اتنے دن ......'' وہ بہت شدت بھرے انداز میں پتہ نہیں ہجر و فراق کی کون سی داستان سنانے جا رہا تھا جب وہ تیز لہجے میں اسے ٹوک گئی۔

''اٹس اینف ایڈی۔ یہ میرے گھر پر تمہاری پہلی اور آخری کال تھی۔ آج کے بعد تم مجھ سے کسی بھی قسم کا کوئی رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کرو گے۔''

''میں کروں گا اور ضرور کروں گا۔ تم ایسے مجھے درمیان میں لا کر کیسے چھوڑ سکتی ہو؟'' اس کی آواز سے بے یقینی کے ساتھ غصہ بھی مترشح تھا۔

''تم ایسا کچھ نہیں کرو گے ایڈی، کیونکہ میرا نکاح ہو چکا ہے۔'' اپنے تئیں وہ اس کی ہر راہ بند کر رہی تھی مگر وہ بے یقینی سے بولا۔

''جھوٹ مت بولو صبیرہ علی، اتنے سے دنوں میں اتنا اہم فیصلہ کر لیا تم نے؟''

''یہ اتنے سے دنوں میں نہیں بلکہ آج سے بائیس برس پہلے ہونے والا رشتہ ہے۔ بس مجھے ہی دیر سے پتہ چلا۔''

''سوواٹ صبیرہ؟ بچپن کے نکاح کی کیا اہمیت، اب تم باشعور ہو اپنی مرضی کا فیصلہ کر سکتی ہو۔'' اس کی پرسکون آواز ریسیور میں ابھری تھی۔

''میں فیصلہ لے چکی ہوں ایڈی، اس گھر کی عزت اور مان کو ٹھوکر پر رکھنا مجھے کسی طور گوارہ نہیں ہے۔'' صبیرہ نے قطعی انداز میں کہا تو اب کی بار وہ غصے سے بولا۔

''میں نہیں جانتا صبیرہ کہ تم یہ فیصلہ کس مجبوری میں یا دباؤ میں آ کر کر رہی ہو مگر مجھے کسی بھی طرح کی کوئی مجبوری نہیں۔ میں اپنی زندگی کا فیصلہ آزادی سے کر سکتا ہوں۔ مجھے ایک بار اشارہ کرو صبیرہ میں تمہیں ہر مشکل سے نکال لوں گا۔''

اس کا اٹل اور کچھ کر دکھانے والا انداز صبیرہ کے حواس اڑانے لگا اس نے کچھ سہم کر اسے ٹوک دیا تھا۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو ایڈی، یہ فیصلہ بلاشبہ میرے بڑوں کا ہے مگر میں اسے اپنی دلی رضامندی سے نبھانا چاہتی ہوں۔ میرے ہی ایما پر اس سارے معاملے کو آگے بڑھایا جا رہا ہے اور پلیز تم آئندہ مجھے فون مت کرنا۔''

اس نے دبی آواز میں تیزی سے بات ختم کرتے ہوئے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا تھا۔ پھر دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالتی پسیجتی ہتھیلیوں کو دوپٹے سے رگڑتی وہ اٹھ کر بے جی کے کمرے میں آ گئی۔ جہاں لائبہ کے ساتھ میرب بیٹھی بے جی کو گھر میں ہونے والی تمام سرگرمیوں سے آگاہ کر رہی تھی۔

''اب بہت جلد حویلی میں ہنگامے جاگ اٹھیں گے۔ خوشیاں، روشنیاں، ہنسی، قہقہے، مزہ آ جائے گا۔''

وہ زیر بحث موضوع سن کر کترا سی گئی۔ جب کہ اسے دیکھ کر وہ دونوں مزید شوخ ہونے لگی تھیں۔ بے جی نے اشارے سے اسے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا تو وہ خود کو سمیٹتی ہونٹوں پر جبراً مسکراہٹ پھیلاتی ان کے بستر پر، ان کے پاس بیٹھ گئی۔

''اب تو عدی بھائی آ چکے ہیں۔ یوں ڈیٹ فکس ہوگی۔''

میرب نے صبیرہ کو گدگدایا تو اسے ہنسی کی بجائے رونا آنے لگا۔ مگر یہ رسوائی بھی تو گوارہ نہیں تھی۔ سو خود پر کنٹرول کیے بیٹھی رہی۔

''آپ کی کال انہوں نے ہی ریسیو کی تھی۔ اتنے لٹھ مار انداز میں کہہ رہے تھے۔ اپنی بھابی سے کہو ان کے کسی عزیز دوست کا فون آیا ہے۔'' لائبہ نے بڑے محظوظ کن انداز میں خبر سنائی تھی مگر صبیرہ کو تو یوں لگا جیسے اس کے دل کو کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔

''تو اور کیا، وہ تو برسوں پرانے رشتے کو سینت سینت کر رکھے ہوئے ہیں۔'' میرب بھی ہنسی تھی۔

مگر صبیرہ۔

اسے لگا جیسے اس کی رہی سہی توانائی بھی کھو گئی ہو۔

ایڈی کی فون کال کو ان لفظوں میں بیان کرنا یقیناً اس کی ناپسندیدگی اور غصے کا اظہار تھا۔

میرب اور لائبہ بدستور اسے عدیم کے نام اور باتوں سے چھیڑ رہی تھیں۔ بے جی بھی ان کی باتیں سن کر مسکرا رہی تھیں اور وہ غائب دماغی کی کیفیت میں بیٹھی آنے والے وقت کی نئی چال سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''کیا ضد پال لی ہے تم نے عدیم، میں نے تو کبھی بھی تمہاری ایسی تربیت نہیں کی تھی۔'' صدیقہ بھابی سخت غصے میں تھیں۔

اپنی خوشی کا احترام کرنا ضد میں کب سے شمار ہونے لگا ہے؟'' وہ بے حد سکون سے پوچھ رہا تھا۔

''جب دوسروں کی خوشیوں پر اپنی خوشی کو ترجیح دی جائے تو اسے صرف ضد ہی کہیں گے۔ تم کیا سمجھتے ہو اتنے سارے لوگوں کے دلوں کو مسمار کر کے تم کوئی تاج محل کھڑا کر لو گے؟ یہ تمہاری بھول ہے۔'' وہ تڑخ کر رہ گئی تھیں۔

نوروز کی شکایت لگانے کے لیے کمرے میں داخل ہوتی مہراب دفعتاً رک کر اندر سے آنے والی آواز سننے لگی تو اس کے پیچھے آتا نوروز بھی ٹھٹک گیا تھا۔

''بہت بڑا گناہ ہے کسی کی باتیں سننا۔''

''کسی کی تھوڑی، امی اور بھائی کی سن رہی ہوں۔'' وہ سرگوشیانہ لہجے میں بولی تو وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔

''یعنی قریبی رشتے داری میں یہ گناہ جائز ہے۔ میں بھی اپنی ساس اور سالے کا مکالمہ سن سکتا ہوں۔''

وہ تلملا کر اس کی طرف مڑی۔

''پلیز نوروز، منہ بند اور کان کھلے رکھ کے سنو۔''

وہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کھڑا ہو گیا تو وہ مسکراہٹ چھپاتی دروازے کے ساتھ کان لگا کر کھڑی ہو گئی۔

''توبہ کریں امی جان، تاج محل ہے تو محبت کی نشانی مگر فاتحہ درود پڑھنے کے لیے، میں تو محبت کی زندہ جاوید نشانی کو اپنانا چاہتا ہوں۔''

اندر عدیم اب بھی اسی اطمینان کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

‘‘اپنی محبت کی یہ نشانیاں اپنے ابا کو دکھانا۔ وہ تو کسی طور بھی تمہیں بخشنے کے موڈ میں نہیں۔ وہ تو میں نے ہی کہا کہ آپ رہنے دیں میں عدیم سے بات کر لیتی ہوں مگر تم۔’’ وہ غصے میں کہتی رک سی گئی تھیں۔ پھر دکھی لہجے میں بولیں۔ ‘‘اپنی نہیں تو مہراب ہی کی خوشیوں کا کچھ خیال کر لو۔ اسے کس بات کی سزا دے رہے ہو؟’’

‘‘مائنڈ یو امی! یہ میرا نہیں بلکہ بڑے چچا کا فیصلہ ہے۔ میں تو کب سے اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرنا چاہ رہا تھا کوئی ابھی کا فیصلہ تو نہیں ہے اور نہ ہی میں نے صبا کو دیکھ کر اسے ریجیکٹ کیا ہے۔ ہاں مگر چچا جان نے ضرور نیا فیصلہ کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ واقعی انہیں نوروز کے لیے صبا ہی پسند ہو۔’’ وہ احتجاج کر رہا تھا۔ جب کہ باہر کھڑی مہراب لڑکھڑا کر رہ گئی۔ خود نوروز کو اپنی سماعتوں پر شبہ ہونے لگا تھا۔

‘‘جب تم صبا کو ریجیکٹ کرو گے تو ہم اسے یونہی گھر سے باہر تو پھینک نہیں دیں گے۔ کسی نہ کسی کو تو قربانی دینی پڑے گی نا۔ تو پھر یونہی سہی۔ ایک قربانی صبا دے گی اور ایک مہراب۔ صبا تمہیں چھوڑ دے گی مہراب نوروز کو۔’’ صدیقہ بھابی بھی سنگ دلی کی حد کر رہی تھیں۔ عدیم نواز علی کو سبق سکھانے کے لیے مگر انہیں یہ نہیں علم تھا کہ چند فٹ کے فاصلے پر دروازے سے لگے دو نفوس کس سولی پر لٹک گئے ہیں۔

اس کی زرد پڑتی رنگت دیکھ کر بے اختیار اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے نوروز نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تسلی دی تھی۔

‘‘بہت سنگدل ہیں آپ لوگ اور بڑے چچا نے بھی مجھے بلیک میل کرنے کا اچھا طریقہ نکالا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میں مہراب اور میرب کو کبھی بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔’’

یوں لگ رہا تھا جیسے اب تک وہ پرسکون دکھائی دینے کا ڈرامہ کر رہا ہو اور اب یک لخت ہی ہار سا گیا تھا۔

‘‘بات کو سمجھنے کی کوشش کرو عدیم۔ میرے چاند۔ تم اپنی چند مہینوں کی دوستی کو نبھانا چاہتے ہو اور ہم، ہم نے جو برسوں پہلے تابندہ اور وقار علی کے ساتھ رشتہ جوڑا تھا، اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے تمہارے لیے؟ ہماری عزت، ہمارا مان رکھنا تمہارا فرض نہیں ہے کیا؟’’

صدیقہ بھابی کو اس کے دکھ کا بھی احساس تھا مگر بہر طور خاندان کی آبرو کو وہ ہمیشہ ہی اولیت دیتی آئی تھیں۔

‘‘مان ہی تو رکھ رہا ہوں امی اگر بات میری بہن کی خوشیوں کی نہ ہوتی تو میں کبھی بھی اس شادی کو نہ مانتا مگر اپنی بہن کی خوشیوں کو برباد کر کے میں اپنی زندگی کا مقصد حاصل کرنا نہیں چاہتا آپ تائی جی کو شادی کی ڈیٹ بتا دیں۔ میں تیار ہوں۔’’ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ انداز سے نہ تو غصہ ظاہر تھا اور نہ ہی خوشی کی کوئی رمق۔ مگر صدیقہ بھابی تو جیسے پھر سے جی اٹھیں۔

باہر کھڑے جوڑے کے تاثرات بھی ایسے ہی مسرت بھرے تھے۔

نوروز اسے گھسیٹتا ہوا ٹیرس پر لے آیا تھا۔

کھلی ہوا میں گہرے سانس لیتی وہ دیوار کے ساتھ لگ کر ہنسنے لگی۔ نوروز نے اسے خفیف سا گھورا اور سارا الزام اسی کے سر تھوپ دیا۔

‘‘یہ سب تمہاری کالی زبان کا کرشمہ ہے۔ منگنی ٹوٹتے ٹوٹتے بچی ہے۔’’

‘‘جب تک خدا نہ چاہے کچھ نہیں ہو سکتا اور میں تو خدا کی بہت پیاری سی بندی ہوں۔’’ وہ کھل کر مسکرا رہی تھی۔

چہرے کے کسی بھی تاثر میں کچھ دیر پہلے والی خوفزدہ سی زردی کا نشان تک نہیں تھا۔

‘‘اچھا، دیکھوں تو خدا کی پیاری سی بندی اس کے بندوں کو قریب سے کیسی لگتی ہے۔’’ وہ مسکراہٹ دباتا آگے بڑھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ نوروز نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

‘‘اگر ایسا ویسا کچھ ہوتا تو میں پوری دنیا سے لڑ جاتا۔’’

‘‘اور میں بھی۔’’ وہ شاید زندگی میں پہلی بار اتنی سنجیدگی سے بولی تھی۔

‘‘اسے پتہ ہے کیا کہتے ہیں؟’’

وہ ہی نہیں بلکہ اس کی آنکھیں بھی شرارت سے مسکرا رہی تھیں اور اس کی شوخی کو سمجھتے ہوئے بھی مہراب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

‘‘کیا؟’’

حسن کی ادا بے وجہ تو نہیں ہے
دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

وہ بڑے جذب سے بولا تو مہراب نے اسے گھور کر دیکھا۔

‘‘شرم کرو۔ غلط شعر بول کر لڑکی پٹا رہے ہو۔’’

‘‘کیا غلطی ہے اس میں؟’’ وہ بحث پر آمادہ تھا۔

‘‘ایک مصرعہ کسی شاعر کا۔ وہ بھی غلط اور دوسرا مصرعہ کسی اور شاعر کا۔’’

‘‘تو اچھا ہے نا ایک ہی وقت میں تینوں کو مطمئن اور خوش کر دیا۔’’ وہ بولا تو مہراب نے حیران ہو کر پوچھا۔

‘‘تینوں کون؟’’

‘‘دونوں شعراء اور ایک تم۔’’ وہ اطمینان سے بولا تو وہ ہنسنے لگی۔ جب کہ نوروز اندر ہی اندر خدا کا شکر ادا کر رہا تھا ورنہ وہ تو بڑوں کے آگے بس سر ہی جھکا سکتا تھا۔

جیسے عدیم نواز علی جھکا رہا تھا۔

محبتوں کے آگے۔

رشتوں کے آگے۔

عزت اور مان کے آگے۔

اور رات کو جب مہراب بڑے جوش کے ساتھ یہ ساری اسٹوری میرب اور لائبہ کو سنا رہی تھی تو واش روم میں کھڑی صبیرہ ساکت رہ گئی۔

اس کے اور لائبہ کے کمروں کے ساتھ ایک ہی اٹیچڈ باتھ تھا مگر ان میں سے کسی کو اس کے اندر ہونے کا خیال نہیں آیا تھا۔

‘‘اتنی پیاری ہیں صبا بھابی پتہ نہیں عدی بھائی کو کیا ہو گیا ہے۔’’ میرب کو بہت دکھ ہوا تھا۔

‘‘پتہ ہے میرو! وہ شروع ہی سے ایسے کرتے تھے۔ صبا بھابی کے نام پر خاموش اور سنجیدہ ہو جاتے تھے۔ کبھی بھی ہمارے کسی مذاق کا جواب نہیں دیا کرتے تھے۔’’ لائبہ کو یاد آ رہا تھا۔

‘‘بہر حال اب تو سارا معاملہ سیٹ ہو گیا ہے۔’’ مہراب نے انہیں تسلی دی تھی۔

‘‘بات اتنی سیدھی نہیں ہے اسٹوپڈ۔ اصل پرابلم تو اب کھڑی ہوں گی۔ اپنی پسندیدہ اور عزیز ترین چیز سے دستبردار ہونا اتنا آسان ہوتا تو اس وقت نوروز بھائی اور صبا بھابی کے رشتے کی بات طے ہونے کا سن کر تمہیں ٹھنڈے پسینے نہ آتے۔ عدی بھائی بھی آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔’’ میرب نے سنجیدگی سے کہا تو لائبہ نے جھرجھری سی لی۔

‘‘ویسے تو عدی بھائی اتنے سویٹ ہیں مگر شکر ہے اس روز ہمارے تنگ کرنے پر انہوں نے ایک آدھ جھانپڑ نہیں لگا دیا۔ تبھی اس روز ٹینشن میں لگ رہے تھے۔’’

‘‘دعا کرو صبا بھابی کے لیے جتنی پیاری ان کی صورت ہے قسمت بھی اتنی ہی پیاری ہو۔’’

‘‘میرب نے دل سے دعا کی تھی جس پر ان دونوں نے خضوع و خشوع کے ساتھ آمین کہا۔

ادھر وہ اپنے من من ہوتے قدموں کو بمشکل گھسیٹتی کمرے کے وسط میں پہنچ کر اپنے بستر پر گر سی گئی۔ ابھی ابھی تو ایک جدائی کا دکھ جھیلا تھا اور اب بے اعتنائی کے سمندر کا سفر شروع ہونے والا تھا۔

یا خدا کیا میرے مقدر میں بھی آبلہ پائی ہی لکھی ہے دل کا درد قطرہ قطرہ اسکی آنکھوں سے بہنے لگا تھا۔

شادی کی تاریخ مقرر ہونے کے ساتھ ہی پوری حویلی میں ہنگامے جاگ اٹھے تھے۔

‘‘صرف رخصتی نہیں ہو گی۔ ہم مایوں مہندی بھی دھوم دھام سے کریں گے۔’’ ینگ جنریشن نویوں بھی ہلے گلے کی شوقین تھی۔ مگر بڑوں نے بھی ان کی فرمائش سر آنکھوں پر رکھی۔

‘‘ہائے، مزہ تو تب تھا جب ہم بارات لے کر کہیں دور جاتے اور صبا بھابی کو ایک لمبے سفر کے بعد لے کر آتے۔’’ مہراب نے حسرت آمیز لہجے میں کہا تو نوروز نے اسے چھیڑا۔

‘‘شکر کرو بارات زیادہ قریب جاتے جاتے رہ گئی۔ میرا کمرہ تو نچلے پورشن ہی میں ہے۔’’

‘‘کوئی نہیں، خوش فہمی ہے تمہاری ڈاکٹر نوآموز ساری بات میں تمہارے سامنے کلیئر کر چکی ہوں چچا جان نے محض عدی بھائی کی ضد توڑنے کے لیے تمہاری نامزدگی دی تھی۔’’ مہراب نے جواباً اس کا مذاق اڑایا تھا۔

مہراب کو درحقیقت اعزاز علی کے فیصلے سے دھچکا لگا تھا اور دل کی اسی پھانس کو نکالنے کے لیے اس نے بلا جھجک نوروز کے سامنے ہی بڑی دھونس کے ساتھ اعزاز علی کو

کٹہرے میں کھینچ لیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے سارا احوال بیان کر دیا۔ جسے سن کر اس وقت دونوں ہی نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ مگر اب تو وہ اس سارے قصے کو انجوائے منٹ سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہے تھے۔

''پتہ ہے نوروز! اس سارے معاملے کو ایک ہی جملے میں کیسے نمٹایا جا سکتا ہے؟'' اس کی آنکھیں شرارت سے چمکیں تو وہ بھنوؤں کو استفہامیہ انداز میں جنبش دے کر اسے دیکھنے لگا۔

''اسے کہتے ہیں ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنانا۔'' وہ شرارت سے کہتی ساتھ ہی اپنی جگہ چھوڑ کے اٹھ گئی کیونکہ وہ نوروز کو دانت پیستے اپنی طرف لپکتا دیکھ چکی تھی۔

''کوئی حال نہیں ان دونوں کا۔ اگلے سال تک شادی بھی ہو جائے گی اور یہ یونہی پکڑن پکڑائی ہی کھیلتے رہا کریں گے۔'' لائبہ نے پیشانی پر ہاتھ مارا تو میرب کو اس کے الفاظ پر ہنسی آ گئی۔

وقار علی اور تابندہ لاہور جانے کی تیاریوں میں تھے۔

وہاں امی، خالہ، رخشی اور احسن کو بھی اس تقریب کی اطلاع اور بنفس نفیس دعوت دینا مقصود تھی۔

''امی میں بھی نانو کے پاس جاؤں گی۔'' صبیرہ نے کہا تو چند لمحوں تک اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھنے کے بعد تابندہ نے تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جب کہ وہ محض فرار چاہ رہی تھی۔

سب کا جوش، ہنگامہ اور ہنسی مزاق کچھ بھی تو اس کے اندر نئی امنگ پیدا نہیں کر رہا تھا۔ وہ تو جیسے ڈھے ہی گئی تھی۔ اپنے ہی اندر کہیں ڈھے گئی تھی اور اب لحظہ بہ لحظہ مٹی ہوتی جا رہی تھی۔

خود کو خوش رکھنے اور مطمئن نظر آنے کی کوشش میں ناکام ہو گئی تو سبھی کی نظروں میں آنے لگی۔

ہر ایک نے اس کی صحت کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا تو اس کا دل گھبرانے لگا۔

تبھی اس نے فرار کی یہ کوشش اپنائی تھی۔

'پتہ نہیں یہ کسی کا دل توڑنے کی سزا ہے یا کسی کا دل نہ توڑنے کی؟' سفر کے دوران بھی وہ بے حد تناؤ کا شکار رہی تھی۔

دل درد سے رنجور تو پہلے ہی بہت تھا۔ جا کر نانو کے گلے لگی تو آنسوؤں نے رکنے کا نام ہی نہیں لیا۔

وہ خود بہت آبدیدہ ہو رہی تھیں۔

اور اس پل تابندہ کو بھی بہت کچھ بیتا ہوا یاد آ گیا تھا۔

رخشی اور احسن کی شادی کے بعد امی، خالہ جان کے ساتھ ہی رہ رہی تھیں۔ جب کہ احسن کی پوسٹنگ کراچی ہو جانے کے باعث رخشی کو بھی اس کے ساتھ ہی جانا پڑا تھا۔

تابندہ نے اسی وقت اسے فون کر کے صبیرہ کی شادی کی خوش خبری دی اور فوراً آنے کا کہا تو وہ ابھی سے بے تاب ہو گئی۔

وقار علی مودب سے ساس کے پاس بیٹھے تھے۔

معافی تلافی، گلے شکوے، آنسو سب اسی روز ہو گیا تھا جب وہ تابندہ اور صبیرہ کو گھر لے جا رہے تھے۔

''روٹھ جانے والے تو رہے نہیں۔ پھر اتنی سزا کاٹ کے آ رہی ہے میری بچی، میں بھی منہ موڑ لوں تو ماں کیسے کہلاؤں گی۔'' امی نے روتے ہوئے تابندہ کو بے تحاشا چوم لیا تھا۔ جو حالات کے تھپیڑوں سے بے حال اور گرد سفر سے اٹی ہوئی تھیں۔

اور آج۔

آج ان کے استقبال میں صرف اور صرف مامتا کھڑی تھی۔

مگر یہ تابندہ کا دل ہی جانتا تھا کہ امی کا سامنا کرتے ہوئے وہ کیسی ندامت کا شکار رہتی تھیں۔

''ہو چکے'' کے غم نے تو پہلے بھی کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ سو اب بھی اندر ہی اندر ابھی تک اپنے میکے کی بربادی کا خود کو ہی قصوروار سمجھتی تھیں۔

امی نے صبیرہ کو کتنی ہی دفع محبت سے چوما تو تابندہ کے دل میں ٹھنڈک سی اترنے لگی۔

اس پیار کو ٹھوکر مارنے کے بعد خدا نے انہیں اسی پیار کے لیے ترسا کر رکھ دیا تھا۔ وہ کیوں حسرت نہ کرتیں؟''

''وقار! ایک درخواست کروں تم سے اگر تم برا نہ مانو تو؟'' امی نے دل میں جانے کیا خواہش پالی تھی۔

وقار علی کے ساتھ ساتھ تابندہ بھی چونک کر انہیں دیکھنے لگیں۔

''جی ضرور کہیے، حکم کیجیے آپ۔'' وقار علی نے فی الفور ردعمل ظاہر کیا تھا۔

''میرا دل کرتا ہے کہ صبیرہ یہاں سے، میرے پاس سے رخصت ہو۔ اس کی بارات یہاں آئے اور میں پوری آمادگی اور خوشی کے ساتھ اسے وداع کروں۔''

ان کے لہجے کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں بھی بھیگا پن اترنے لگا تابندہ کو لگا جیسے ان کے دل کو کسی نے کچل ڈالا ہو۔ وہ بے بسی سے وقار علی کو دیکھنے لگیں جو بے حد سنجیدہ بیٹھے تھے۔ خود صبیرہ کے لیے نانو کی یہ خواہش بہت انوکھی تھی۔ وہ بھی دم بخود تھی۔

''جیسی آپ کی خوشی اگر آپ اپنے ہاتھوں سے صبیرہ کو وداع کرنا چاہتی ہیں تو اس سے بڑا اطمینان اور خوشی ہمارے لیے بھی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔''

وقار علی کے جواب نے تابندہ کے اندر پھول ہی پھول کھلا دیے تھے۔

''جیتے رہو بچے! لاکھوں خوشیاں دیکھو۔''

امی نے آبدیدہ ہو کر ان کے شانے پر ہاتھ پھیرا تو وہ بہ دقت مسکرا پائے۔

یہ وہ جانتے تھے کہ اس پل انہوں نے اپنے شانوں سے نادیدہ بوجھ کے ہٹنے پر کیسا سکون محسوس کیا تھا۔

''اچھا ہے۔ اس طرح سبھی کے دلوں کا ملال چھٹ جائے گا۔'' خالہ جان نے بڑے سجاؤ سے کہا تو تابندہ کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھنے لگی۔

'کاش ابو! مجھے کسی طور آپ کے دل کے ملال کو ہٹانے کا موقع مل جاتا کاش۔'

مگر وہ بے بس تھیں۔

جانتی تھیں کہ کچھ ملال انسان کے اندر تا عمر ڈیرہ ڈالے رکھتے ہیں اور ان سے باوجود کوشش کے چھٹکارا پانا ناممکن ہوتا ہے۔ انہیں بھی اس ملال کے ساتھ ہی زندہ رہنا تھا۔

✡……✡

حویلی میں ان کے اس فیصلے کو کھلے دل سے قبول کیا گیا تھا۔

صدیقہ بھابی نے تابندہ کو فون پر بتایا کہ بے جی بھی اس فیصلے سے بہت خوش اور مطمئن ہیں۔ بے جی کی ندامت اور شرمساری کے ساتھ ساتھ ان کی حالت دیکھ کر تمام کدورتیں تو وہ پہلے ہی دل و دماغ سے نکال چکی تھیں۔ اب بے جی کے طرز عمل نے انہیں مزید پُرسکون کر دیا تھا۔

رخشی اگلے ہی دن آن پہنچی تھی۔ ساتھ میں ان کے دونوں بیٹے بھی تھے۔ جب کہ احسن شادی سے کچھ دن پہلے آنے والے تھے۔ جس کے لیے وہ اپنی آفس کی مجبوریاں بتا کر معذرت کر چکے تھے۔

شادی کی تیاریوں کے لیے فقط دس روز تھے اور سب مرد حضرات لاہور اور گجرات کے چکروں سے بے حال ہو رہے تھے۔

بہر حال لڑکی والوں کی طرف سے میرج ہال کی بکنگ اور دیگر تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ تب وقار علی بھی اطمینان سے بیٹھے تھے جب کہ شاپنگ کا سارا ذمہ ثانیہ بھابی کے سپرد تھا۔

اور صبیرہ وہ سب چیزوں سے یوں بے پروا تھی جیسے کسی اور کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہوں۔

تبھی تابندہ نے اسے ٹوک دیا۔

''ابھی تک تم نے زارا اور شفق وغیرہ کو انوائٹ نہیں کیا تم خود جاؤ گی یا میں چلی جاؤں؟''

وہ پریشان سی ہو اٹھی۔

''کیا ضرورت ہے اتنے بکھیڑے کی؟''

''ہیں؟'' تابندہ نے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا تھا۔ ''وہ اتنی بہترین دوست رہی ہیں تمہاری۔ اور بلاؤ گی کیوں نہیں۔ کم از کم جو اتنی سڑی ہوئی شکل بنا کر ادھر اُدھر پھرتی رہتی ہو یہ سب تو ختم ہو گا نا۔''

انہوں نے قطعی انداز میں کہہ کر اس سے ان دونوں کو فون کرنے کا کہا تو اس نے ڈائری ان کے آگے بڑھا دی۔

''آپ ہی انوائٹ کر لیں۔ مجھ سے تو شاید ناراض ہوں گی۔ جاتی دفع مل کر بھی نہیں گئی تھی انہیں۔''

وہ کنی کترا گئی تھی مگر پھر دل کو ایک وہم نے بھی جکڑ لیا۔

زارا اور شفق کی تو خیر تھی البتہ اسے ثوبان کی طرف سے تشویش تھی وہ ایڈی کو یہ خوش خبری پہنچا سکتا تھا۔

تابندہ نے ان لوگوں کو انوائٹ کر کے فون صبیرہ کی طرف بڑھا دیا۔ دوسری جانب شفق تھی۔

''پلیز شفق، ثوبان سے کہنا کہ اس بات کو محض اپنے تک ہی محدود رکھے۔''

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد تابندہ کے ہٹتے ہی اس نے ملتجیانہ لہجے میں شفق سے کہا تو وہ چپ سی ہو گئی پھر بولی۔

''میں سمجھ سکتی ہوں صبی میں زارا اور ثوبان دونوں ہی کو کہہ دوں گی۔''

''تھینکس شفق!''

''اٹس اوکے صبی۔'' شفق کا انداز تسلی آمیز تھا۔ پھر قدرے شرارت سے پوچھنے لگی۔

اچھا یہ تو بتا کہ ہمارے دولہا بھائی کا نام کیا ہے اور ہیں کیسے وہ حضرت؟''

لمحہ بھر میں صبیرہ کی جان ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔

''عدیم''

شفق حیران رہ گئی۔

''کتنا عجیب اتفاق ہے صبی ایڈی کا نام بھی تو۔''

''مگر وہ ایڈی نہیں ہے۔''

اگلے ہی پل خود کو سنبھال کر وہ سنجیدگی سے بولی تو شفق نے بھی موضوں بدل دیا۔

''یہ تو بتاؤ عدیم بھائی دیکھنے میں کیسے ہیں؟''

''پتہ نہیں میں نے دیکھا نہیں۔''

وہ جزبزسی ہونے لگی مگر شفق نے جی بھر کر حیرت کا اظہار کیا تھا۔ وہ عام سے لہجے میں بولی۔

''جب ایک چیز آپ کے نصیب میں لکھی جا چکی ہے تو اسے ٹھونک بجا کر دیکھنے کا مطلب شفق؟ باقی جب تم لوگ آؤ گی تب دیکھ لینا۔''

''اوکے میں زارا سے رابطہ کرتی ہوں پھر تمہیں اپنا پروگرام بتا دوں گی۔''

شفق بھی الجھ سی گئی تھی۔

سب کے بازار چلے جانے کے بعد وہ پورے گھر میں چکراتی پھر رہی تھی۔ نانو بھی ساتھ والے گھر میں خالہ جان کے ہمراہ کسی خاتون کی عیادت کو چلی گئیں تو وہ تنہا رہ گئی تھی۔

فون کی متواتر بجتی بیل نے اسے اپنے خیالوں سے چونکا دیا تھا۔

صوفے میں دھنستے ہوئے اس نے بے زار کن سی کیفیت میں گھرے ریسور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

''ہیلو۔'' اکتاہٹ اس کی آواز سے بھی ظاہر تھی جسے اس نے اخلاقاً بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''صبیرہ۔'' یہ سوال نہیں تھا۔ وہ یقین چاہ رہا تھا۔ اس کے ہونے کا اسے ایک بار پھر سے پا لینے کا۔

''وہ تھرا کر رہ گئی۔

''ایڈی؟''

اس کے ذہن میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

مگر کیسے؟

''کیسی ہو صبیرہ؟'' وہ ملائمت بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ یوں جیسے پچھلے دنوں ان دونوں کے مابین قطع تعلقی والی کوئی بات نہ ہوئی ہو۔

جیسے اسے زندگی کے اس نئے موڑ کی اہمیت اور سنگینی کا کوئی احساس نہ ہو جس پر اس وقت صبیرہ وقار علی آن کھڑی ہوئی تھی اور ذرا سی غلط جنبش یا غلط اٹھا قدم اسے سب کی نظروں اور رویوں کے پاتال میں پہنچا سکتا تھا۔

اسے صحیح معنوں میں طرارہ آیا تھا۔

تمام تر نرمی اور لچک کو ایک طرف رکھ کر وہ تقریباً اس پر غرا اٹھی تھی۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ آئندہ مجھ سے رابطہ مت کرنا ایڈی!''

چند ثانیوں کے لیے لائن بالکل بے جان سی ہو گئی۔

پھر وہ بے حد پرُسکون لہجے میں بولا۔

''اور میں نے بھی تم سے کہا تھا کہ ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔''

''کیوں؟ کیوں نہیں ہو سکتا؟'' وہ پھٹ پڑی تھی۔ ''جب میں ہی تم سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی تو پھر تم کیوں بار بار میرے راستے میں آ رہے ہو؟''

''مجھ سے تعلق توڑنا تمہارا فعل ہے، تم فیصلہ کرنے میں آزاد ہو۔ اسی طرح مجھے بھی اپنے فیصلے کرنے کا حق حاصل ہے اور تم سے زندگی بھر کا ناتا جوڑنا اور جوڑے رکھنا میرا ذاتی فعل ہے۔ تم اس سے مجھے نہیں روک سکتیں۔'' وہ اب بھی اسی اطمینان اور ٹھہراؤ سے کہہ رہا تھا۔

''خدا کے لیے ایڈی میرے لیے اور مشکلات مت کھڑی کرو۔ بہت عرصے کے بعد میں نے اور میری ماں نے پیروں تلے زمین اور سر پر آسمان کا سایہ محسوس کیا ہے اور جن راستوں پر چل کر مجھے اپنی منزل کو پانا ہے ان کی راہ میں تم کہیں بھی نہیں ہو کہیں بھی نہیں۔''

وہ کسی بھی طرح اس کے خیالات کا رخ موڑنا چاہتی تھی۔

درحقیقت ایڈی کا بار بار یوں رستے میں آنا اس کے لیے تکلیف کا باعث تھا۔

دنیا میں وہ واحد شخص جس نے مردوں کے خلاف اس کے ذہن میں بنے خود ساختہ امیج کو چکنا چور کر دیا تھا۔

جس کے اخلاق و کردار کی مضبوطی سے اسے صحیح معنوں میں احساس ہوا تھا کہ درحقیقت اس دنیا میں مرد ہی عورت کی مضبوط ڈھال ہے۔ ہر سرد و گرم سے بچانے والا اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے والا اور اپنے نام کا تحفظ دینے والا۔

اور آج...... آج جب وہ اس کی رفاقتوں کا طالب تھا تو وہ بالکل کنگال تھی۔

اس کے لیے صبیرہ کے دونوں ہاتھ بالکل خالی تھے۔ دل میں امنگیں تھیں، جذبات تھے مگر وہ ان پر پہرے بٹھانے پر مجبور تھی۔ کیونکہ وہ ان پر کچھ حق نہیں رکھتا تھا۔

وہ گناہ گار نہیں ہونا چاہتی تھی۔

خائن نہیں کہلانا چاہتی تھی۔

تبھی تو ایک کمزور سی لڑکی ہونے کے باوجود۔

نازک احساسات و جذبات رکھنے کے باوجود۔

اپنے نفس کے آگے ڈٹ گئی تھی۔

اپنے جذبات و احساسات پر بند باندھے بیٹھی تھی۔

مگر ایڈی کا یوں بار بار راہ میں آنا اور دل کھینچنے والے انداز میں پکارنا۔ یا خدا کیا میں اس امتحان میں کامیاب ہو پاؤں گی؟

''مان لیا صبیرہ علی کہ میں تمہاری راہوں میں کہیں بھی نہیں ہوں، ہو سکتا ہے کہ تم نے اپنی ہی نہیں بلکہ اپنے دل کی آنکھیں بھی بند کر لی ہوں مگر میں یوں بیچ راستے میں سے ہٹنے والا نہیں ہوں۔ میری ہر راہ کا سنگ میل تم ہو۔ میری ہم سفر ہو اور میری منزل بھی۔ مجھے تمہیں یاد کرنے کے لیے تمہیں یاد نہیں کرنا پڑتا صبیرہ! میں تو من وتو کا فرق بھلا بیٹھا ہوں۔ میرے تمہارے رشتے میں بہت باتیں ملاقتیں اور وعدے نہیں تھے صبیرہ! مگر میں نے تمہیں اپنی رگوں میں دوڑتے خون کے ساتھ اپنے دل کی دھڑکن میں پایا ہے۔ اپنے بدل جانے کی تم قسم دے سکتی ہو مگر مجھے تم کبھی نہیں جھٹلا سکتیں۔''

اس سمے اگر وہ صبیرہ علی کی سپید پڑتی رنگت اور بے رنگ ہونٹوں کو دیکھتا تو اس کے بے جان ہونے کو تسلیم کر لیتا۔

دل سے ایک طوفان اٹھ کر اس کی ہستی کو فنا کر دینے پر آمادہ تھا۔ آنکھیں تمام آنسو بہا دینے پر سربستہ تھیں۔

مگر بہت سے پیاروں کی محبتیں ایڈی کے چہرے کو اوجھل کر رہی تھیں۔ اس کے کانوں میں تابندہ کا بھیگا لہجہ گونجنے لگا۔

''دل کی خواہشیں اکثر نفس کی طمع ہوتی ہیں صبیرہ اس کی ہر خواہش کے پیچھے لبیک کہہ کر بھاگنا حقیقت میں خود کو دلدل میں اتارنا ہے۔ ایک ایسی دلدل جو آپ کو اپنے لالچ میں پھنسائے اندر ہی اندر کھینچتی چلی جاتی ہے اور پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ آپ وہاں بالکل تنہا ہوتے ہیں۔ اسی طمع میں اسی طمع کی پاداش میں صبی میں نے اپنی زندگی کے بائیس برس سزا میں گزارے ہیں۔ دل کو مارنا آ جائے تو عزتِ نفس ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ رشتوں کی ڈوریاں اور مضبوط ہوتی ہیں۔ میں نے اپنی زندگی کی ٹھوکروں سے یہی سبق سیکھا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے صبی، فقط اپنی خوشی کو پانے کی خاطر کیا جانے والا ہر فیصلہ لحظہ بہ لحظہ آپ کو محبتوں سے دور اور تنہا کرتا چلا جاتا ہے اور احتساب کے کٹہرے میں آپ بالکل تنہا ہوتے ہیں۔ کوئی آپ کا وکیل نہیں ہوتا آپ کو ہر سزا سر جھکا کر منظور کرنا پڑتی ہے۔''

اس کے تو سامنے مثال موجود تھی۔

اس کی ماں، تابندہ ضیاء۔ جو اپنی خواہشوں اور خوابوں کی تکمیل کی خاطر محبتوں کو تج کر کر تابندہ وقار علی تو بن گئی مگر اس نے تاوان بھی بہت زبردست چکایا۔ مانا کہ اس نے اپنی زندگی کا پہلا خواب ایڈی کے حوالے سے دیکھا تھا۔ مگر زندگی محض خوابوں کے سہاروں گزرنے والی شے نہیں حقیقت کہیں زیادہ تلخ ہے۔

''تمہیں شاید زارا نے بتایا نہیں ایڈی۔ میری شادی کی ڈیٹ فکس ہو چکی ہے۔''

اس نے خدا سے حوصلہ مانگا تھا۔ دل کی مضبوطی، ارادے کی پختگی مانگی تھی۔

اور سچے دل سے مانگنے والے دل میں نیکی کا ارادہ رکھ کر مانگنے والے بھی بھلا کبھی نامراد رہے ہیں؟

اس کے لب و لہجے میں بلا کا ٹھہراؤ تھا۔

''ایسا مت کرو صبیرہ میرے ساتھ اپنے ساتھ۔''

وہ کرب سے بولا۔ مگر صبیرہ کے پاس کوئی چوائس نہیں تھی۔

''یہ میں نے نہیں خدا نے کیا ہے اور خدا جو کرتا ہے ہماری بہتری کے لیے ہی کرتا ہے۔ اس حقیقت کو مان لینے سے صبر بھی جلدی آ جاتا ہے۔'' وہ خدا کے آسرے خود کو حوصلوں کی بلندی پر پا رہی تھی۔ ایک عجیب سا سکون دل میں جاگزیں ہوتا چلا جا رہا تھا۔

''مجھے بہلاوے مت دو صبیرہ، مجھے صرف تمہارا ساتھ چاہیے۔'' وہ تیز لہجے میں بولا تو صبیرہ نے اسے ٹوک دیا۔

''ایسے راستوں پر مت چلنے کی کوشش کرو ایڈی کہ جن پر تمہیں دیکھ کر مجھے اپنے ذہن میں بنائے تمہارے کردار کو چکنا چور کرنا پڑے۔''

''مجھے کوئی افسانوی کردار بننے کا شوق نہیں ہے۔ محض خود تمہاری نظروں میں اچھا انسان ثابت کرنے کے لیے میں اپنی چاہت کو بھول جاؤں ایسا کبھی سوچنا بھی مت صبیرہ علی، بلکہ صباوتار علی۔''

ٹھنڈے انداز میں کہتے ہوئے آخر میں قدرے توقف کے بعد اس نے اضافہ کیا پھر صبیرہ کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ وضاحتاً بولا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے جب میری تمہارے نہاد ناکح سے بات ہوئی تھی تو اس نے یہی نام بتایا تھا تمہارا۔''

صبیرہ بھک سے اڑ گئی۔

''کس، کس سے بات کی ہے تم نے؟''

وہ متوحش انداز میں پوچھنے لگی۔ وہ اطمینان سے بولا۔

''تمہاری خاطر تو میں کسی سے بھی بات کر سکتا ہوں صبیرہ۔ میں نے تم سے محبت کی ہے۔''

صبیرہ کا پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی چاہنے لگا۔

یہ کیسی محبت تھی جو دل کا ناسور بنی جا رہی تھی۔

محبت میں یہ چھینا جھپٹی تو نہیں ہوتی۔ محبت تو ایک دوسرے کی رضا سے ایک دوسرے کو پانے کا نام ہے۔ ٹھنڈی میٹھی بھور سمے کی طرح دھیرے دھیرے بہتا دریا نہ کہ بپھرا ہوا سمندر۔

محبت تو صرف اور صرف چاہنے اور چاہے جانے کا نام ہے اس میں پانے کی ہوس تو نہیں ہوتی۔ محبت میں تو محبوب کی خوشی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ دھونس دھمکی سے طے ہونے والے سلسلے تو نہیں۔ یہ تو آپسی اعتماد و اعتبار کی سرزمین پر پھلتی پھولتی اور بھرپور آمادگی کے ساتھ پھل پھول دیتی ہے۔

مگر یہ، یہ شخص کن راہوں پر چل نکلا ہے۔ جن کا سفر مجھے بھی منظور نہیں۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔

''دیکھ لو قدرت بھی یہی چاہتی تھی کہ تمہارے نام کے ساتھ ہمیشہ میرا نام آئے ورنہ تمہارے ہونے والے شوہر کا نام کچھ اور بھی تو ہو سکتا تھا۔'' وہ بڑے دوستانہ انداز میں اظہار خیال کر رہا تھا۔ صبیرہ کا شدت سے جی چاہا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ ریسیور اس کے سر میں دے مارتی۔

''نام مشترک ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ دنیا میں ہزاروں لاکھوں عدیم ہوں گے مگر ان میں سے صبیرہ وتار علی کا نصیب صرف اور صرف عدیم نواز علی ہے اور یہ بات تم اچھی طرح یاد رکھنا۔''

سلگ کر کہتے ہوئے اس نے ریسیور پٹخ دیا تھا۔

شدید اضطرابی کیفیت میں گھر کر وہ انگشت شہادت کا ناخن چبانے لگی پھر یونہی اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

مگر دل کی بے تابی اور بے چینی کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ اسے ایڈی کے طرز عمل اور طرز فکر نے سخت دھچکا لگایا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ دونوں کے درمیان پسندیدگی کا رشتہ رہا تھا مگر اب جب کہ حالات ان کے حق میں نہیں تھے اور دوستانہ انداز میں ایک دوسرے کو الوداع کہہ دینے میں ہی بھلائی تھی تو پھر اس طرح بلیک میلنگ کا سا انداز اپنانے کی کیا ضرورت تھی۔

فون کی گھنٹی دوبارہ بجی تو وہ بری طرح چونکی۔

نہ چاہتے ہوئے اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف اسٹیریو پر میوزک چل رہا تھا۔

''ہیلو۔'' وہ محتاط سے انداز میں بولی۔

''ہیلو صبا بات کر رہی ہیں؟''

دوسری طرف سے پوچھا گیا تو وہ سرتاپا سلگ اٹھی۔

''تم میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے ایڈی کب تک مجھے اس تعلق کی سزا دیتے رہو گے؟''

وہ درحقیقت حلق تک بھری ہوئی تھی مگر دوسری طرف سے ابھرنے والا بے حد ٹھہرا ہوا مگر چبھتا ہوا لہجہ اس کے حواس ٹھٹھرا گیا۔

''عدیم نواز علی بول رہا ہوں اور میں نے یہی جاننے کے لیے فون کیا تھا کہ یہ مسٹر ایڈی کون ہیں؟''

وہ چکرا کر رہ گئی۔

اسے سو فیصد یہی لگا تھا کہ فون پر ایڈی ہے۔ مگر شاید بیک گراؤنڈ بجتے میوزک نے یہ غلط فہمی پیدا کر دی تھی۔ کیونکہ اس کی آواز آہستہ سنائی دے رہی تھی یا پھر ایڈی ہی حد سے زیادہ اس کے حواس پر سوار ہو چکا تھا۔

''آئم سوری، وہ میں سمجھی کہ شاید۔''

تمام الفاظ اس کے حواس کی مانند ساتھ چھوڑ گئے تو اس نے خود کو بے بس پایا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے اس شخص نے مجھ سے آپ کے متعلق انفارمیشن طلب کی تو میں نے اسے آپ کا دوست سمجھتے ہوئے آپ کا کنٹیکٹ نمبر دے دیا مگر اب مجھے لگ رہا ہے کہ وہ دوست سے بڑھ کر کچھ زیادہ اہمیت رکھتا ہے شاید۔''

وہ بہت تیکھے لب و لہجے میں کہہ رہا تھا۔

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور صفائی پیش کرنے والے انداز میں بولی۔

''دیکھیں آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم صرف یونیورسٹی فیلوز تھے اور بس۔''

''ایک یونیورسٹی فیلوز کا یوں گھر تک پیچھا کرنا کوئی عام معنی تو نہیں رکھتا اور پھر اتنے استحقاق سے صبیرہ وتار علی کا فون نمبر مانگنا اور وہ بھی اس کے شوہر سے۔''

اس کے لہجے میں غصے کے ساتھ ساتھ ناپسندیدگی بھی تھی۔

اب کی بار اس کے اندر کی غصیلی اور جذباتی صبیرہ علی پوری شدت کے ساتھ بیدار ہوئی تھی۔ کمال ہے۔ میں اپنی زندگی کو ایمانداری کی بنیاد پر رکھتے رکھتے ہار رہی ہوں اور یہاں کوئی قدر کرنے والا ہی نہیں ہے۔

''دیکھیں آپ بات کو خوامخواہ بڑھانے کی کوشش مت کریں۔'' اس نے بھی قدرے تیز لہجے میں کہا تو وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

''بہت خوب اسے کہتے ہیں الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ مگر آپ کو اس سارے معاملے کی وضاحت تو کرنی ہی پڑے گی۔''

''کیوں آپ کیا مجسٹریٹ لگے ہوئے ہیں؟'' وہ سلگ اٹھی۔

عورتوں پر خوامخواہ کا رعب ڈالنے والے مرد تو یوں بھی اسے زہر لگتے تھے اور یہاں تو پالا ہی دبنگ سے مرد سے پڑ رہا تھا۔

''مائینڈ یو محترمہ مجھے آپ کا شوہر ہونے کا شرف حاصل ہے۔'' وہ طنز سے بھرپور انداز میں اسے یاد دہانی کرا رہا تھا مگر فی الوقت وہ اس کے لب و لہجے کو خاطر میں لائے بغیر ہنوز تیز لہجے میں بولی۔

''تو پھر شوہر ہی بنے رہیے۔ ناخدا بننے کی کوشش مت کریں۔ میرے ماضی سے آپ کو کسی قسم کی کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے۔''

''آپ شاید بھول رہی ہیں کہ آپ دو ماہ کی عمر سے میرے نکاح میں ہیں اور اس طرح سے آپ کے ماضی تا حال پر میرا حق بنتا ہے۔''

دوسری طرف شاید مکمل تیاری کے بعد فون کیا گیا تھا۔

وہ لحظہ بھر کو چپ سی ہو گئی مگر ساتھ ہی ایک خیال نے جیسے اس کے اندر نئی توانائی بھر دی۔

''یوں تو پھر میرا بھی آپ کے ماضی تا حال پر اتنا ہی حق بنتا ہے۔ کیا میں یہ جاننے کی گستاخی کر سکتی ہوں کہ جس لڑکی سے آپ شادی کرنا چاہتے تھے اس کا کوئی فون وون آتا ہے یا نہیں؟''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد لائن ڈسکنکٹ کر دی گئی تو اس نے فوراً ریسیور کو کسی نجس شے کی طرح کریڈل پر پھینک دیا اور ایک بار پھر اب کیا ہوگا کے خوف کی چادر کی بکل مارنا چاہی تو اسے حیرت کا جھٹکا سا لگا۔

میں کیوں ڈروں؟

میری کیا خطا ہے؟ صرف یہ کہ میں نے کسی سے محبت کی تھی۔

عدیم نواز کا بھی تو یہ قصور ہے۔ وہ بھی تو اسی کشتی کا سوار ہے۔ پھر میں ہی کیوں ڈر ڈر کے رہوں۔ وہ کون سا اپنی رضا سے شادی کو برقرار رکھنے پر راضی ہوا ہے۔ میں تو پھر اپنی دلی آمادگی سے اس راہ پر قدم رکھ رہی ہوں۔

پھر میں کیوں خوفزدہ ہوں کیوں؟

اسے اپنی بزدلی پر ہنسی آ رہی تھی۔

واہ صبیرہ علی وقت ہے کہ موتی لٹا رہا ہے اور ہم ہیں کہ ڈر چُن چُن کے جی رہے ہیں۔

اس نے خود کو بہادری کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنے کا سبق پڑھانا شروع کر دیا۔ جب تک تابندہ اور ثمینہ بھابی وغیرہ لوٹ کر آئیں وہ پرسکون ہو چکی تھی۔ رخشی خالہ اسے ساری شاپنگ دکھانے لگیں۔

اور پھر باقی دن بے حد سکون ہی سے گزرے تھے۔ شادی سے ایک روز پہلے شفق اور زارا آ گئیں تو اس کا دل خوشی سے بھر آیا۔

''دل تو نہیں کر رہا تم سے ملنے کو مگر مجبوری ہے کہ تم دوست بہت اچھی ہو۔''

زارا نے اسے گلے لگاتے ہوئے اس کی پشت زور سے تھپتھپائی تھی۔

''اسے بھی مبارک باد دو۔ یہ بھی چند ماہ تک پیا دیس سدھارنے والی ہے۔''

وہ شفق سے مل رہی تھی جب زارا نے اسے اطلاع دی تو وہ خوشی میں گھر گئی۔

''واقعی؟''

''وہی اپنے فرحان کے ساتھ۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم تینوں کی قسمت میں خدا نے ایڈی گروپ لکھ دیا ہے۔''

زارا نے ہنستے ہوئے بے ساختہ کہا تو جہاں صبیرہ ایک دم خجالت کا شکار ہوئی وہیں شفق نے زارا کی خبر لی تھی۔

''ابھی تم ثوبان سے بھی ڈانٹ کھا کے آ رہی ہو۔ اس نے کیا کہا تھا تم سے؟''

''آئم سوری مجھے خیال نہیں رہا۔''

زارا گڑبڑا گئی تھی مگر صبیرہ عجیب سے احساس میں گھری رہی۔

سب سے مل کر وہ صبیرہ کے کمرے میں آ گئیں۔

''اب بتاؤ کیسا چل رہا سب کچھ؟''

اطمینان سے بیٹھتے ہوئے زارا نے متجسسانہ انداز میں پوچھا تو وہ اسے بتانے لگی۔

''سب تیاریاں مکمل ہیں۔ ابو بھی آ چکے ہیں۔ باقی بارات کے ساتھ آئیں گے۔''

''یہ نہیں اسٹوپڈ میں دولہا بھائی سے متعلق پوچھ رہی ہوں۔ شفق بتا رہی تھی کہ ان کا نام بھی عدیم ہے۔'' زارا نے پوچھا تو وہ گہری سانس لے کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں ایڈی کو بھول کر غلطی کر رہی ہوں یا اپنی زندگی کا سفر اعتبار کی بنیاد پر رکھنے میں میری غلطی ہے۔''

''تم بالکل صحیح ہو صبی، ایڈی ایک پڑاؤ ضرور تھا تمہارے سفر میں۔ مگر منزل نہیں۔ تمہیں اپنی زندگی کا سفر ایمانداری ہی سے شروع کرنا چاہیے۔'' شفق نے اسے جذباتی سہارا دیا تھا۔

''تو یہ بات وہ کیوں نہیں سمجھتا، کیوں خاموشی سے پیچھے نہیں ہٹ جاتا کیوں مجھے تنگ کر رہا ہے؟'' وہ حد درجہ کی آزردگی کا شکار تھی۔

''کیا ایڈی یہاں آیا تھا؟'' زارا متعجب تھی۔

''فون کرتا ہے۔''

اس نے بتایا تو شفق نے معنی خیز نظروں سے زارا کو دیکھا۔

''میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ صبیرہ کو تنگ مت کرنا۔ ورنہ ہم اسی کا ساتھ دیں گی۔''

''اس وقت تو اس نے وعدہ کیا تھا۔ ثوبان نے بھی گارنٹی دی تھی۔ میں خود اس سے بات کروں گی اگر وہ یونہی صبی کی سانس خشک کرتا رہا تو پھر میں بھی سب کے بیچ اس کا بھانڈا پھوڑ دوں گی۔'' زارا کو بھی جوش آیا تھا مگر اس کے جوش بھرے الفاظ صبیرہ کی قطعی کوئی سمجھ میں نہیں آئے تھے۔

شفق نے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا تھا پھر موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

''تم یہ بتاؤ کہ کس کلر کا ویڈنگ ڈریس پہن رہی ہو؟''

''وہی ٹیپیکل ریڈ کلر۔'' صبیرہ نے بھی نارمل موڈ میں آتے ہوئے کہا پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''مگر سب سے اہم بات، اس پر سونے کی تاروں کا نفیس کام ہے۔ امی کی دفعہ بھی ایسا لہنگا تھا۔ حویلی کی روایت ہے۔''

''پھر تو تمہیں اس لہنگے کو بھی بینک کے لاکر میں رکھوانا پڑے گا۔ دکھاؤ تو۔'' زارا نے پرشوق انداز میں کہا تو وہ مسکراتی ہوئی اٹھ گئی۔

''کتنی خوش قسمت ہے صبیرہ، خدا بھی ایسے ایسے طریقوں سے بندے کو نوازتا ہے جن کا کبھی وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔''

شفق نے متاثر ہونے والے انداز میں کہا تو زارا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''مگر ایڈی کی کلاس ضرور لوں گی۔ اس فضول شخص نے وعدہ کیا تھا کہ وہ صبی کو تنگ نہیں کرے گا۔ کم از کم وہ اسے شادی تو انجوائے کرنے دے۔''

''اچھا اب تم بھی بار بار صبی کے سامنے ایڈی کا نام مت لو۔ یہ بھی اسے تنگ کرنے والی بات ہو گی۔''

شفق نے اسے سمجھایا تو وہ صبیرہ کو آتے دیکھ کر فقط سر ہلا کر رہ گئی۔

وقت کب رکا ہے؟ اس کی رفتار کب تھمی ہے؟ اس کا چلنا تو دھڑکنوں سے مشروط ہے۔ ہر کسی کا وقت اس کی دھڑکن کے ساتھ چلتا ہے۔ دھڑکن رکی تو اس کا وقت ختم ہوا سمجھو۔

''زارا! ثوبان نہیں آیا؟'' وہ مہندی والی رات بھی پوچھ رہی تھی۔

''اس کے کسی بہت عزیز دوست کی شادی ہے، کہہ رہا تھا کل ضرور آئے گا بارات میں شرکت کے لیے۔''

زارا نے مصروف لہجے میں بتایا تھا ینگ پارٹی کو مہندی لے کر آنے کی اجازت مل گئی تو گویا مہراب کا اتنی دور مہندی اور بارات لے جانے کا شوق قدرت نے پورا کر دیا تھا۔ گوٹے سے سجے زرد لباس اور موتیے کے زیور میں سجی دمکتی صبیرہ کو چوم کر اس نے شوخی سے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

''بھائی تو ساتھ آنے کو بے تاب تھے مگر ابو نے سختی سے منع کر دیا کہ کل بھی اتنا سفر کر کے آنا اور جانا ہے۔ سلام کے ساتھ پیار بھی بھیجا ہے انہوں نے۔''

وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

یہ طفل تسلیاں اس کے دل میں کوئی خوش کن احساس بیدار نہیں کر رہی تھیں۔ عدیم نواز کا روپ کچھ دن قبل اچھی طرح دیکھ چکی تھی۔

مہراب کی شرارت محض شرارت ہی تھی۔

تابندہ ہال کی سیڑھیوں کے پاس مہندی کی رسم ہوتی دیکھ رہی تھیں جب وقار علی ان کے پاس آ کھڑے ہوئے۔

''یقین نہیں آ رہا تابی کہ آج میری گڑیا سی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے۔ میرے ذہن میں تو وہ چند ماہ کی صبا تھی اور اب ایک دم سے اتنی بڑی اور اتنی خوب صورت پتہ نہیں درمیان میں گزرے ان جدائی کے سالوں کا دکھ کبھی میرے دماغ و دل سے مٹ پائے گا یا نہیں۔'' وہ حد درجہ آزردگی سے کہہ رہے تھے۔

تابندہ نے اپنے شریک سفر کو نظر بھر کے دیکھا۔

کلف دار کاٹن کے گرے کلر شلوار سوٹ اور لیدر کی بلیک چپل میں وہ بہت سوبر لگ رہے تھے مگر کنپٹیوں کے گرے بال اور آنکھوں کے گرد ہلکی ہلکی سلوٹیں ان کی زندگی کے ان کھوئے ہوئے سالوں کی گواہی دے رہی تھیں۔

''مگر میں بہت مطمئن ہوں وقار۔ بس اب صبی کی شادی فراغت پاتے ہی آپ کے ساتھ اپنے رب کے ہاں حاضری دوں گی جس نے یقیناً مجھے معاف کر دیا ہے۔ تبھی تو اس نے میری بیٹی کو میری آزمائش نہیں بنایا۔ ساری عمر اسے میں نے ایک قرض کی صورت سنبھالے رکھا اور آج میں نے پوری ایمانداری کے ساتھ یہ قرض ادا کر دیا ہے اور اگر یہ سرخروئی مجھے ان بائیس برسوں کی آبلہ پائی کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہے تو پھر مجھے ان برسوں کے یوں کھو جانے کا کچھ غم نہیں ہے۔''

وہ جذباتی ہونے لگیں تو وقار علی نے مسکراتے ہوئے ان کے شانوں پر بازو دراز کر لیا۔

پھر انہیں خوش خبری سنائی۔

''ابھی بھایا کا فون آیا تھا۔وہ کہہ رہے تھے کہ انہوں نے چچا جان اور بی جان کو بھی راضی کرلیا ہے۔کل بارات کے ساتھ وہ لوگ بھی آئیں گے۔''

''سچ؟''وہ خوش ہوگئیں۔پھر قدرے اداسی سے بولیں۔''کتنی بابرکت ہے یہ شادی۔سارے بچھڑے ہوؤں کو ملا رہی ہے آج اگر ابا جی اور ابو بھی ہوتے تو کس قدر خوش ہوتے۔''

''انہیں تو بس ہماری نا آسودہ زندگیوں کا غم ہی لے ڈوبا۔آج اگر وہ ہوتے تو ہم سب کی خوشیاں بھی دیکھ لیتے۔''

وہ گہری سانس لیتے ہوئے رکے پھر قدرے توقف کے بعد مسکرا کر پوچھا۔

''تم بتاؤ کہ تم نے وہ پازیبیں پہنی ہیں یا نہیں؟''

وہ جھینپ کر پیچھے ہٹ گئیں۔

''اب کیا میں اس عمر میں وہ پازیبیں چھنکاتی اچھی لگوں گی۔''

''میری آنکھوں کے آئینوں میں خود کو دیکھو تابی۔تمہیں تو جیسے وقت چھوئے بغیر گزر گیا ہے۔''

انہوں نے محبت پاش لہجے میں کہا تو وہ جزبز سی ہوگئیں۔

''شرم کریں وقار کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔''

''محبت زندہ باد۔''

وہ دوبدو بولے پھر ان کے چہرے پر پھیلتی سرخی دیکھ کر بے ساختہ ہنس دیئے۔

......

نین نقش تو یوں بھی خدا نے اسے ناپ تول کے دیئے تھے مگر دلہن بن کر تو جیسے وہ پریوں کا سا روپ چرا لائی تھی۔

''یقین کرو صبی! اتنی اچھی تو میں بھی نہیں لگی تھی اپنی شادی پر۔''زارا نے پوری سچائی سے کہا تھا۔

''اتنا گہرا کلر آیا ہے آپ کی مہندی کا۔آپ کے شوہر بہت محبت کرنے والے ہوں گے۔''

یہ بیوٹیشن کا تبصرہ تھا۔

صبیرہ کو ہنسی آنے لگی۔

کبھی وہ بھی ان باتوں پر یقین رکھتی تھی مگر اب اسے پتہ چل گیا تھا کہ یہ سب باتیں ہی ہیں۔اب اس کے ہاتھوں پر مہندی کا رنگ بہت گہرا تھا۔مگر کیا عدیم نواز علی اس سے بہت محبت کرے گا؟

نہیں اس کے دماغ نے قطعیت کے ساتھ جواب دیا تھا۔

جو شخص مجھ سے میرے ماضی کی وضاحتیں مانگتا پھر رہا ہے جو میرے افیئر کے متعلق جانتا ہے وہ تو میرے ساتھ جتنا بھی برا کرے وہ کم ہی ہوگا۔

اسے کسی قسم کی کوئی خوش فہمی نہیں ہوئی تھی۔

صبح نماز کے بعد اس نے جذب دل کے ساتھ خدا سے اپنی نئی زندگی کی بہتری کے لیے دعائیں مانگی تھیں اور بھرپور دلی و ذہنی آمادگی کے ساتھ اس رشتے کو قبول کیا تھا۔

بارات بے حد شان و شوکت اور دھوم دھڑکے کے ساتھ آئی تھی۔

''صبی! دیکھو تو ذلیل لڑکی اپنے دولہے کو تو دیکھ لو۔بڑی خوش قسمت لڑکی ہوتی ہے جو اپنی بارات آتی دیکھتی ہے۔''

اس کے ٹھس سے انداز میں بیٹھے رہنے پر کھڑکی سے نیچے جھانکتی زارا نے اسے خوب صلواتیں سنائی تھیں مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھی۔

''مجھے پتہ ہے میں کتنی خوش قسمت ہوں۔''اس کے انداز میں بے حد ٹھہراؤ تھا۔

شفق نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ویسے تم ابھی بارات دیکھ لیتیں تو اچھا تھا۔بعد میں ہمیں کوسو گی کہ یہ دولہا ہے تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔''

''کیا مطلب؟''

وہ چونکی تھی۔جواباً شفق نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

''مطلب یہ کہ اتنا اچھا دولہا نہیں ہے کہ اس کی خاطر تم ایڈی کو فارغ کر دیتیں۔''

''شٹ اپ۔''وہ خفگی سے بولی تھی۔

''اس ایڈی کے بچے نے صبح سے میرے موبائل پر ٹرائی کر کر کے میری جان کھالی ہے۔صرف تم سے بات کرنے کے لیے۔''زارا نے دہائی دی تھی۔

''اب کیا کہنا ہے اس کو؟''شفق نے پوچھا تو وہ بتانے لگی۔

''کہہ رہا تھا اگر صبیرہ سے بات نہیں کرانی تو اسے میرا پیغام دیدو کہ وہ چاہے کسی کے ساتھ بھی رخصت ہو مگر نصیب اس کا ایڈی ہی کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔''

''اس فضول شخص کی باتیں کرنی ہیں تو باہر دفع ہو جاؤ تم دونوں۔''

وہ دونوں ٹپٹا کر اسے دیکھنے لگیں۔

''میں جتنا اسے بھلانے کی کوشش کر رہی ہوں اتنا ہی تم لوگ اسے میرے سامنے ڈسکس کر رہی ہو۔''

اسے ان دونوں کے طرز عمل پر تاسف ہو رہا تھا۔ان دونوں کو تو چاہیے تھا کہ وہ اس موقع پر اس کا حوصلہ بندھاتیں اپنی نئی زندگی کی شروعات ایمانداری سے کرنے پر اس کی ہمت بڑھاتیں مگر یہاں تو سب کام ہی الٹے ہو رہے تھے۔

مووی میکرز کے ساتھ ثوبان کمرے میں آیا تھا۔

''ہیلو بارزن گرل۔''وہ شرارت سے بولا تو وہ خجل سی پلکیں جھکا گئی۔اس روپ میں اس کے سامنے آنے کا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ثوبان نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس کا دل بھر آیا۔

''خدا نے تمہاری قسمت بہت بہترین لکھی ہے صبیرہ۔اس بات کا احساس آج مجھے عدیم نواز علی سے مل کر ہوا ہے۔تم بھی خدا کے اس وعدے کو مان جاؤ گی کہ وہ بہتر کے بدلے ہمیشہ بہترین ہی سے نوازتا ہے۔''

وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔صبیرہ کا دل ٹھہر سا گیا۔

اسے لے جا کر عدیم نواز علی کے پہلو میں بٹھایا گیا تو اس کی جیسے سانسیں بھی تھم تھم کر چلنے لگیں۔

وہ جو خود صبح سے خود کو حوصلے اور ہمت کا درس دیتی آ رہی تھی بے حد نروس نیس کا شکار ہونے لگی۔

دودھ پلائی کا نیگ لینے کے لیے زارا اور شفق میدان میں اتری تھیں۔تب ثوبان اور فرحان دولہا کی پارٹی میں شامل ہوگئے۔

''یہ فاؤل ہے۔ابھی تم دونوں دلہن کے بھائی بنے ہوئے تھے۔اب لوٹوں کی طرح پارٹی کیوں بدل رہے ہو؟''

زارا اور شفق نے شور مچا دیا تھا۔

''دیکھو سالے کا لقب کچھ ایسا خاص معززانہ نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ دولہا نے آج کے دن نہ بولنے کا عہد کر رکھا ہے۔اس لیے اس کی طرف سے ترس کھا کر ہم یہ

معاملہ نمٹائیں گے۔''

ثوبان نے وضاحتی بیان دیا تھا۔عدیم ان کی باتوں پر مسکرا رہا تھا۔

اور پھر بہت شور ہنگامے کے بعد بیس ہزار پر بات ختم ہوئی تھی۔

''کس قدر کنجوس پارٹی ہے۔''

زارا نے نوٹ گنتے ہوئے تبصرہ کیا تھا۔جب کہ لڑکے خوش تھے کہ ایک لاکھ کی بولی میں سے اسی ہزار بچ گے ہیں۔

بی جان دلہن کے استقبال کے لیے بے جی کے پاس گھر ہی میں رک گئی تھیں۔کچھ اتنے سالوں بعد کے ملن کا گداز بھی تھا۔بارات کے ساتھ چچا جان آئے تھے۔وہ تابندہ اور صبیرہ سے بہت محبت اور ندامت کے ساتھ ملے اور اولاد اور بیوی کی خاطر وہ اتنے برسوں تک سگے رشتوں سے کٹے رہے تھے اس سے بڑھ کر شرمساری اور کیا ہوسکتی تھی۔

مگر یہاں سبھی نے کھلے دل سے ان کا استقبال کیا تھا۔

شوخیوں،شرارتوں اور محبتوں کے بیچ وقت کیسے گزرا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

امی جان نے خود اپنے ہاتھوں صبیرہ کو وداع کر کے ڈولی میں بٹھایا تو اس وقت ان کی خوشی اور طمانیت کو تابندہ اور رخشی دونوں نے اچھی طرح محسوس کیا تھا۔احسن بھی اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ بے حد مطمئن اور پرسکون کھڑے تھے۔رخشی اس قدر بہترین بیوی ثابت ہوئی تھی کہ وہ تابندہ کی یاد کو دل کی گہرائیوں میں تالا لگا کر بند کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

'آج میں نے تجھے معاف کیا تابندہ!تمہارے ابو نے تمہیں معاف کیا۔'

امی نے تابندہ کو گلے لگاتے ہوئے کہا تو وہ رو دیں۔

یہ سراسر خوشی کے آنسو تھے۔

٭......٭

وہ بالکل خالی دل و دماغ لیے پھولوں کی پتیوں سے سجے اس وسیع و عریض بستر پر بیٹھی تھی۔نہ دھڑکنیں اتھل پتھل نہ سانسوں کا شور نہ کسی کا انتظار۔

''یاخدا۔''اس نے گہری سانس لے کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

درحقیقت وہ خود اپنے اس سرد رویے سے خوفزدہ ہو رہی تھی۔اب جب کہ تمام مراحل احسن طریقے سے طے ہو چکے تھے تو جذبوں کا یوں برفاب ہو جانا بھلا کیا معنی رکھتا تھا؟

تبھی دروازے پر ہونے والے کھٹکے نے اسے سنبھلنے پر مجبور کر دیا۔

آنے والے کے قدموں کی چاپ دبیز کارپٹ میں جذب ہو گئی۔صبیرہ نے زیرلب خدا کے ناموں کا ورد کرتے ہوئے آنکھیں موندھ لیں۔

وہ اس کے سامنے آبیٹھا۔صبیرہ بالکل ساکت تھی۔

پھر اس کا ہاتھ کسی کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں آیا تو اتنے عرصے میں پہلی بار صبیرہ کا دل کپکپا سا گیا۔

''بیوٹی فل مجھے پتہ تھا کہ دلہن بن کر تم اتنی ہی خوب صورت لگو گی۔''اسے بڑے دل سے سراہا گیا تھا۔صبیرہ کی دھڑکنیں تھمتے تھمتے بچیں۔اس نے فوراً آنکھیں کھول کر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا۔

''ایڈی......؟''

''میں نے کہا تھا نا کہ تم چاہے کسی کے ساتھ بھی رخصت کیوں نہ ہو۔نصیب میں تمہارے میں ہی ہوں۔''

اس کے رخسار کو چومتی بالوں کی لٹ کو انگلی سے چھیڑتا وہ مسکرا رہا تھا۔

تفاخر،چیلنج،سبھی کچھ تھا اس کے انداز میں۔

وہ وحشت زدہ سی اس کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہو گئی۔

''تم یہاں کیسے آئے؟''اس کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

''ابھی کوئی آجاتا تو؟''

''شادی والے گھر میں کئی بن بلائے مہمان آجاتے ہیں۔میرا آنا کوئی ایسا مشکل تو نہیں تھا۔''

وہ اس کے چہرے کو آنکھوں میں جذب کرتا اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

''گیٹ آؤٹ،ایڈی!دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ورنہ میں ابھی شور مچا کر سب کو اکٹھا کر لوں گی۔''

وہ بھنچے بھنچے لہجے میں چیخی مگر وہ متاثر ہونے کی بجائے گردن تلے ہاتھ باندھتا اس کے عین سامنے نیم دراز ہوتے ہوئے اپنے ازلی اطمینان کے ساتھ بولا۔

''ضرور،کیوں نہیں اچھا ہے اس طرح مجھے سب سے متعارف ہونے کا موقع مل جائے گا۔خصوصاً تمہارے شوہر نامدار سے جو ٹیلی فون پر بڑے پھنے خان بن رہے تھے۔''

اس کی وحشت حد سے سوا تھی۔دل چاہا اونچی آواز میں روئے۔اتنا کہ سب اکٹھے ہو جائیں۔

''میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اس قدر گرے ہوئے انسان ہو سکتے ہو ایڈی!''

اس کی بات سن کر وہ ہنس دیا جیسے اس کی بات نے بہت لطف دیا ہو۔

''کیا کریں۔لڑکی کو پھانسنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ویسے تم کہاں ہاتھ آنے والی تھیں۔''

وہ کہہ رہا تھا۔صبیرہ شدید غصے اور اہانت کا شکار ہوتی بستر سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھی مگر وہ تیزی سے اٹھ کر اس کے سامنے آگیا۔

''پیچھے ہٹو۔''وہ غرائی تھی۔شدید غصے اور اندر سے لڑتے خوف نے اس پر کپکپی طاری کر دی تھی۔

''ایسے کیسے ہٹ جاؤں تمہاری راہ سے،کوئی خراج وصول کیے بغیر اتنی آسانی سے تمہیں عدیم نواز علی کی تحویل میں دے دوں۔''

اس کے چہرے پر نگاہ جمائے وہ مسکرا رہا تھا۔

مگر مقابل کے حوصلے کا شاید غلط اندازہ لگا بیٹھا تھا۔

تبھی تو اسے لہرا کر گرتے دیکھ کر بے اختیار گڑبڑا گیا۔فوراً ہی اسے سنبھال کر بستر پر ڈالا۔

'صبیرہ......اوہ مائی گاڈ۔''

اب پریشان ہونے کی باری ایڈی کی تھی۔اس کے رخساروں کو تھپتھپاتا وہ اسے ہوش میں لانے کی ترکیب کر رہا تھا۔

''لعنت ہے مجھ پر۔منع بھی کیا تھا ثوبان نے۔''

جگ سے گلاس میں پانی انڈیلتا وہ بڑبڑایا تھا۔

منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑتے ہی اس کے بند پپوٹوں میں حرکت ہوئی تھی۔

'صبیرہ!صبی اٹھ جاؤ پلیز آئی ایم رئیلی ویری سوری یار میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔''

وہ اب اس کی منتوں پر اتر آیا تھا۔

اسے خود پر جھکے دیکھ کر صبیرہ کی آنکھیں وحشت سے پھیلیں تو وہ ڈر گیا۔ فوراً ہی حفظ ماتقدم کے طور پر التجائیہ لہجے میں بولا۔

"پلیز صبیرہ چیخنا مت دیکھو یہ دیکھو۔" اس نے کوٹ کی جیب میں سے کچھ نکال کر صبیرہ کی آنکھوں کے آگے لہرایا تھا۔

"یہ میرا آئی ڈی کارڈ ہے، پڑھو۔"

بلا ارادہ ہی اس کی نظریں اس کے آئی ڈی کارڈ پر جم گئیں۔

دھڑکنیں دفعتاً رک سی گئیں۔ تصویر کی حد تک تو یہ ایڈی کا آئی ڈی کارڈ تھا مگر یہ عدیم نواز علی؟

"یقین کرو میں پہلے بالکل بھی نہیں جانتا تھا کہ صبیرہ علی ہی اصل میں صباوقار علی ہے۔ جیسے تم ایڈی کے اصل میں عدیم نواز علی ہونے سے لاعلم تھیں۔ اس روز اگر حویلی میں تمہیں زارا سے فون پر بات کرتے نہ دیکھ لیتا تو آج تمہیں اپنی عروس کے روپ میں دیکھ کر میں بے ہوش ہو جاتا۔ اس روز چاہا کہ تمہیں بھی اس خوشی میں شامل کر لوں پھر سوچا کہ تھوڑی سی شرارت ہو جائے۔ غور سے دیکھ لو میری ہی تصویر ہے اور میں ہی عدیم نواز علی ہوں۔ پتہ نہیں تم نے کبھی ایڈی سے ہٹ کر کیوں نہیں سوچا۔ میں تو ڈبیٹس کے دوران سانس روک کر تمہارا نام سنا کرتا تھا۔"

صبیرہ نے اٹھتے ہوئے اس کا آئی ڈی کارڈ پرے پھینک دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ جو قسمت کی اس آنکھ مچولی سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرا رہا تھا حقیقتاً پریشان ہو گیا۔ اپنی طرف سے تو وہ بات ختم کر چکا تھا۔

"آئم سوری صبیرہ میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا یار!"

اس کا ہاتھ تھام کر رسان سے کہنا چاہا مگر صبیرہ نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"بات مت کرو میرے ساتھ۔ یہ سب مذاق تھا تمہارے لیے؟ ان گزرے چند دنوں میں، میں نے اپنی پوری ہستی کو داؤ پر لگتے محسوس کیا ہے۔ کبھی ایڈی اور کبھی عدیم نواز علی بن کر تم مجھے کتنی ٹینشن دیتے رہے ہو اس کا اندازہ ہے تمہیں؟ اور سب سے بڑھ کر اس بات کی ٹینشن کہ ایڈی اب میری دنیا میں نہیں رہا۔ مجھے ایک اجنبی کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہے۔ بہت برے ہو تم۔"

وہ پھر سے رو دی تھی۔

دل کو اس انہونی کے ہو جانے کا ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا اور اگر یقین آ بھی جاتا تو گزرے دنوں میں وہ ہر ساعت خود کو حالات کے شکنجے میں کسے ایک قیامت کا سامنا کرتے محسوس کرتی رہی تھی، اس کا کیا تاوان؟

وہ ساکت سا بیٹھا تھا۔

اگر عام حالات میں وہ یوں اقرار محبت کرتی تو جانے جواباً وہ کتنی دیوانگی دکھاتا۔ مگر اس پل تو وہ خود کو اس پر گزرنے والی واردات کے احساسات کی زد ہی میں پا رہا تھا۔

آئم رئیلی ویری سوری صبی۔" اس کے دونوں ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام کر پہلے ہونٹوں سے لگائے اور پھر اپنے سینے پر رکھ لیے۔

"میں تمہاری تکلیف سمجھ سکتا ہوں مگر یقین کرو میرا مقصد تمہیں تکلیف پہنچانا بالکل بھی نہیں تھا۔ بس تھوڑی سی انجوائے منٹ۔ بھلا میں اتنی خوبصورت آنکھوں میں آنسو لانے کا باعث بننے کے متعلق سوچ سکتا ہوں کیا؟ ثوبان، شفق اور زارا نے مجھے روکا بھی تھا۔" وہ لب بھینچ کر اسے دیکھنے لگا۔ جس کی آنکھوں کی سرخی اسے نادم کر رہی تھی۔ پھر جلدی سے بولا۔

"انہیں بھی شادی کے دنوں ہی میں ساری حقیقت پتہ چلی تھی۔ اب دیکھو تم مانو یا نہ مانو۔ تھوڑی سی غلطی تو تمہاری بھی ہے۔ ایک بار بھی تمہارے دل نے گواہی نہیں دی کہ عدیم نواز علی ہی تمہارا ایڈی ہے۔ اس روز تم یونیورسٹی میں سارا وقت میرے ساتھ رہیں، اپنے متعلق اتنا کچھ بتایا مگر ایک لفظ بھی مجھ سے متعلق نہیں پوچھا۔ پھر بھی اگر تمہیں یاد ہو تو میں نے تمہیں میرب اور مہراب کے متعلق بتایا تھا۔ اور کچھ نہیں تو ڈبیٹس کے دوران میرا پورا نام پکارا جاتا تھا۔ مگر تم نے تو شاید ان دنوں دشمنی کے علاوہ اور کچھ یاد ہی نہیں رکھا۔ اوپر سے یار لوگوں نے عدیم سے عدی اور پھر ایڈی کر دیا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ آگے چل کے اپنی شناخت کے لیے آئی ڈی کارڈ دکھانا پڑے گا۔"

وہ اپنی صفائی پیش کرنے کی مقدور بھر کوشش کر رہا تھا۔

صبیرہ نے گزرتے لمحوں کے ساتھ اپنی خوشی کو دل پر چھاتے اور اعصاب کو دھنکی ہوئی روئی کی طرح سبک ہوتے محسوس کیا تھا۔

سارا غصہ ساری ٹینشن ایک طرف مگر اس غیر متوقع اور سرپرائزنگ ملن کی خوشی شاید تمام زندگی کی تمام خوشیوں پر بھاری تھی۔

"تم نے کبھی بتانے کی زحمت ہی نہیں کی کہ تم لاہور میں نہیں رہتے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تم ڈبل رول پلے کر رہے ہو۔"

وہ اب بھی ناراضگی کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھی مگر عدیم خفگی کے اس پردے کے پیچھے سے جھلکتی طمانیت کو بھانپ چکا تھا۔ اس لیے قدرے اطمینان سے بولا۔

"میں شروع ہی سے لاہور کے ہوسٹلز میں رہا ہوں۔ میری اسکولنگ سے لے کر ماسٹرز تک یہیں سے ہوا ہے۔ اب تم نے اپنی عقل سے کام نہیں لیا تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ پھر کہتی ہو کہ گولڈ میڈل نہیں ملتا۔"

"دیکھو اب تم خود لڑائی شروع کر رہے ہو۔"

صبیرہ نے کہا تو سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولتے ہوئے عدیم نے اس کی تصحیح کی۔

"تم نہیں، آپ۔ شوہر کی عزت کرنی چاہیے۔"

"زہر لگتے ہیں مجھے عورتوں پر خوامخواہ کا رعب ڈالنے والے مرد۔" وہ بے ساختہ کہہ کر اسے دیکھنے لگی تو وہ اس کی شکل دیکھ کر ہنس دیا پھر اسے بتانے لگا۔

"میں نے تمہیں رونمائی میں دینے کے لیے گفٹ کے متعلق بہت سوچا۔ ڈائمنڈ کا سیٹ لے بھی لیا مگر دل چاہ رہا تھا کہ تمہارے لیے کچھ یونیک سا ہونا چاہیے۔ پھر میں نے تمہارے لیے یہ گفٹ رکھا۔" کہتے ہوئے اس کے گرے مخملیں کور والا کیس کھول کر صبیرہ کے سامنے کر دیا صبیرہ نے دیکھا اس کے تمام میڈلز اس کیس میں ترتیب کے ساتھ رکھے ہوئے تھے جو وہ ڈبیٹس میں جیتتا رہا تھا۔

"میری ہر جیت تم سے مشروط ہے صبیرہ اگر میں زندگی کی بساط پر تمہیں ہار جاتا تو شاید زندگی بھر کسی بھی بساط پر جیت نہیں پاتا۔"

وہ اپنے دل و دماغ کی سچائی کے ساتھ کہہ رہا تھا اور صبیرہ کو لگ رہا تھا جیسے زمانے کی ہر خوشی سمٹ کر اس کے دامن میں آ گئی ہو۔

واقعی خدا نے بہتر کے بدلے بہترین کا وعدہ پورا کیا تھا۔

اس نے اپنا ہاتھ عدیم کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"ویسے تو بہت بولتی ہو اب کم از کم کچھ کہہ کر اس حسین اتفاق پر اپنی خوشی ہی ظاہر کر دو۔"

وہ اس کی دھیمی سی مسکراہٹ پر جل ہی تو گیا تھا۔ صبیرہ اتنے تمام عرصے میں پہلی بار دل سے ہنسی تھی۔

"تو چلو پھر شکرانے کے نفل پڑھ لیں۔"

"ٹھیک کہا تھا صباحت علوی نے۔ عقل مند تو تم بہت ہو۔ اسی لیے تو گولڈ میڈلز کے ساتھ ساتھ پورے کا پورا گولڈ میڈلسٹ بھی لے اڑی ہو۔"

عدیم نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا تو کمرے میں صبیرہ کی نقرئی ہنسی اپنا جادو جگانے لگی۔

زندگی میں ہمیشہ سیدھا راستہ اپنانے والوں اور اپنی خوشی پر دوسروں کی خوشی کو ترجیح دینے والوں کو خدا ایسی نعمتوں سے نوازتا ہے کہ جس کی انسان توقع بھی نہیں رکھتا۔ اپنی نئی زندگی کی شروعات کرتے سمے صبیرہ مطمئن تھی کہ اس کی محبت کا تاج محل کسی کی خوشیوں اور امیدوں کے مسمار شدہ گھروندوں پر نہیں بنا ہے۔

(ختم شد)